اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

شاہد احمد دہلوی: شخصیت اور فن

تاج بیگم فرخی

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

پاکستانی ادب کے معمار

شاھد احمد دھلوی
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

شاھد احمد دھلوی
شخصیت اور فن

تاج بیگم فرخی

اکادمی ادبیات پاکستان

کتاب کے جملہ حقوق بحق اکادمی محفوظ ہیں۔

نگران اعلیٰ	:	افتخار عارف
تدوین وطباعت	:	سعیدہ درانی
سلیچ	:	احمد حبیب
اشاعت	:	2006ء
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	پوسٹ آفس فاؤنڈیشن پریس، اسلام آباد
قیمت	:	مجلد:-/180روپے پیپر بیک:-/170روپے

ISBN:978-969-472-225-2

فہرست

پیش نامہ	افتخار عارف	۷
پیش لفظ	تاج بیگم فرخی	۹
شاہد احمد دہلوی۔	خاندانی پس منظر	۱۱
	بچپن، لڑکپن، تعلیم، شادی	۲۰
	ساقی کا اِجرا	۲۹
	شاہد احمد دہلوی کی دِلّی سے رُخصت	۳۴
	شاہد احمد دہلوی لاہور میں	۴۴
	شاہد احمد دہلوی کراچی میں	۴۵
	علالت اور انتقال	۵۷
شخصیت		۶۱
کمالاتِ فن		۷۳
	'ساقی'۔ (دہلوی دور)	۷۴
	''ساقی''۔ (دورِ کراچی)	۱۰۰
تراجم اور تصانیف		۱۲۵
شاہد احمد دہلوی۔ ریڈیو پاکستان کراچی میں		۱۴۵
کمالاتِ موسیقی		۱۶۱
کتابیات۔	شاہد احمد دہلوی۔ یادیں اور تحقیق	۱۶۵

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان نے 1990 میں پاکستانی زبانوں کے ممتاز اہل قلم کے بارے میں ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبے پر کام شروع کیا تھا۔ معماران ادب کے احوال وآثار کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لئے یہ کتابی سلسلہ بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اکادمی، پاکستان کی تمام زبانوں کے نامور نثر نگاروں، شاعروں، اور نقادوں کے بارے میں کتابیں شائع کر رہی ہے۔

شاہد احمد دہلوی، ناول نگار، خاکہ نگار، مترجم اور مدیر اور تمام حیثیتوں میں ممتاز گردانے جاتے ہیں اور ایک لائق احترام ادیب کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے مختلف جہتوں میں بہت زیادہ نہیں لکھا جتنا لکھا، جم کر لکھا اور اپنی الگ شناخت قائم کی۔

شاہد احمد دہلوی کی کتابیں گنجینۂ گوہر، بزم خوش نفساں، اجڑ دیار، دلّی کی بپتا اور دھان کا گیت پڑھتے جایئے، محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو ساتھ لیے گھوم رہے ہیں۔

یہ کہنا درست ہوگا کہ انہوں نے ایک صاحب اسلوب نثر نگار کی حیثیت سے خاص طور پر بیسویں کے نصف آخر میں تخلیق ہونے والی اردو نثر کا رخ متعین کرنے میں بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔

شاہد احمد دہلوی ذاتی اعتبار سے ایک قابلِ توجہ ادیب تو تھے ہی انہوں نہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک متحرک ادیب کے طور پر بھی اپنی شخصیت کو منوایا۔ وہ مشہور معروف ادبی تنظیم رائٹرز گلڈ کے بانی ارکان میں سے ایک تھے۔

شاہد احمد دہلوی ایک خاکہ نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں لازوال مقام و مرتبے پر فائز اور دیر تک یاد رکھے جانے کے لائق ہیں۔

پیش نظر کتاب '' شاہد احمد دہلوی :شخصیت اور فن'' ملک کی معروف ادیبہ ،شاعرہ، محقق تاج بیگم فرخی صاحبہ نے بڑی توجہ اور محنت سے تحریر کی ہے۔ یہ کتاب شاہد احمد دہلوی کی شخصیت اور فن کو متعارف کرانے اور ان کے کام کو سمجھنے، سمجھانے میں یقیناً معاون ثابت ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا اشاعتی منصوبہ ''پاکستانی ادب کے معمار'' ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی پسند کیا جائے گا۔

افتخار عارف

پیش لفظ

اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر نشیں محترم افتخار عارف صاحب نے جب مجھ سے ''شاہد احمد دہلوی'' کی شخصیت اور فن کے بارے میں ایک کتاب مرتب کرنے کے لیے کہا تو مجھے بڑا تامّل ہوا۔ کہاں میں اور کہاں شاہد احمد دہلوی کی شخصیت اور ادبی کارنامے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے میں لکھنے لکھانے کا کچھ کام کرلیا کرتی تھی۔ دو چار الٹے سیدھے افسانے لکھے، بچّوں کے لئے چین کے بارے میں ایک کتاب لکھی، کچھ افسانوں کے ترجمے کیے۔ یہ چیزیں شائع بھی ہوئیں۔ پھر گھر، بچوں اور ملازمت کے بکھیڑوں میں ایسی پھنسی کہ لکھنے لکھانے سے دور ہوتی چلی گئی۔

اب جو افتخار عارف صاحب نے فرمائش کی تو میں شش و پنج میں پڑ گئی کہ کیسے اتنے بڑے کام کی حامی بھروں۔ مگر میرے رفیقِ حیات ڈاکٹر اسلم فرخی نے حوصلہ افزائی کی اور میں نے کتاب لکھنے کی ہمت کرلی۔ اسلم ایک تو محقق اور ادیب ہیں، دوسرے یہ کہ شاہد احمد دہلوی کے پرستار ہیں۔ ۵۰ء سے ۶۷ء تک دن رات ان کے ساتھ رہے۔ پانچ برس ریڈیو میں ان کے ساتھ گزارے۔ وہ نہ صرف شاہد احمد دہلوی بلکہ میرے خاندان کی زندہ تاریخ ہیں۔ شاید ہی کوئی دن جاتا ہو جو ہمارے ہاں شاہد احمد دہلوی کا ذکر نہ ہوتا ہو۔ اسلم کے ہمت دلانے سے میں نے اللہ کا نام لے کر لکھنا شروع کیا۔ ان کی معلومات سے فائدہ اٹھایا اور ان کے تعاون سے کسی نہ کسی طرح کچھ لکھ ڈالا۔ کیا لکھا، کیسا لکھا اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کریں گے۔ میں نے اپنے طور پر شاہد احمد دہلوی کو ان کی بھرپور ادبی خدمات کے پس منظر میں قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

شاہد احمد دہلوی بیسویں صدی کی بڑی اہم ادبی شخصیت تھے۔ وہ ادیب بھی تھے، ادیب گر بھی تھے۔ بزمِ رفتہ کے باکمال مصوّر بھی تھے۔ عالمی ادب سے اردو کا رشتہ استوار کرنے میں پیش پیش بھی تھے۔ میں نے ان کی ان تمام جہتوں کو مختصراً پیش کیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے بارے میں پی۔ ایچ۔ ڈی اور ایم۔ فِل کے مقالے بھی لکھے جا چکے ہیں۔ رسالوں کے نمبر بھی شائع ہوئے ہیں اور کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں، اس کے باوجود ایک مختصر سی کتاب کی ضرورت تھی جس سے نئی نسل کے قاری کو شاہد احمد دہلوی

کے کمالاتِ فکر وفن کا اندازہ ہو سکے۔ شاید میری یہ کوشش اس ضرورت کو پورا کر سکے۔

میں نے اس کتاب کے سلسلے میں ان تمام تحریروں سے استفادہ کیا ہے جو شاہد احمد دہلوی کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ میں ان کے مولفین کی شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے دلّی سے پروین الٰہی کی کتاب بھجوائی اور ڈاکٹر سیّد محمد عارف نے ''طاقِ نسیاں'' کا نسخہ عطا فرمایا۔ ان دونوں حضرات کا خصوصی شکریہ ضروری ہے۔ اقبال صاحب نے اس کتاب کے پروف پڑھے۔ میں اس سلسلے میں ان کی احسان مند ہوں۔ بیدل لائبریری کے زبیر صاحب اور غالب لائبریری کے نسیم احمد صاحب بھی خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ ان دونوں صاحبان نے ''ساقی'' کے بہت سے پرانے شمارے فراہم کیے جن کے بغیر کام ادھورا رہ جاتا۔ آصف فرخی نے بھی ہاتھ بٹایا۔ اصل شکریہ تو جناب افتخار عارف کا ہے کہ اس کتاب کے محرّک وہی ہوئے اور مجھ سے یہ کتاب لکھوائی۔ پرورشِ لوح وقلم اسی کو کہتے ہیں۔

تاج بیگم فرخی

شاھد احمد دھلوی

خاندانی پس منظر

شاہد احمد دہلوی اردو ادب کی تاریخ میں اپنے ہمہ جہت انداز کی وجہ سے نمایاں اور ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ ایک نہایت معروف علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ادیب اور ادیب گر تھے۔ ان کی تحریروں میں دل کشی اور انفرادیت کی ایک لہر نمایاں نظر آتی ہے۔ نجانے کتنے ادیبوں نے اُن سے ادبی رہ نمائی حاصل کی۔ نجانے کتنے ادیبوں کو انہوں نے دُنیائے ادب میں متعارف کیا۔ کتنے ہی پُرانے ادیبوں کو، جو اپنے عہد میں قلم سے موتی بکھیر چکے تھے اور اضمحلالِ پیری میں مبتلا تھے، ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور نئے کے ساتھ پُرانے کا پیوند لگا کر اپنے عہد اور اپنے بعد آنے والے قارئین کے لئے ایک گُم گشتہ طلسم خانے کا در وا کیا۔ انہوں نے اپنے رسالے 'ساقی' کے ذریعے سے ذوقِ ادب کو بڑھایا، لکھنے والوں کی ایک جماعت تیار کی اور ایک صحت مند روایت کی بنیاد رکھی۔ اردو کے ادبی رسائل میں 'ساقی' کا نام اور کارنامے آج بھی زندہ ہیں۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ انہوں نے متعدد نئے ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں شائع کر کے ادبی کتابوں کی اشاعت کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ ناشر اور مصنف کے درمیان خوش گوار تعلق کی بنیاد رکھی۔ یہ سارے کارنامے بڑے اہم اور قابلِ قدر ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ شاہد احمد دہلوی کو موسیقی اور مصوّری سے بھی گہری دل چسپی تھی۔ وہ کلاسیکی موسیقی کے ایک بڑے فن کار تھے۔ کلاسیکی موسیقی پر پوری طرح حاوی تھے اور موسیقی کے علم اور اس کی باریکیوں سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ ان کا ذوقِ مصوّری ان کے رسالے ساقی کے خوبصورت ٹائٹلوں سے واضح ہے۔ وہ اپنے رسالے کے ٹائٹل بنوانے میں پیشہ ور مصوّروں کو مشورے دیتے رہتے تھے۔ شاہد احمد دہلوی اپنے عہد ہی میں ایک ادبی لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ ان کی ادبی اور فنی شخصیت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

شاہد احمد دہلوی اردو ادب کے ایک نہایت مشہور و معروف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا ڈپٹی نذیر احمد، اردو کے اوّلین ناول نگار، صاحبِ طرز نثر نگار، اعلیٰ درجے کے مترجم اور مقصدی ادب کے بہترین خالق تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس، توبۃ النصوح، فسانۂ مبتلا اور اِبن الوقت ایک بڑے فن کار کے کھینچے ہوئے وہ مرقعے ہیں، جنہیں اردو ادب میں لازوال حیثیت

حاصل ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے کردار، اکبری، اصغری، ماما عظمت، حسن آرا، کلیم، مرزا ظاہر دار بیگ، ابن الوقت اور بنتا اردو ادب کے غیر فانی کردار ہیں۔ ہم ان سے بخوبی واقف ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کی نثر اتنی جان دار اور متحرک ہے کہ قاری کو فوری طور پر اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اُن کے ترجمے بالخصوص، قرآنِ مجید کا ترجمہ بڑا رواں اور سلیس ہے۔ انہوں نے قانونی اصطلاحات کے جو ترجمے کیے تھے، ان میں سے بیشتر آج بھی رائج ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کا تعلق مولویوں کے خاندان سے تھا۔ شاہد احمد دہلوی نے ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں اپنے دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔

''ضلع بجنور (یو۔پی) کے ایک گمنام سے قصبہ ریہڑ میں غریب مولویوں کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو شفیق باپ نے پرانے دستور کے مطابق اسے قرآن شریف پڑھایا اور عربی فارسی کی چند ابتدائی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھائیں۔ مولویوں کا یہ گھر اتنا غریب تھا کہ اس بچّے کا بار بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔ بچّہ بے حد ذہین اور پڑھنے کا شوقین تھا۔ باپ نے سوچا کہ دلّی چل کر بچّے کو کسی درسگاہ میں داخل کر دیا جائے۔ اس زمانے میں دلّی کی مسجدوں میں پڑھانے کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ مولوی صاحب اپنے بچّے کو لے کر دلّی پہنچے اور کسی شناسا کی مدد سے بچّے کو پنجابی کٹڑے کی مسجد میں بٹھا دیا۔ یہ واقعہ ۱۸۵۷ء سے چند سال پہلے کا ہے۔ بچّے کی عمر اس وقت ہوگی کوئی آٹھ دس سال کی۔ باپ اُسے مسجد کے ملّا کے حوالے کر کے اپنے گھر چلے گئے، مسجد ہی میں طالب علم رہتے تھے، پڑھتے کیا خاک تھے، رات کو کسی کونے کھدرے یا صحن میں پڑ رہتے۔ مسجد کا ملّا بڑا بے رحم تھا۔ کچّی سے لڑکوں کی کھال اُدھیڑنے میں اسے بڑا مزہ آتا تھا۔ یہ دیہاتی لڑکا کڑکڑاتے جاڑوں میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح ٹاٹ کی صفوں میں لپٹ کر رات کو پڑ رہتا۔ بچّہ ہی تھا۔ کبھی صبح کو آنکھ نہ کھلتی تو ملّا ایک لات رسید کرتا تو لڑکا لڑھکتا چلا جاتا اور صف بھی بچھ جاتی۔ طالب علموں کے کھانے کا یہ انتظام تھا کہ محلّے کے گھروں سے ان کی روٹی بندھی ہوئی تھی۔ طالب علم جاتے اور گھروں سے روٹیاں مانگ لاتے اور جیسی بھی روکھی سوکھی ملتیں اللہ عزیز کر لیتے۔ دیہاتی لڑکے کو جس گھر سے روٹی ملتی تھی، وہ ایک جید عالم مولوی عبدالقادر کا گھر تھا۔ مفت کی روٹیاں بھلا مروڑنے کون دیتا ہے؟ مولوی صاحب کی بیوی اس طالبِ علم سے بازار کا سودا منگواتیں۔ کوڑی پھیرا کراتیں۔ گھر کا پانی بھرواتیں اور مسالہ پسواتیں۔ ان کی ایک لڑکی پانچ چھ سال کی تھی۔ اُسے بہلانا اور کولھے پر چڑھائے چڑھائے پھرنا بھی طالب علم کے ذمّے تھا۔ لڑکی بڑی نٹ کھٹ اور چُلبلی تھی۔ اگر مسالہ ذرا موٹا رہ جاتا تو اُسی بٹّے سے لڑکے کے ہاتھ کچل دیتی۔ غریب ''سی'' کر کے رہ جاتا۔ مگر تعلیم کے شوق میں ملّا کی لاتیں بھی کھاتا اور لڑکی کی مار بھی سہتا۔ راتوں کو مسجد کے ٹمٹماتے دیے کی روشنی میں پڑھتا۔ جب یہ میسّر نہ آتی تو گلی کی لالٹین کے نیچے کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور اپنی آنکھوں کا تیل نکالتا رہتا۔ دو ایک سال یوں گزرے پھر اتفاق سے دلّی کالج کی

طرف گزر ہوا تو دیکھا کہ داخلہ ہو رہا ہے۔ ایک صاحب بہادر بیٹھے ہیں اور ان کے ساتھ کالج کے استاد بھی بیٹھے ہیں۔ لڑکوں کا باری باری سے زبانی امتحان لے رہے ہیں اور پاس فیل کر رہے ہیں۔ یہ کم عمر طالب علم بھی ہجوم میں گھس کر آگے بڑھنے لگا کہ کسی نے دھکا جو دیا تو گر پڑا اور رونے لگا۔ صاحب نے جو اُسے روتے دیکھا تو چُمکار کر اپنے پاس بلا لیا۔ پوچھا:

''تم کیا چاہتے ہو؟''

لڑکے نے کہا، ''میں بھی کالج میں داخل ہونا چاہتا ہوں''

صاحب نے سر سے پاؤں تک اُسے دیکھا اور بولے:

''تم ابھی چھوٹے ہو، یہاں کی کتابیں نہیں پڑھ سکو گے''

لڑکے نے کہا، ''میرا ابھی امتحان لے لیا جائے''

صاحب نے ایک کتاب میز پر سے اٹھا کر دے دی۔ کہا:

''اِسے کہیں سے پڑھو۔''

لڑکے نے کتاب کھول کر فر فر پڑھنا شروع کر دیا۔ سب حیران ہوئے۔ صاحب نے پاس بیٹھے ہوئے مولانا کی طرف دیکھا۔ مولانا نے ایک اور کتاب آگے بڑھا دی۔ لڑکے نے اس میں سے بھی بے جھجک پڑھنا شروع کر دیا۔ سب بہت خوش ہوئے اور لڑکا دلّی کالج میں داخل ہو گیا۔ شوق اور ذہانت کے پَر لگا کر لڑکا اُڑا اور کالج کی ساری منزلیں طے کر گیا۔ پھر مدرّس بنا۔ انسپکٹر بنا اور ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر بن گیا۔ اسی اثناء میں مولوی عبدالقادر صاحب نے دیکھ لیا کہ لڑکا ہونہار ہے۔ اپنی لڑکی سے اس کی شادی کر دی، یہ وہی لڑکی تھی جو اس لڑکے کا کولہا توڑا کرتی اور مرچوں بھرے بتّے سے اس کا ہاتھ کچل دیا کرتی تھی۔''

شادی کے بعد اس چُلبلی اور شوخ خاتون کے مزاج میں ایسی تبدیلی آئی کہ سارے خاندان میں اُن کی مثال دی جاتی تھی۔ نام تو صفیۃ النسا بیگم تھا مگر عرف عام میں بیوی صاحب کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ انہوں نے نیکی، تحمل اور سلیقہ مندی اور گھر کی دیکھ بھال میں ساری زندگی گزار دی۔

دلّی کالج سے تعلیم کی تکمیل کے بعد نذیر احمد گجرات کے ایک قصبے کُنجاہ میں مدرّس ہو گئے۔ یہاں دل نہیں لگا تو دلّی واپس آ گئے۔ واپس آئے تو جنگِ آزادی شروع ہو چکی تھی۔ یہ گھر میں بند بیٹھے رہے ذرا امن و امان ہوا۔ یو پی کے محکمۂ تعلیم میں ملازمت مل گئی۔ ترقی کرتے کرتے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے اور انگریز افسروں کی نگاہ میں آئے۔ نذیر احمد بلا کے جفاکش، غضب کے معاملہ فہم اور صاف گو تھے۔ جو فرائض ان کے سپرد ہوئے انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ اِسی ملازمت کے دوران اُن کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا۔

اُنہیں رائج الوقت درسی کتابوں کا خشک اور غیر تدریسی انداز بالکل پسند نہیں تھا۔ ان کے بچے پڑھنے کے قابل ہوئے تو انہوں نے ان کے لئے خود ہی کتابیں تیار کیں۔ بیٹی کے لئے مراۃ العُروس اور بیٹے

کے لئے چند پند۔ ان دنوں انگریزوں اور مقامیوں میں ایسی اجنبیت نہیں تھی۔ ناظمِ تعلیمات دورہ کررہے تھے۔ سامنے سے نذیر احمد کے بیٹے بشیر الدین گزرے۔ صاحب کو سلام کیا۔ انہوں نے پوچھا۔ ''کیا پڑھتے ہو'' انہوں نے جواب دیا۔ ''چند پند'' وہ حیران ہوئے کہ یہ کون سی کتاب ہے۔ کہا۔ ''اپنی کتاب بھی دکھاؤ گے'' میاں بشیر اپنی کتاب بھی لے گئے اور اپنی بہن کی کتاب بھی ساتھ لے لی۔ صاحب نے دونوں قلمی کتابیں رکھ لیں۔ پڑھیں، نذیر احمد سے کہا۔ ''ایسی اچھی کتابیں آپ نے چھپا رکھی ہیں۔'' مراۃ العروس پر حکومت سے انعام دلوادیا۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ انگریزی، ہندی، بنگالی اور گجراتی میں اس کا ترجمہ ہوا۔ لڑکیوں کو جہیز میں دی جانے لگی۔ بعض خواتین کو یہ کتاب حفظ تھی۔ ہمارے عہد کی مشہور خاتون بیگم شائستہ اکرام اللہ کو مراۃ العروس کا بڑا حصہ زبانی یاد تھا۔

اس حوصلہ افزائی سے نذیر احمد کے سلسلۂ ادبیات میں اضافہ ہوا۔ توبۃ النصوح لکھی۔ یہ اولاد کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے بڑی اعلیٰ درجے کی کتاب ہے۔ اس کے کردار مرزا ظاہردار بیگ اور کلیم اردو کے لازوال کردار ہیں۔ دونوں تہذیب کے دونمونوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مرزا وضعِ قدیم کے پابند اور چکنے گھڑے ہیں۔ کلیم ہمارے عہد کے برگشتہ خاطر نوجوان ہیں۔ جو بزرگوں کو خاطر میں لانے کے قابل نہیں سمجھتے۔

'فسانۂ مبتلا' میں نذیر احمد نے یہ موضوع چھیڑا ہے کہ مرد دوسری شادی کیوں کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بیوی پھوہڑ، بددماغ اور آرام طلب ہو تو شوہر اپنے آرام اور گھر کے انتظام کے لئے دوسری شادی رچاتا ہے لیکن حقیقی مسرت پھر بھی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ ایسے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں، جن سے زندگی دوبھر ہوجاتی ہے۔

ابن الوقت میں نذیر احمد نے مغربی تہذیب کی بے جا نقالی کا خاکہ اُڑایا ہے۔ اگرچہ آج ہم اسی تہذیب میں پوری طرح رنگے ہوئے ہیں اور اپنی اصل تہذیب سے بیگانہ ہوگئے ہیں تاہم نذیر احمد کے خیالات توجہ طلب ہیں۔

'ایامیٰ' میں عقدِ بیوگان کی تلقین ہے اور 'رویائے صادقہ' اگرچہ کمزور ناول ہے — پھر بھی اس کی ایک حیثیت ہے۔

ناولوں کے علاوہ نذیر احمد نے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا۔ اُنہیں اپنے ترجمے پر ناز تھا اور یہ ناز بجا تھا۔ اگر وہ اور کچھ نہ بھی لکھتے تو یہ ترجمہ ان کا نام زندہ رکھتا۔ ''الحقوق والفرائض۔'' اسلامی فقہ کی کتاب ہے، جو سلیس اور دلکش انداز سے مرتب کی گئی ہے۔ بعض اور چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی ہیں۔

نذیر احمد کا شہرہ ہوا تو حیدرآباد دکن کے وزیر اعظم سر سالار جنگ نے اُنہیں حیدرآباد طلب کیا ناظمِ بندوبست کی خدمت اُن کے سپرد ہوئی۔ نذیر احمد نے اپنے فرائض انتہائی محنت اور دیانت سے انجام دیے۔ حیدرآباد ہی میں اُنہیں قرآن مجید حفظ کرنے کا شوق ہوا، چنانچہ چھ ماہ کے قلیل عرصے میں

قرآن مجید حفظ کرلیا۔ حیدرآباد میں اُس زمانے میں ملک کے بہترین منتظم، عالم، دانش وراور ادیب جمع تھے۔ نذیر احمد ان میں اپنی پُراعتماد شخصیت، علمی لیاقت اور غیر معمولی کارکردگی کی وجہ سے ممتاز رہے۔ سر سالار جنگ اُن کی بڑی قدر کرتے تھے۔ نذیر احمد نے سالار جنگ کے ایما پر ان کے بیٹوں کو دفتری امور کی تعلیم بھی دی تھی۔ بعد میں بھی سالار جنگ کے ایک بیٹے، جو اِن کے جانشین ہوئے نذیر احمد سے دفتری امور کی ہدایات حاصل کرتے رہتے تھے۔

سالار جنگ کے انتقال کے بعد نذیر احمد ملازمت سے سُبک دوش ہوکر دتی آ گئے اور اب ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ وہ سرسیّد کے جلسوں میں تقریریں بھی کرنے لگے۔ قدرت نے اُنہیں غیر معمولی قوتِ بیان عطا کی تھی۔ تقریر کرتے تو مجمعے پر چھا جاتے۔ بیان ایسا موثر ہوتا کہ اپنے پرائے سب ہی متاثر ہوتے۔ علی گڑھ کے لئے چندے کی بارش ہوجاتی۔ جو مخالف تھے وہ بھی جیبیں جھاڑ دیتے تھے۔ سرسیّد اُن کی بڑی قدر اور عزت کرتے تھے اور جلسوں میں اُنہیں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ قدرت بالعموم تقریر اور تحریر کے کمال کو یکجا نہیں کرتی لیکن مستثنیات بھی ہیں۔ مثلاً نذیر احمد کی ذات۔ سرسیّد احمد کی نظر میں نذیر احمد کی کیا اہمیت تھی، اس کا اندازہ ایک خط سے ہوسکتا ہے جو انہوں نے نذیر احمد کو لکھا تھا۔ یہ خط ہمارے خاندانی ذخیرۂ نوادر کا حصّہ ہے۔ برسوں پہلے میں نے اس کے بارے میں ایک مضمون بھی لکھا تھا جو کراچی کے ایک رسالے میں شائع ہوا تھا۔ خط یہ ہے:

''جناب مولانا مخدوم ومکرم مولوی حافظ نذیر احمد صاحب''

نوازش نامہ اور مضمون پہنچا۔ ممنون ہوا۔ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ہم سب آپ کی ذاتِ مبارک کی کس قدر، قدر کرتے ہیں اور آپ کی ذات کو غنیمت ہی نہیں سمجھتے بلکہ درحقیقت باعثِ فخر وعزت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح آپ کی تحریرات کا حال ہے۔ آپ نے ڈوبالیا اور دو حرف لکھ دیے مگر ہم ان کو سویدائے دل سمجھتے ہیں۔ افسوس نہ زمانہ ہے نہ قوم۔ اگر دونوں میں سے کوئی ہوتا تو آپ ہم میں مولوی یا حافظ نہ کہلاتے بلکہ امام یا علامہ کے لقب سے مشہور ہوتے۔ بہرحال آپ کچھ ہی ہوں اور ہم آپ کو کچھ ہی سمجھتے ہوں، اس پر بلاشبہ مجھ کو فخر بلکہ ناز ہے کہ جو میں عرض کرتا ہوں، آپ قبول فرماتے ہیں۔ آپ کو ضرور پنجاب تشریف لے چلنا ہوگا۔ بغیر آپ کے تشریف لے جانے کے کچھ نہ ہوگا۔ معلوم نہیں کہاں کہاں جانا ہوگا اور کیا کرنا ہوگا۔ میں نے پنجاب میں خطوط لکھے ہیں۔ جواب آنے پر پروگرام تیار کروں گا اور ہر ایک امر کی اطلاع خدمتِ عالی میں دوں گا۔ اس قدر اور عرض کردیتا ہوں کہ شمس العلما مولوی ذکاءاللہ صاحب انشاءاللہ ضرور ساتھ ہوں گے۔

والسلام

سیّد احمد علی گڑھ۔ ۱۰/مارچ ۹۴ء''

سرسیّد کے اس خط سے ڈپٹی نذیر احمد کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی ترقی کے تمام کاموں میں دل و جان سے شریک ہوتے تھے۔ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ چاہتے تھے کہ مسلمان علم اور تجارت دونوں میں ترقی کریں۔ ان کی بیشتر تقریروں کا موضوع یہی ہے۔ نذیر احمد کے لیکچروں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہیں اپنی قوم کی ترقی کا کتنا خیال تھا۔ سرسیّد کے زمانے میں جب علی گڑھ کالج میں ایک بڑی رقم غبن ہوگئی تو نذیر احمد نے اس ادارے کی فراخ دلانہ مالی امداد بھی کی تھی۔ عام چندے اس کے علاوہ تھے۔

نذیر احمد بلا کے صاف گو تھے۔ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ برجستہ گو تھے۔ موقعے کی مناسبت سے ایسی بات کہتے تھے، جس سے سُننے والوں کی عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ ایک دفعہ وہ ہندوستان کے مشہور وائسرائے لارڈ کرزن سے گفتگو کر رہے تھے۔ لارڈ کرزن نے گفتگو کے دوران کہا۔ ''ہندوستانی جھوٹے ہوتے ہیں۔'' نذیر احمد نے برجستہ جواب دیا۔ ''اور آپ جھوٹوں کے بادشاہ ہیں۔'' کیسا برجستہ فقرہ کہا، یہ ایسا معنی خیز فقرہ تھا، جس پر کوئی قانونی گرفت نہیں ہوسکتی مگر ایسا فقرہ کہنے کے لئے ہمّت اور حوصلہ بھی چاہیئے۔ یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ حکومت نے ان کی ادبی اور علمی خدمات کے اعتراف میں اُنھیں شمس العلما کا خطاب عطا کیا تھا۔ اس خطاب کے حوالے سے انہوں نے جو قطعہ کہا وہ بڑا معنی خیز ہے۔ قطعے کا آخری مصرع ہے۔

اک ذرّہ ہیں اور نام کے شمس العلما ہیں

نذیر احمد سادگی پسند اور سادہ مزاج انسان تھے۔ باوجودیکہ وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے لیکن رہن سہن میں قدیم انداز ہی قائم رہا۔ نہ لباس بدلا نہ وضع قطع۔ جو انداز جوانی میں تھا، وہی بڑھاپے میں بھی تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب کو بڑھاپے میں کم نظر آتا تھا۔ اس کے باوجود کہیں جانا ہوتا تو پیدل ہی چلے جاتے۔ میں نے اُن سے کہا مولوی صاحب آپ گاڑی کیوں نہیں رکھ لیتے، پیدل چلنے اور تکلیف اُٹھانے سے بچ جائیں گے'' کہنے لگے۔ ''میاں فرحت ساری زندگی تو اسی دلّی کی سڑکوں پر جوتیاں چٹخائی ہیں۔ اب جو گاڑی میں بیٹھ کر نکلوں تو دیکھنے والے یہی کہیں گے، ''ذرا دیکھنا۔ مولوی صاحب بڑھاپے میں گاڑی میں بیٹھے اِتراتے چلے جاتے ہیں۔ نا بابا! میں یہ طعنہ نہیں سُن سکتا۔''

اسی کو وضع داری کہتے ہیں۔

نذیر احمد کی شخصیت کا ایک رُخ ان کی انانیت تھی۔ ملنے جُلنے اور زندگی کے عام روّیوں میں وہ ہمدرد اور کُشادہ دل تھے لیکن دھوکا دینے والوں، بے وقوف بنانے والوں اور نقصان پہنچانے والوں کو ٹھیک کرنے کے ہُنر سے بھی بخوبی واقف تھے۔ دھوکا دینے اور بُرا کہنے والوں کے خلاف ان کی کارروائی بہت سخت ہوتی تھی۔ اُن کی شخصیت کا یہ رُخ ان کی اولاد اور اولاد در اولاد کے کردار کا بھی نمایاں وصف ہے۔ سب کے ساتھ سیدھے لیکن اگر کسی نے ذرا سی بھی ٹیڑھ دکھائی تو فوراً اُس کی ٹیڑھ نکال دی۔

نذیر احمد بڑے مستعد کارگزار اور معاملہ فہم تھے۔ یوپی اور حیدرآباد میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے لیکن جس عہدے پر فائز رہے، اس کے بارے میں پوری معلومات حاصل کیں۔ ان کی اہمیت اور کام پر ان کی گرفت، وسیع معلومات اور محنت سے ہر شخص مرعوب ہو جاتا تھا۔ ہمارے خاندانی نوادرات میں نذیر احمد کی ایک قلمی کتاب ہے، جو انہوں نے حیدرآباد میں مرتب کی تھی۔ یہ کتاب محکمۂ بندوبست کے عُمّال کی ہدایت اور رہ نمائی کے لئے مرتب کی گئی تھی۔ اس کتاب میں نذیر احمد نے محکمۂ بندوبست کے جملہ امور کی بڑی وضاحت اور تفصیل سے نشان دہی کی ہے۔ اسے دیکھ کر اُن کی ژرف نگاہی اور موضوع پر ان کی وسیع معلومات کا احساس ہوتا ہے۔ یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کتنی محنت سے کام کرتے تھے اور کام کی ان کے نزدیک کیا اہمیت تھی۔

زندگی کے عام رویّوں میں ان کا دستور محبت، شفقت، اقربا پروری اور ہمدردی کا تھا لیکن بے لاگ انداز اور حد سے بڑھی ہوئی صاف گوئی کی وجہ سے لوگ ان سے ڈرتے بھی تھے۔ اُن کو غلط بات کی برداشت نہیں تھی۔ انگریز افسروں سے برابری سے ملتے تھے۔ انگریز افسر، ان کی صاف گوئی کا احترام کرتے تھے۔

نذیر احمد اپنے تمام عزیزوں سے محبت سے پیش آتے تھے۔ گھریلو معاملات میں بیوی کو پوری آزادی تھی۔ نذیر احمد ان کے کاموں میں کسی قسم کا دخل نہیں دیتے تھے۔ بیوی بھی میاں کی نگاہ پہچانتی تھیں۔ انہوں نے گھر کو بڑے سلیقے سے چلایا اور سارے خاندان میں قابلِ احترام سمجھی گئیں۔ لوگ اپنی امانتیں اُن کے پاس رکھواتے تھے۔ سارے خاندان میں یہ مشہور تھا کہ بیوی صاحب کے پاس جو روپیہ بطور امانت رکھوایا جاتا ہے، وہ محفوظ بھی رہتا ہے اور اُس میں بڑی برکت بھی ہوتی ہے۔ نذیر احمد بچّوں کی تعلیم، تربیت اور نگہداشت پر خصوصی توجہ کرتے تھے۔ اُن کی تصنیفی زندگی کا آغاز اپنے بچّوں ہی کے لئے کتابیں تصنیف کرنے سے ہوا تھا۔ اُنہیں اپنے بیٹے بشیر الدین احمد سے بے حد محبت تھی۔ بشیر الدین احمد کے نام انہوں نے جو خطوط لکھے تھے، ان خطوط کا مجموعہ 'مواعظۂ حسنہ' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان میں نصیحت ہے۔ تعلیم کی طرف توجہ دینے کا اشارہ بھی ہے۔ تعلیم کے بارے میں مناسب ہدایتیں بھی ہیں۔ زندگی کے روّیوں اور معاملات و مسائل کی توضیح بھی ہے۔ بیٹے سے دوری کی تکلیف کا اظہار بھی ہے اور بیٹے کے لئے مناسب اور کارآمد مشورے بھی ہیں۔ ان خطوں میں نذیر احمد کہیں ایک رہ نما بزرگ ہیں اور کہیں شفیق باپ اور کہیں ہمدرد اور غم گسار دوست۔ نذیر احمد کی شخصیت کو سمجھنے میں ان خطوط سے بڑی مدد ملتی ہے۔

نذیر احمد کی نواسی قیصری بیگم نے اپنی تصنیف ''کتابِ زندگی'' میں نذیر احمد کا بڑا پُر اثر مُرقّع پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

''جب بھی میں اپنی والدہ کے ساتھ کھاری باؤلی جاتی اور نانا ابّا کو سلام کرتی تو وہ اپنے قلم دان سے پندرہ روپے نکال کر مجھے دیتے، نانا ابّا کا قلم دان روپوں سے بھرا رہتا تھا۔ بعض اوقات انھوں نے

روپے دینے کے بجائے میرے لئے کوئی چھوٹا موٹا زیور بنوادیا۔''

نذیر احمد کے یہاں بچّے تو بہت ہوئے لیکن صرف ایک لڑکا اور دو لڑکیاں زندہ بچیں۔ بڑی لڑکی کا انتقال بھی ان کے سامنے ہی ہوگیا تھا۔ ان کی شادی حافظ احمد حسن سے ہوئی تھی، انہوں نے ایک لڑکا اور ایک لڑکی یادگار چھوڑے۔ چھوٹی بیٹی کی شادی فراش خانے والوں میں شرف الحق سے ہوئی تھی، جو شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دو بیٹے اشرف الحق اور مشرف الحق تھے۔ ایک بیٹی اُنہیں کی قیصری بیگم تھیں، قیصری بیگم نے ''کتابِ زندگی'' کے عنوان سے اپنے حالات قلم بند کیے ہیں۔ ۱۸۷۶ء میں جب نذیر احمد کی ایک بیٹی کا انتقال ہوا تو وہ دلّی میں نہیں تھے۔ اس سانحے پر انہوں نے بیوی صاحب کو تعزیت کا جو خط لکھا، وہ اردو مکتوب نگاری میں یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خط مدتوں اردو کی نصابی کتابوں میں شامل رہا۔ بڑا پُر اثر اور دل کو تسکین پہنچانے والا مُراسلہ ہے۔ ہر شخص کا انداز جداگانہ ہوتا ہے۔ مرزا غالب نے مرزا یوسف سے ان کے باپ کے مرنے پر تعزیت کی تو وہ بھی ندرتِ تحریر کا ایک خوبصورت اظہار تھا۔ نذیر احمد نے بیٹی کے پُرسے کے لئے بیوی کو خط لکھا تو وہ بھی ندرتِ تحریر کا بڑا منفرد انداز ہے۔ نذیر احمد کے خط میں ذاتی الم انگیزی، گہرے لگاؤ اور نرمی سے سمجھانے کی جو کیفیت ہے، وہ ان کی انشا پردازی کا بڑا خوبصورت نمونہ ہے۔

نذیر احمد کے بیٹے بشیر الدین احمد جو گھر پر میاں بشیر کہلاتے تھے۔ ۴؍اگست ۱۸۶۱ء کو دلّی میں پیدا ہوئے تھے۔ اکلوتے بیٹے تھے لیکن نذیر احمد اور بیوی صاحب دونوں نے لاڈ پیار میں بگاڑا نہیں۔ تعلیم و تربیت کا مشرقی انداز اختیار کیا۔ جب میاں بشیر نے پڑھنا سیکھا تو ان کے لئے 'چند پند' اور 'منتخب الحکایات' تصنیف کیں۔ نذیر احمد ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے یوپی کے مشرقی اضلاع میں خدمت انجام دیتے رہے۔ اعظم گڑھ میں بہت دن رہے۔ غازی پور ملا ہوا ضلع تھا، جہاں سرسیّد تعینات تھے۔ دونوں میں اتحاد و اتفاق تھا۔ سرسیّد میاں بشیر کی تعلیمی ترقی پر نگاہ رکھتے تھے۔ ایک بار جب میاں بشیر امتحان میں کامیاب ہوئے تو سرسیّد نے اُنہیں خطباتِ احمدیہ کا انگریزی ترجمہ بطور انعام دیا اور کتاب پر انگریزی میں لکھا 'بشیر الدین احمد کو امتحان میں کامیابی پر' خطباتِ احمدیہ کا یہ نسخہ ہمارے ذخیرۂ نوادرات میں موجود ہے۔

اعظم گڑھ میں ریڈ صاحب بندوبست کے ناظم تھے۔ وہ میاں بشیر کو ہفتے میں ایک بار بلاتے۔ پچھلا سبق سنتے اور نیا سبق دیتے۔ میاں بشیر کو ان کا اندازِ تدریس بہت اچھا لگتا تھا اور اُن کے ہاں جانے کے منتظر رہتے تھے۔ نذیر احمد حیدرآباد چلے گئے تو بیوی صاحب اور میاں بشیر کو دلّی چھوڑ گئے۔ یہاں انہوں نے گورنمنٹ اسکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ باپ نے دوری کے باوجود بیٹے کی تعلیم پر پوری توجہ رکھی۔ نذیر احمد کو میاں بشیر کی تعلیم سے غیر معمولی دل چسپی تھی۔ تعلیم کے ہر گوشے اور ہر پہلو پر ان کی نگاہ رہتی تھی اور بیٹے کو بڑی دانش مندی، دل سوزی اور پیار سے سمجھاتے رہتے تھے۔ زندگی گزارنے کے شائستہ طریقوں سے آگاہ کرتے اور جب میاں بشیر شادی کے قابل ہوئے تو اُن سے اس مسئلے میں بھی بزرگانہ بے تکلفی کے

ساتھ رائے دریافت کی۔

میاں بشیر تعلیم سے فارغ ہوئے تو ملازمت کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ بھی باپ کی طرح حیدرآباد جانا چاہتے تھے۔ باپ بیٹے میں اس موضوع پر خط و کتابت بھی ہوئی تھی۔ اُن کے پُرانے مہربان ریڈ صاحب اُن دنوں بریلی کے کلکٹر تھے۔ اُنہیں اطلاع ہوئی تو انہوں نے لکھا کہ میرے پاس آ جاؤ۔ میں پہلے دہلی میں تمھیں تحصیل دار مقرر کردوں گا۔ آگے تمھاری محنت اور قسمت۔

قسمت میں حیدرآباد لکھا تھا، جہاں اُنہیں ڈیڑھ سو روپے ماہوار کا وظیفہ کارآموزی مل گیا۔ ملازمت میں ترقی کی رفتار اگرچہ سُست رہی تاہم سبک دوش ہوئے تو اوّل تعلقہ دار کی حیثیت سے کام کررہے تھے۔ نیک نام اور محنتی افسر سمجھے جاتے تھے۔ ہم چشموں میں عزت تھی۔ پچپن برس کی عمر میں ازخود ملازمت سے سبک دوشی اختیار کرلی تھی۔ چاہتے تو ملازمت جاری رہتی لیکن انہوں نے دلّی میں رہنے کو زیادہ پسند کیا۔

ماں اور باپ دونوں کو میاں بشیر کی شادی کی بڑی آرزو تھی۔ دلّی کے ایک معزز خاندان میں نسبت ٹھہری۔ نواب قطب الدین کی بیٹی امتہ المغنی سے شادی ہوئی۔ دُلہن چندے آفتاب چندے ماہتاب تھیں۔ سُسرال میں بڑی دُلہن کہلائیں۔ میاں بشیر نے بھی دلہن کو بہت پسند کیا، مگر بڑی دُلہن کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ ایک دو نہیں، پورے اٹھارہ برس گزر گئے۔ خاندان میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کہنے والوں نے کیا کچھ نہیں کہا۔ ماں باپ دونوں کو انتہا کا قلق تھا۔ نذیر احمد کو بے حد ملال تھا۔ کہتے تھے اس گھر میں کوئی چراغ جلانے والا بھی نہیں رہے گا۔ ہمدردوں اور بھلا چاہنے والوں نے میاں بشیر کو دوسری شادی کا مشورہ دیا۔ ماں باپ کی بھی یہی خواہش تھی۔ دونوں کی دلی تمنا تھی کہ گھر میں بچّوں کی کلکاریوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ چاہتے میاں بشیر بھی تھے مگر اُنہیں بیوی سے کچھ اس درجہ محبت تھی کہ اس پر سوت لانے کو راضی نہیں ہوتے تھے۔ دل اور دماغ میں ایک جنگ جاری تھی جس نے اُن کی زندگی کو اجیرن بنادیا تھا۔

اس کشمکش میں وہ ایک دفعہ رخصت پر دلّی آئے تو اپنے ماموں مولوی عبدالحامد سے ملنے اُناؤ گئے جو وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے، ماموں بھی بھانجے کی ذہنی اور روحانی کشمکش سے واقف تھے۔ اُنہوں نے مشورہ دیا کہ یہاں گنج مراد آباد میں مولانا فضل الرحمٰنؒ کا قیام ہے۔ بڑے اللہ والے بزرگ ہیں، چلو اُن سے تمہارے لئے دعا کی درخواست کرتے ہیں۔ ماموں بھانجے دونوں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ماموں نے درخواست کی کہ دُعا فرمایئے، اس کے یہاں اولاد نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اسے اولاد عطا فرمائے۔ مولانا نے کہا۔ ''اولاد تو بہت ہوگی مگر اس بیوی سے نہیں اور ہاں جب لڑکا ہو تو اُسے میرے پاس ضرور لانا''

بشیر احمد کے دل کی خلش جاتی رہی۔ خاموشی سے دوسرا عقد ہوگیا۔ گنتی کے دو چار قریبی رشتے دار شریک ہوئے۔ مولوی نذیر احمد نے خود ہی مغرب سے پہلے نکاح پڑھادیا اور بڑے خلوص سے گڑگڑا کر بیٹے کے لئے دعا کی۔

میاں بشیر نکاح کے چوتھے دن حیدرآباد چلے گئے۔ چھوٹی دُلہن (اصل نام سیّد زمانی تھا) دلّی میں ساس سُسر کے پاس رہیں اور اپنے سلیقے، حُسنِ انتظام اور خدمت گزاری سے دونوں کے دل موہ لئے۔ شادی سے پہلے ان کی تعلیم قرآن مجید ناظرہ تک محدود تھی لیکن بڑی سمجھ دار بیوی تھیں۔ اندازہ کرلیا کہ اس خاندان میں گزر صرف اسی طرح ہوسکتی ہے کہ تھوڑا بہت پڑھ لکھ لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے سال بھر میں اتنی لیاقت بہم پہنچالی کہ اردو میں خط لکھنے لگیں۔ چھوٹی موٹی کتابیں پڑھنے لگیں اور خاندان کی پڑھی لکھی بیویوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔

سال بھر کے بعد میاں حیدرآباد سے دلّی آئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ باپ ماں دونوں چھوٹی دُلہن کا کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ چھوٹی دُلہن نے گھر کو ایسے سلیقے اور طریقے سے سنوارا ہے کہ جو دیکھتا ہے، بے اختیار اُن کی تعریف کرتا ہے۔ بڑی دُلہن کو یہ تعریف بے حد ناگوار گزری اور گزرنی بھی چاہئے تھی مگر وہ میاں کی چہیتی بیگم تھیں، جوان کے سورلجہ کے بھی نہیں والا مضمون تھا۔

چھوٹی دُلہن کا سلیقہ تو مشہور ہوگیا۔ سارے خاندان میں دھوم ہوگئی لیکن گودان کی بھی ہری نہیں ہوئی۔ بڑی دُلہن نے کیسے کیسے طعنے دیے۔ خاندان والوں نے نجانے کیا کیا کہا۔ دل خراش باتوں نے چھوٹی دُلہن کا کلیجہ چھلنی کردیا لیکن آخر کو تھیں سیّد زادی۔ سب کچھ صبر و شکر کے ساتھ سُنا اور برداشت کیا۔

بچپن ، لڑکپن، تعلیم اور شادی

بزرگوں کا کہنا ہے کہ بارہ برس بعد گھورے کے دن بھی پھر جاتے ہیں۔ سیّد زمانی تو سیّدانی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اُن کے دن بھی پھیر دیے۔ میاں منذر پیدا ہوئے۔ بڑی اللہ آمین ہوئی۔ بڑی دھوم دھام رہی۔ پھر سوا برس بعد میاں مُبشّر اور اس کے سوا برس بعد میاں شاہد۔ سب بچّوں کے نام نذیر احمد نے رکھے تھے۔ شاہد احمد کی پشت پر بُشریٰ، پھر مُنیر احمد، پھر سراج الدین احمد (میرے والد) اور آخر میں صفیہ۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سیّد زمانی دس دن کی صفیہ کو چھوڑ کر دنیا سے رُخصت ہوگئیں، سیّد زمانی چلی گئیں لیکن نذیر احمد کے خاندان کو اولاد کی نعمت سے مالا مال کرگئیں۔ سیّد زمانی جنّتی بیوی تھیں رمضان میں عین شبِ قدر کو ان کا انتقال ہوا۔ صابر ایسی تھیں کہ گود کے بیٹے مُنیر کا صبح سویرے انتقال ہوگیا مگر وہ صابر بی بی صبح کا ناشہ لے کر حسب دستور سُسر کو ناشتہ کروانے گئیں۔ نذیر احمد نے ناشتہ کے دوران دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ گھبرا کر پوچھا 'کیا بات ہے؟' سیّد زمانی نے کہا۔ ''مُنیر صبح سویرے گزر گیا'' نذیر احمد سناٹے میں آگئے۔ ایسی صابر عورت، ایسی خدمت گزار، واقعی جنّتی بیوی تھیں۔

چھوٹی دُلہن کے انتقال کے بعد بشیر الدین کے لئے سب سے بڑا مسئلہ اولاد کی نگہداشت اور پرورش تھا۔ چھوٹی دُلہن کی گود ہری ہوتے ہی بڑی دُلہن اپنے میکے سدھار گئی تھیں۔ میاں کا التفات بھی

برائے نام رہ گیا تھا۔ان حالات میں بڑی دُلہن چھوٹی دُلہن کے بچّوں کی دیکھ بھال کیا کرتیں۔

چار برس چار و ناچار اضلاع میں گزرے۔لڑکوں کو ریلوے انگلش اسکول میں داخل کیا گیا۔ بڑی مشکل سے داخلہ ہوا۔ بڑی لڑکی بشریٰ کے لئے انگریز گورنس رکھی گئی۔ چار برس بعد بشیر الدین احمد نے ازخود ملازمت سے سبک دوشی اختیار کی اور بچّوں کی پرورش ونگہداشت کے خیال سے دلّی آ گئے۔

دلّی میں ایک دن اتفاقیہ طور پر اُن کی ملاقات علی گڑھ کالج کے ڈاکٹر ضیاء الدین سے ہوئی۔ ڈاکٹر ضیاءالدین نے اُنہیں مشورہ دیا کہ لڑکوں کو علی گڑھ میں داخل کرادو۔ وہاں ان کی تعلیم وتربیت صحیح انداز سے ہوگی۔ بشیر الدین احمد نے یہ مشورہ قبول کرلیا اور بچّوں کو علی گڑھ چھوڑ آئے۔ شاہد احمد نے اپنی آپ بیتی میں علی گڑھ کی یادیں مختصر طور پر بڑے دل چسپ انداز میں بیان کی ہیں۔ان کے بڑے بھائی منذر احمد نے بھی اپنے ایک مضمون میں ان یادوں کو اُجاگر کیا ہے۔

منذر احمد بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ سنجیدہ متین اور بُردبار تھے لیکن شاہد احمد اور اُن سے بڑے مُبشّر احمد اکثر شرارتیں کرتے رہتے تھے۔نواب مشتاق احمد گُرمانی برابر کے کمرے میں رہتے تھے۔ اُن کے ساتھ کھیل کود ہوتا رہتا تھا۔ مولانا اسلم جیراج پوری ان لوگوں کو فارسی پڑھاتے تھے۔ لیکن شاہد احمد اور مُبشّر احمد کا دل علی گڑھ میں نہیں لگا۔ اُنہیں دلّی اور اپنے گھر کا ماحول یاد آتا تھا۔ ایک دن دونوں نے منذر احمد کو جو ''بڑے بھائی'' کہلاتے تھے، بتائے بغیر بشیر الدین احمد کو خط لکھا کہ جب ہماری ماں کا انتقال ہوا تھا تو آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ہمیں اپنے سے الگ نہیں کریں گے۔اب آپ نے ہمیں یہاں بھیج دیا ہے۔ دراصل یہ کارروائی مبشّر صاحب کی تھی، وہ ان کاموں میں بڑے تیز تھے۔ شاہد احمد صرف شریک تھے۔ بشیر الدین احمد بڑے جذباتی آدمی تھے۔ خط پڑھ کر بیتاب ہوگئے اور علی گڑھ پہنچے۔ منذر احمد اُنہیں دیکھ کر بھوں چکّے رہ گئے۔ اُنہیں اس خط کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ قصّہ مختصر یہ کہ بشیر الدین احمد بچّوں کو دلّی لے آئے اور یہاں ان کی تعلیم شروع ہوگئی۔

بشیر الدین احمد کا کھاری باؤلی والا مکان لڑکوں کی شوخیوں، شرارتوں اور دھما چوکڑی سے گونجنے لگا۔ مُبشّر احمد جو عرفِ عام میں منجھو میاں کہلاتے تھے، سب کے سرغنے تھے۔ سیّد زمانی کے بھتیجے ولی اشرف (بعد میں اشرف صبوحی) بھی ان لوگوں کے ساتھی تھے۔ایک مغلانی کے بیٹے جو رفّو کہلاتے تھے (اصل نام رفیع تھا) چوبیس گھنٹے جمے رہتے تھے۔ بشیر الدین احمد کے خالہ زاد بھائی کے بیٹے افضل حسین بھی جو بھائی فجی کہلاتے تھے، اس گروہ میں شامل تھے۔ بشیر الدین احمد حیدرآباد سے ایک لڑکے کو لائے تھے، ان کا نام اسلام الدین اور عرفیت ناگا تھی، وہ بھی اس ٹولی میں شریک تھے۔

بشیر الدین احمد لڑکوں کو خود بھی پڑھاتے تھے۔ بڑی محنت کرتے تھے، ان کا ارادہ تھا کہ منذر احمد کو وکیل بنائیں۔ شاہد احمد کے لئے ڈاکٹری تجویز کی تھی اور کسی حد تک اس منصوبے پر عمل بھی ہوا تھا لیکن

انسان سوچتا کچھ ہے، ہوتا کچھ اور ہے۔ نہ منذر احمد نے وکالت کی نہ شاہد احمد ڈاکٹر بنے اور نہ منجھو میاں انجینئر۔ لیکن ان کے بدلے ان کے دو بیٹے انجینئر بن گئے۔

شاہد احمد اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ انٹرنس کے امتحان میں تین مہینے باقی تھے کہ ان کی شادی کر دی گئی۔ بڑی دھوم دھام کی شادی تھی۔ رقص و موسیقی کا جلسہ بھی ہوا۔ دُلہن مولوی نذیر احمد کے بڑے داماد حافظ احمد حسن کی صاحبزادی تھیں۔ عالیہ بیگم نام تھا۔ شاہد احمد کے رشتے کے بھانجے انصار ناصری نے شاہد احمد کے خاکے میں اس شادی کی تفصیل بڑے دلکش انداز میں بیان کی ہے۔

شادی کا ایک فوری نتیجہ تو یہ نکلا کہ شاہد احمد انٹرنس کے امتحان میں فیل ہو گئے۔ بشیر الدین احمد نے اُنہیں مشن اسکول میں داخل کر دیا، جہاں سے انہوں نے ۱۹۲۳ء میں انٹرنس پاس کر لیا۔ چونکہ بشیر الدین احمد یہ طے کر چکے تھے کہ شاہد احمد کو ڈاکٹری پڑھنا ہے لہٰذا اُنہیں ایف ایس سی کرنے کے لئے لاہور بھیجا گیا۔ ایف سی کالج میں داخلہ ہوا۔ ان کے بہنوئی ڈاکٹر اجمل حسین اُس زمانے میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے وابستہ تھے۔ قیام اُنہیں کے یہاں رہا۔

ایف سی کالج میں شاہد احمد کے دو ہم جماعتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ پہلے ممتاز حسن تھے جو حکومت پاکستان کے معتمدِ خزانہ رہے۔ دوسرے این ایم خان تھے جو ایک زمانے میں کراچی کے کمشنر تھے۔ ان دونوں سے ان کا ملنا جلنا آخر وقت تک رہا۔

ایف سی کالج سے شاہد احمد نے ایف ایس سی کر لیا۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ بھی ہو گیا لیکن لاہور میں ان کا احساسِ تنہائی روز بروز بڑھتا گیا۔ انہوں نے خود ایک دفعہ بتایا کہ ''میں اکثر وائی ایم سی اے کے سامنے بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے کھڑا رہتا اور سوچتا رہتا تھا۔ اس طرح کھڑے رہنا اور سوچنا میری عادت بن گیا تھا۔''

احساسِ تنہائی کی بڑی وجہ گھر سے دوری تھی۔ ان کا بچپن اور لڑکپن بھرے پُرے گھر میں گزرا تھا۔ بھائیوں اور ہم جھولیوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ ہنسی مذاق، چہلیں ہوتی رہتی تھیں۔ دن رات کھیل کود رہتا تھا اور اب تنہائی تھی اور وہ تھے۔ کتابوں سے دن رات سر مارتے رہتے، مردوں کی چیر پھاڑ کرتے رہتے۔ اُنہیں اس کام سے بڑی گھن آتی تھی لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ ابّا کی خوشی منظور تھی۔

دوسری وجہ نوعمری میں ان کی شادی تھی۔ سولہ برس کے تھے کہ شادی ہو گئی، جلد ہی ایک بیٹے کے باپ بھی بن گئے۔ بیوی اور بیٹے کی یاد ستاتی رہتی تھی۔ یہ دُکھ بھی کچوکے دیتا رہتا تھا۔

تیسری وجہ ان کی بیوی عالیہ بیگم کی بیماری تھی۔ وہ پہلے بچے کی پیدائش کے بعد بہت سخت بیمار ہوئیں۔ علاج ہوتا رہا لیکن ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ دو پسلیاں بھی کاٹ دی گئیں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ زخم نے ناسور کی شکل اختیار کر لی۔ روزانہ ڈریسنگ ہوتی تھی۔ ایک دو دن

نہیں پورے چودہ برس ڈریسنگ ہوئی۔ دتی میں شاہد احمد خود ہی بیوی کی ڈریسنگ کرتے تھے۔ یہ کام انہوں نے اتنی توجہ اور خلوص سے کیا کہ سارے خاندان میں اس کا چرچا ہوگیا۔

شاہد احمد کا احساسِ تنہائی حد سے بڑھ گیا۔ پڑھنے لکھنے سے طبیعت اُچاٹ ہوگئی۔ میڈیکل کی پڑھائی بڑی توجہ اور محنت چاہتی ہے۔ شاہد احمد ذہنی اُلجھنوں میں گرفتار تھے۔ روحانی کرب روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ آخر کار انہوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم ترین فیصلہ کرلیا اور ہمت کر کے باپ کے پاس گئے۔

باپ ان دنوں فالج کے مرض میں مُبتلا تھے۔ مایوس اور مُضمحل تھے۔ شاہد احمد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''میرا دل میڈیکل کی پڑھائی میں نہیں لگتا۔ میں یہ پڑھائی چھوڑنا چاہتا ہوں۔'' بیمار باپ کے ذہن کو دھچکا تو لگا لیکن انہوں نے کہا، ''تمہاری مرضی۔ پھر اب کیا کرو گے؟'' شاہد احمد نے کہا۔ ''میں بی اے۔ ایم اے کروں گا۔'' بشیر الدین احمد نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اچھا، یونہی کرو۔'' میڈیکل کی دو سالہ پڑھائی۔ لاہور کے قیام اور احساس تنہائی کا یک لخت خاتمہ ہوگیا۔

شاہد احمد نے مشن کالج میں داخلہ لے لیا اور انگریزی میں آنرز کرلیا۔ انگریزی میں آنرز کرنے کے بعد انہوں نے ایم اے فارسی میں داخلہ لیا۔ انہوں نے اپنے دو استادوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جو اُن کے بڑے بھائی منذر احمد کے ہم جماعت تھے اور شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن۔ پڑھائی سیدھے سبھاؤ جاری تھی کہ عربی کی ایک عبارت پڑھنے پر مولوی صاحب سے ناچاقی ہوگئی اور شاہد احمد نے ایم اے کرنے کا خیال ترک کردیا۔ شمس العلما سے ناچاقی کا واقعہ شاہد احمد نے بڑے دلچسپ انداز سے بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''۱۹۲۹ء میں مشن کالج میں ایم اے (فارسی) میں داخلہ لیا۔ میں اس مضمون کا اکلوتا طالبِ علم تھا۔ یہاں کے استادوں میں دو قابلِ ذکر ہیں۔ ایک ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (حال وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی) اور دوسرے شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن مرحوم۔ ڈاکٹر قریشی نے دو ایک ہی سبقوں میں اندازہ لگالیا کہ مجھے ان سے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا مجھ سے کہہ دیا کہ اگر آپ کوئی دشواری محسوس کریں تو مجھ سے پوچھ لیا کریں۔ اس کی نوبت کبھی نہ آئی۔ شمس العلما دراصل عربی کے پروفیسر تھے۔ وہ مروّت میں مجھے پڑھاتے تھے۔ کیونکہ دادا ابا کی سفارش پر انہیں مشن کالج میں پروفیسری ملی تھی۔ مگر انہوں نے شرط یہ لگائی کہ علی الصباح میرے گھر آجایا کرو۔ میں نے مولوی صاحب سے کچھ کم ایک سال پڑھا۔ غضب کا حافظہ تھا ان کا۔ منہ لپیٹے پڑے رہتے اور 'قائع نعمت خانِ عالی' اور 'اخلاقِ جلالی'، جیسی دقیق کتابیں مجھ سے آگے آگے ''منہ زبانی'' پڑھتے جاتے' ترجمہ میں انگریزی میں کرتا جاتا۔ مولوی صاحب انگریزی نہ تو لکھ سکتے تھے اور نہ بول سکتے تھے۔ مگر مجھے ٹوک کر ایسا صحیح لفظ بتاتے کہ میرا انگریزی دانی کا سارا گھمنڈ کرکرا ہوجاتا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ ایک دن مولوی صاحب خبر نہیں کس جھونجھ میں تھے کہ مجھ

سے اڑ گئے۔ مجھے عربی نہیں آتی تھی، اس لئے اخلاقِ جلالی اٹک اٹک کر پڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ بالکل ہی نہیں چلی تو میں رُک گیا۔ مولوی صاحب کمبل اوڑھے اوڑھے بولے۔

''کیوں رُک گئے؟''

میں نے کہا

''جی عربی ہے۔''

''تو پھر کیا ہوا؟''

''کیا خبر قرآن کی کوئی آیت ہی ہو''

''جی تو پھر؟''

''غلط سلط پڑھوں گا تو گناہ ہوگا''

''جی آپ پڑھیے، گناہ ثواب مجھ پر''

''میں نے فرّاٹے کے ساتھ اردو کی طرح عربی کو پڑھ دیا''

مولوی صاحب بولے

''سبحان اللہ سبحان اللہ اور جناب ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے ہیں''

مجھے مولوی صاحب کا یہ طعنہ بہت برا لگا۔ میں نے چیخ کر کہا۔

''کیا یہ میرا قصور ہے کہ میں ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں پیدا ہوا؟'' وہ ہوں گے عربی کے عالم فاضل مجھے عربی نہیں آتی''

مولوی صاحب نے محسوس کر لیا کہ مجھے ان کا کہا ناگوار گزرا۔ رسان سے بولے ''تو بھئی عربی پڑھ لو۔'' پھر بولے ''ہاں پڑھو''

میں منہ پھُلا کر بیٹھ گیا۔ پھر انہوں نے کہا۔

''جی پڑھیے''

میں نے کہا ''میں نہیں پڑھتا وڑھتا۔ اور میں کل سے نہیں آؤں گا''

مولوی صاحب اٹھ بیٹھے بولے۔

''جناب کو غصّہ بہت جلدی آجاتا ہے''

اس کے بعد مولوی صاحب بہت دیر تک سمجھاتے بجھاتے رہے۔ مگر میں ''السلامُ علیکم'' کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔ پھر مولوی صاحب کے ہاں گیا اور نہ کالج گیا۔ کئی مہینے بعد مولوی صاحب لال کنوئیں کے بازار میں سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ میں اپنے ماموں چشتی صاحب کے ساتھ جا رہا تھا۔ میں کترا کر نکل جانا چاہتا تھا کہ چشتی صاحب نے السلامُ علیکم کہہ کر مولانا کی طرف مصافحہ کرنے کے لئے ہاتھ

بڑھادیے۔ مولانا نے کہا۔

''نہیں۔ پہلے ناراض استاد زادے سے''

یہ کہہ کر میری طرف ہاتھ بڑھادیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں ان کا ہاتھ لیا تو انہوں نے مجھے گلے سے لگالیا اور فرمایا۔

''میاں تم تو سچ مچ ناراض ہی ہوگئے'' اور مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔''

بشیر الدین احمد نے مولوی نذیر احمد کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ''والد صاحب کے مزاج میں کسی قدر درشتی اور خشونت تھی جو مجھ میں بھی ہے۔'' یہ درشتی اور خشونت شاہد احمد میں بھی تھی۔ شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن سے بگاڑ کے معاملے میں اسی دُرشتی اور خشونت کی جھلک ملتی ہے۔ یہ دُرشتی اور خشونت ان کے سارے بھائیوں میں تھی۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ لیکن تھی سب میں اور یہ سارے بھائیوں کی اولادوں میں بھی در آئی تھی۔ اسی کو خاندانی خصوصیات کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد شمس العلما دوسرے دلّی والوں کی طرح کراچی آ گئے تھے۔ برنس روڈ پر کسی جگہ مُقیم تھے۔ شاہد احمد وہاں اُن سے ملنے جایا کرتے تھے۔ وہ شمس العلما کی علمی بصیرت اور تبحر کے بہت قائل تھے۔ انہوں نے اپنے رسالے ساقی میں شمس العلما کے بعض مضامین بھی شائع کیے تھے۔

شاہد احمد آنرز کر رہے تھے کہ بشیر الدین احمد فالج کے مرض میں انتقال کر گئے۔ ان کے گزر جانے سے خاندانی یک جہتی میں نمایاں فرق آ گیا۔ بشیر الدین احمد نے بچّوں کی نگہداشت کے خیال سے سیّد زمانی کے انتقال کے چار پانچ برس بعد تیسری شادی کر لی تھی۔ یہ شادی خاندان ہی کی ایک خاتون ممتاز جہاں سے ہوئی تھی۔ ان سے دو بیٹے اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ بشیر الدین احمد نے اپنی ان بیوی کے لئے اپنے آبائی وطن ریہڑ میں ممتاز محل کے نام سے ایک مکان بنوایا تھا جو واقعی محل تھا۔ یہ محل اب بشیر الدین احمد کے صاحبزادے مسلم احمد کی ملکیت میں ہے۔

بشیر الدین احمد اپنے عہد کی معروف علمی اور ادبی شخصیت تھے۔ وہ ایک بہت بڑے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے اور اردو کے ایک صاحبِ طرز ادیب کے والد تھے لیکن ان کے باپ کی شہرت نے بیٹے کی شہرت کو گہنا دیا۔ بشیر الدین کی ساری زندگی تصنیف و تالیف میں گزری۔ انہوں نے باپ کی طرح اصلاحی ناول لکھے۔ ان کے ناولوں۔ ''اقبال دلہن'' اور ''حسنِ معاشرت'' کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ بشیر الدین احمد کو اصلاحِ معاشرہ سے گہری دل چسپی تھی۔ وہ عوام میں عمومی آگہی پھیلانے کے خواہش مند تھے چنانچہ ان کی بعض کتابیں ایسی ہیں جن میں نوجوان نسل کو جسمانی اور روحانی اسرار و رموز سے آگاہ کیا گیا ہے۔ آج ہمارا معاشرہ بہت ترقی کر گیا ہے لیکن آج سے کم و بیش سو برس پہلے نوعمری کی جسمانی تبدیلیوں اور ذہنی بلوغت کے بارے میں اظہارِ خیال پر قدغن تھی۔ بشیر الدین احمد نے بڑی

دلیری سے اس قدغن کو توڑا۔ 'نشاطِ عمر'۔ 'حرزِ طفلاں' اور 'لختِ جگر' جیسی کارآمد کتابیں مرتب کیں جن سے ان کے عہد کی نئی نسل کو بڑا فائدہ پہنچا۔ بشیرالدین احمد کی تصانیف و تالیفات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ حیدرآباد سے دلّی آ کر وہ باقی زندگی تصنیف و تالیف کے کاموں میں منہمک رہے۔ شاعر بھی تھے ان کا شعری مجموعہ ''دیوانِ بشیر'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

بنیادی اعتبار سے بشیرالدین احمد تاریخ کے عالم تھے۔ ان کا اصل کارنامہ ان کی تاریخی کتابیں ہیں جو آج بھی اپنے موضوعات افادیت اور علمی انداز کی وجہ سے منفرد ہیں۔ ان میں سے پہلی دکن کی ایک ریاست وجے نگر کی تاریخ ہے۔ شاید اردو میں یہ وجے نگر کی پہلی تاریخ ہے جو بڑی محنت سے مرتب کی گئی ہے۔ دوسری کتاب ''واقعاتِ مملکتِ بیجاپور'' تین جلدوں میں ہے یہ دکن کی مبسوط تاریخ ہے، حکومت حیدرآباد نے اس کتاب پر ہزار روپے کا انعام بھی دیا تھا۔ بشیرالدین احمد کو بعض دوسری کتابوں پر بھی انعامات ملے تھے۔

تیسری کتاب ''واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی'' ہے جسے بیسویں صدی کے دوسرے عشرے تک کی دلّی کی انسائیکلو پیڈیا کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے اور دلّی کے چیف کمشنر سر مالکم ہیلی کی فرمائش پر مرتب ہوئی تھی۔ اس کتاب کے حوالے سے دو باتیں ایسی ہیں جن کا قلم بند ہونا ضروری ہے۔

واقعات دارالحکومت دہلی میں دہلی کی مساجد، درگاہوں اور مزارات کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ مندروں اور دوسری عبادت گاہوں کا تذکرہ بھی ہے۔ اگست ۱۹۴۷ء کے فسادات میں دلّی کے ہندوؤں نے متعدد مساجد پر قبضہ کر لیا اور اُنہیں اپنے تصرّف میں لے لیا تھا۔ پاکستانی حکومت نے دلّی میں مسلمانوں کے آثار کی تباہی پر اقوامِ متحدہ میں مرافعہ کیا تھا مرافعے میں واقعات دارالحکومت دہلی بطور ثبوت پیش کی گئی تھی۔

اگست ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد جب دلّی میں کچھ سکون کے آثار پیدا ہوئے اور مسلمانوں کو سانس لینے کا موقعہ ملا تو انہوں نے مقبوضہ مساجد کی بازیابی کے لئے عدالتوں سے رجوع کیا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں تھا۔ بازیابی کے مقدمے عدالت میں پیش ہوئے۔ ثبوت مانگا گیا تو ''واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی'' ثبوت کے طور پر پیش کی گئی۔ عدالتوں نے اس کے مندرجات کو تسلیم کیا اور بہت سی مقبوضہ مساجد واگزار ہو گئیں۔ 'واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی' کا یہ تاریخی کردار اردو نثر کی تاریخ کا ایسا باب ہے جسے فراموش کیا جا چکا ہے تاہم بشیرالدین احمد کی یہ خدمت یادگار حیثیت رکھتی ہے۔ سر مالکم ہیلی نے اس کتاب کے صلے میں بشیرالدین احمد کے لئے خان بہادر کے خطاب کی سفارش کی تھی لیکن انہوں نے اسے منظور نہیں کیا کیونکہ قومی تحریکوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ مسلمانوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور انگریزوں سے نفرت اپنے عروج پر تھی انگریزوں کے عطا کردہ خطاب واپس کیے جا رہے تھے۔ دلّی

کے ایک مسلمان نے اسی زمانے میں خان بہادر کا خطاب واپس نہیں کیا تھا چنانچہ دلّی کے مسلمانوں نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ دلّی کے کسی قبرستان میں ان کا جنازہ دفن نہیں ہونے دیا۔ بڑی مشکل سے پولیس کی نگرانی میں تدفین ہوئی۔

بشیر الدین احمد کے انتقال کے بعد ان کے بیٹوں میں ترکے کی تقسیم ہوئی۔ ہر بیٹے کو پچاس ہزار روپے نقد اور تین سو روپے ماہانہ کی جائداد حصّے میں ملی۔ بڑے بھائی منذر احمد باپ کی زندگی ہی میں ساری جائداد اور گھریلو اخراجات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ بعد میں بھی جائداد اور اخراجات کا مشترک انتظام انہیں کے ہاتھ میں رہا۔ بشیر الدین احمد کے زمانے میں اشتیاق احمد چشتی جو بشیر الدین احمد کے رشتے کے سالے تھے انتظام میں معاون تھے۔ وہ حسبِ دستور معاون رہے۔ منذر صاحب اعلیٰ درجے کے منتظم، کفایت شعار اور رکھ رکھاؤ والے وضع دار انسان تھے۔ بشیر الدین احمد کی کتابوں کی اشاعت بھی انہیں کے ذمّے تھی۔ انہوں نے مولوی نذیر احمد کی بعض کتابوں پر دیباچے بھی لکھے تھے۔ چنانچہ مراۃ العروس کا ایک ایڈیشن کراچی میں بھی ان کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوا ہے اور انہیں کے پیش لفظ کے ساتھ نذیر احمد کے ترجمہ قرآن مجید کا ایک خوبصورت ایڈیشن تاج کمپنی نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا تھا۔

شاہد احمد اور ان کے دوسرے بھائیوں نے منذر احمد کی سربراہی کو بڑی خوش دِلی سے قبول کیا۔ خاندان کا وقار قائم رہا اور مشترک انتظام کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔

منذر احمد کے لئے بشیر الدین احمد نے وکالت کا پیشہ پسند کیا تھا۔ انہوں نے باپ کی خواہش کے مطابق ایل ایل بی کر لیا۔ کچھ دن ایک ہندو وکیل کے نائب کی حیثیت سے کام بھی کیا لیکن اُن کی زبان میں ہلکی سی لکنت تھی۔ یہ اُن کا خاندانی ورثہ تھی۔ لکنت کی وجہ سے انہوں نے وکالت کا خیال چھوڑ دیا۔ مقابلے کے امتحان میں بیٹھے۔ پرچے سارے اچھے ہوئے لیکن زبانی امتحان میں ناکام رہے۔ البتہ اُنہیں ریلوے کے محکمہ حسابات میں ایک اچھا منصب مل گیا اور وہ ریلوے اکاؤنٹس سے وابستہ ہو گئے۔ وہ شکار کے بڑے شوقین تھے۔ دلّی چھوڑ کر کہیں اور نہیں جانا چاہتے تھے۔ گئے بھی تو بریلی اور گورکھپور۔ پھر دلّی واپس آ گئے۔ انہوں نے ایک دن شاہد احمد سے کہا۔ ''دن بھر بیکار بیٹھے بیٹھے کیا کرتے رہتے ہو۔ میرے دفتر میں نوکری کر لو۔'' بڑے بھائی کا حکم تھا۔ سعادت مند شاہد احمد نے ریلوے کے دفتر میں ملازمت کر لی۔ لیکن چند ماہ میں اُکتا گئے۔ ملازمت کا جوا کندھے پر رکھ کر زندگی گزارنا اُنھیں دشوار نظر آیا چنانچہ بھائی سے معذرت کر کے ملازمت چھوڑ دی۔

معذرت میں بھی ادب اور احترام کا پہلو مدّ نظر رہا۔ شاہد احمد ساری زندگی منذر احمد کا خاندانی سربراہ کی حیثیت سے احترام کرتے رہے۔ ان کے سامنے خاموش رہنا، باادب بیٹھنا، ان کی بات کو سر آنکھوں پر جگہ دینا۔ یہ شاہد احمد اور ان کے دوسرے سارے بھائیوں کا مزاج تھا۔ مبشر احمد سے سوا برس

کی چُھٹائی بڑائی تھی۔ دونوں ہم جماعت بھی تھے چھیڑ چھاڑ بھی رہتی تھی، سراج الدین احمد ان دونوں سے چھوٹے تھے۔ اُن کی بڑے بھائی سے زیادہ گھٹتی تھی کیونکہ وہ بھی شکار کے بے حد شوقین تھے۔ دونوں بھائی ساتھ ساتھ شکار کو جاتے تھے۔ ان دونوں کے پابندی سے شکار میں جانے پر خاندان کے کسی آدمی نے پھبتی بھی کسی تھی۔ ''یہ دونوں ایسے خشوع وخضوع سے شکار کو جاتے ہیں جیسے پکّے نمازی جمعے کی نماز پڑھنے جاتے ہیں۔'' شاہد احمد کو شکار سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ دو ایک دفعہ بڑے بھائی کے ساتھ گئے لیکن دل نہیں لگا خیال ہی چھوڑ دیا۔

ریلوے کی ملازمت چھوڑنے کے بعد شاہد احمد کا زیادہ وقت احباب کے ساتھ گزرنے لگا۔ احباب ان میں فضل حق قریشی تھے، انصار ناصری تھے، صادق الخیری تھے، ظفر قریشی تھے اور پیر جی ولایت حسین خمار تھے۔ دستور یہ تھا کہ اتوار کی شام سب کے سب فتح پوری کے بمبئی ابراہیم ہوٹل میں کھانا کھاتے اور وہاں سے اُٹھ کر کوئی فلم دیکھتے۔ بعد میں موسیقی کے جلسوں کی وجہ سے اس معمول میں کمی آ گئی تھی لیکن بہر حال یہ شغل جاری رہا۔ دلّی چھوٹی تو یہ شغل بھی ختم ہو گیا۔ حافظ وصی اشرف نے جامع مسجد پر کتابوں کی دکان کُتب خانہ علم وادب، کے نام سے قائم کی تو شام کو وہاں شاہد احمد، ان کے احباب اور دلّی کے ادیب و شاعر جمع ہوتے تھے۔ بڑی رونق اور چہل پہل رہتی تھی۔ شاہد احمد کے سارے ملنے والے وہیں آ جاتے تھے ہنسی مذاق بھی ہوتا اور ادبی گفتگو بھی ہوتی تھی۔

۱۹۲۹ء کے آخر میں شاہد احمد کے ماموں زاد بھائی ولی اشرف صبوحی نے ایک ادبی رسالہ 'ارمغان' کے نام سے جاری کیا۔ ولی اشرف صبوحی حلقۂ احباب میں بھائی وتی کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا خاندان اشرفیہ سلسلہ کا بزرگ خاندان تھا۔ بھائی وتی کو بچپن ہی سے شعر وادب سے لگاؤ تھا۔ پُرانی باتیں بڑی دل چسپی سے سُنتے تھے اور انہیں گرہ میں باندھ لیتے تھے۔ دلّی کے پُرانے بوڑھوں سے اُجڑے ہوئے شاہ جہاں آباد کی کہانیاں سنتے تھے۔ انہوں نے مبشر احمد اور شاہد احمد کے ساتھ بشیر الدین احمد سے اردو، فارسی اور انگریزی پڑھی تھی۔ بشیر الدین احمد نے جب یہ دیکھا کہ ان کی اردو فارسی کی لیاقت بہت اچھی ہے تو اپنی کتابوں کی تصحیح میں ان کی مدد لینے لگے۔ بشیر الدین احمد کا دیوان ''دیوانِ بشیر'' اشاعتی مرحلے سے گزر رہا تھا۔ ایک دن بھائی وتی نے ہمت کر کے اُن سے کہا ''اگر آپ اجازت دیں تو میں اس دیوان کے لئے ایک تقریظ لکھنا چاہتا ہوں۔'' اجازت مل گئی۔ تقریظ شائع ہو گئی۔ بشیر الدین احمد نے نوجوان ولی اشرف کا حوصلہ بڑھانے کے لئے اُنہیں مولوی محمد ولی اشرف لکھا۔ یہ ۱۹۲۴ء کی بات ہے۔

نوجوانی ہی میں ولی اشرف نے دلّی کے اشراف، ہنرمندوں، کاریگروں، گلی کوچوں اور قلعۂ معلّٰی کی رونقوں کی داستانوں کو ہضم کر لیا معلومات کی کثرت، ادب کے شوق اور شاعری کے ذوق نے 'ارمغان' کا روپ دھار لیا۔

'ارمغان' اوسط درجے کا ادبی رسالہ تھا۔ اُس زمانے میں ادبی رسالوں کو جاری رکھنا بڑا جان لیوا کام تھا۔ مضمون نگاروں کی خوشامد درآمد، منّت، سماجت خریداروں کی تلاش۔ سرمائے کی قلّت خاصی دقتیں تھیں۔ ارمغان کے زیادہ تر لکھنے والوں کا تعلّق دلّی سے تھا۔ بھائی وتّی نے ازراہِ سعادت مندی بڑے بھائی منذر احمد کا بھی ایک مضمون جو کسی قدر افسانہ نما تھا پہلے شمارے میں شائع کیا تھا۔ بھائی وتّی دن رات جان پیلنے کے باوجود ''ارمغان'' چلا نہیں سکے۔ سرمائے کی کمی کی وجہ سے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا۔ پھر ناتجربہ کار تھے بہرحال ''ارمغان'' کی وجہ سے بھائی وتّی کی ادبی سرگرمیوں میں بڑا اضافہ ہُوا۔ وہ ایک اچھے اور لائق ادبی مدیر کی حیثیت سے اردو رسائل کی تاریخ میں اپنا نقش چھوڑ گئے۔

'ارمغان' کی اشاعت سے بہت بڑا فائدہ یہ ہُوا کہ شاہد احمد کا ذوقِ ادب بیدار ہوگیا۔ ادب و شعر ان کا خاندانی ورثہ تھا۔ باپ دادا دونوں منفرد انداز کے نثر نگار، انشا پرداز، شاعر، مترجم اور مورّخ تھے اور شاہد احمد بذاتِ خود ادب کے رسیا اور لکھنے لکھانے کے شوقین تھے۔ افسانے لکھتے تھے۔ احمد حسین خان کے رسالے ''شبابِ اردو'' میں ان کا ایک افسانہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا لیکن دوسرے رسالے والوں نے ان کا کوئی افسانہ شائع نہیں کیا۔

ساقی کا اجراء

شاہد احمد ایک ادبی رسالہ شائع کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرتے رہے۔ کبھی یہ خیال بھی آتا کہ دلّی ہندوستان کا دل ہے۔ قدیم تہذیب و ثقافت کی یادگار ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر صاحبِ قلم یہاں موجود ہیں۔ شاعر بھی ہیں نثر نگار بھی ہیں۔ لیکن اس قدیم مرکزِ علم و ادب کے شایانِ شان کوئی ادبی رسالہ شائع نہیں ہوتا۔ جب کہ دوسرے شہروں سے شائع ہونے والے ادبی رسالوں نے دھوم مچا رکھی ہے۔

دوستوں کے حلقے میں بھی جو لوگ تھے ادب دوست تھے۔ شعر و ادب سے رغبت رکھنے والے انصار ناصری تھے، (صلائے عام والے میر ناصر علی کے پوتے) ادب ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ صادق الخیری تھے مصورِ غم علامہ راشد الخیری کے صاحب زادے۔ شعر و ادب کے رسیا فضل حق قریشی تھے۔ انہیں بھی ادب سے گہرا شغف تھا۔ غرض جتنے دوست تھے سب کے یہاں ادب کا ذوق موجود تھا۔ پھر یہ کہ دلّی میں بزرگ لکھنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ ان میں سے بعض زمانہ کی خرابی سے مجبور ہو کر قلم رکھ چکے تھے ان کی بازیافت بھی ضروری تھی۔ چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ شاہد احمد ایک اعلیٰ درجے کا ادبی پرچہ شائع کریں اور اس فیصلے پر عمل بھی ہُوا۔

اُس زمانے میں اور آج بھی ادبی رسالے اپنے مدیر کے ذوق و شوق اور حوصلے سے ترقی کرتے

ہیں۔ رسالے شائع کرنے والے عموماً رسالے کے سب سے اہم پہلو یعنی مالیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ رسالہ شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ ہُن برسنے لگے گا۔ ہاتھوں ہاتھ لئے جانے کی بات تو بالکل صحیح ہے۔ ہر اچھا رسالہ اپنے پڑھنے والوں کا حلقہ بنالیتا ہے۔ لیکن ہُن برسنے والی بات سراسر غلط ہے۔ چند شمارے بڑی آب وتاب سے شائع ہوتے ہیں۔ پھر کھینچ پڑ جاتی ہے۔ خریدار ملتے نہیں۔ اشتہار مُیسّر نہیں آتے پرچہ چلے تو کیسے چلے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ دن بعد پرچہ بند ہو جاتا ہے اور غریب مدیر کو کاتب، کاغذ والوں اور پریس والوں سے مُنہ چھپانا پڑتا ہے۔

مولانا عبدالمجید سالک نے جب ایک رسالہ شائع کیا تو ان کا خیال تھا کہ چند ہی دن میں وارے نیارے ہو جائیں گے مگر ہوا یہ کہ جو کچھ پاس پلّے تھا وہ بھی جاتا رہا۔ بہت سے رسالے ایسے بھی تھے جو سسکتے رہتے تھے۔ چندے کی اپیلیں شائع کرتے رہتے تھے لیکن لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے شاہد احمد ان مسائل سے محفوظ تھے۔ باپ سے ترکے میں وافر رقم ملی تھی۔ صاحبِ جائداد تھے۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ رئیس زادے تھے چنانچہ پہلے تو دوستوں سے صلاح مشورے ہوتے رہے پھر نام کے بارے میں جستجو ہوئی۔ کیا نام رکھا جائے۔ کون سا نام موزوں ہوگا۔ مختلف نام سامنے تھے۔ کسی نے کچھ تجویز کیا۔ کسی نے کچھ اور رائے دی۔ آخر کار خواجہ حافظ کے ایک مصرعے ''جہانِ فانی و باقی فدائے شاہد وساقی'' نے نام کا مسئلہ حل کر دیا۔ انصار ناصری، فضلِ حق قریشی، صادق الخیری، خمار دہلوی سب ہی نے اس تجویز کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کی ہے بہر حال 'ساقی' نام طے ہو گیا اور پہلے شمارے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ شہر کی دیواروں پر پوسٹر چسپاں کیے گئے۔ ادیبوں اور شاعروں کو خط لکھے گئے۔ مقامی ادیبوں کے یہاں حاضری دی گئی۔ بڑی دھوم دھام سے پہلا پرچہ شائع ہوا اور ایک دھوم مچ گئی۔ اشتیاق احمد چشتی رسالے کے مینجر اور اسلام الدین عرف 'ناگا' دفتر کی دیکھ بھال پر مامور ہوئے۔ کھاری باؤلی کے جدّی مکان کے مردانے حصّے میں جہاں مولوی نذیر احمد کی نشست رہتی تھی بشیر الدین احمد کی کتابوں کے ذخیرے کے ساتھ ساتھ ساقی کا دفتر قائم ہو گیا۔ یہیں شاہد احمد اور ان کے دوستوں کی باقاعدہ نشست رہنے لگی۔

ساقی خوب چلا (یہ سرگزشت آگے چل کر بیان ہوگی) بڑی شان شوکت سے چلا لیکن مالی امور کی دیکھ بھال نہ ہونے سے سارا سرمایہ صاف ہو گیا۔ شاہد احمد کے احباب چشتی صاحب اور ناگا کے عمل دخل سے بجا طور پر کُھنساتے تھے۔ دبے لفظوں میں شاہد احمد کو سمجھاتے بھی تھے لیکن انہوں نے مطلق پروا نہیں کی۔ گھر کی دولت لُٹتی رہی اور شاہد احمد کو کوئی احساس نہیں ہُوا۔

آخر کار ایک دن بڑے بھائی منذر احمد نے جو تمام اخراجات کے نگراں تھے شاہد احمد کو ٹوکا۔ چیک بک اور حساب کتاب حوالے کیا۔ کاغذ اور پریس کے واجبات ادا کرنے کے بعد کُل پانچ سو روپے کی رقم باقی

بچی تھی۔ شاہد احمد کے لئے یہ بہت بڑا دھاکا تھا۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ پانچ سو روپے سے پرچہ چلتا رہا اور کتابیں بھی شائع ہوتی رہیں۔ کتابوں کی اشاعت کا کام بڑا منفعت بخش ثابت ہوا۔ اور ہوتا کیوں نہیں۔ وہ اُلفتے جو دونوں ہاتھوں سے پیسہ لوٹ رہے تھے، الگ کر دیے گئے۔ شاہد احمد نے حساب کتاب خود دیکھنا شروع کیا۔ مخلص احباب نے ہاتھ بٹایا۔ احباب پہلے ہی سے سمجھاتے آرہے تھے مگر اُس وقت شاہد احمد کی آنکھیں نہیں کھلی تھیں۔ اب جو آنکھیں کھلیں تو کاروبار بھی چمکا۔ پندرہ برس میں تقریباً سو کتابیں شائع ہوگئیں۔ رسالے اور کتابوں کی اشاعت کا ایک دائرہ بن گیا۔ آمدنی بڑھ گئی۔ روپے کی ریل پیل ہوگئی۔ کاروبار سے تقریباً پندرہ سو سے دو ہزار روپے ماہوار کی آمدنی ہونے لگی۔ ساقی کی شان شوکت اور شاہد احمد کی وضع داری برقرار رہی۔ وہ جب تک دلّی میں رہے ان کی مالی حیثیت بھی مستحکم رہی اور زندگی بڑی اچھی گزرتی رہی سال کے سال گرمیوں میں بچّوں کے ساتھ پہاڑ پر جاتے تھے۔ شملے میں ایک مکان بھی خرید لیا تھا۔ کشمیر میں بھی ایک مکان کی خریداری کا ڈول ڈالا تھا۔ گاہے گاہے وہاں بھی جاتے رہتے تھے۔ سیر، تفریح کھانا پینا، کھلانا، تقریبیں، ادیبوں کی دعوتیں، سبھی کچھ ہوتا رہتا تھا۔

ساقی کا وقار بڑھتا گیا۔ شاہد احمد کے مالی حالات بہتر سے بہتر ہوتے گئے لیکن عالیہ بیگم گھلتی گئیں۔ علاج میں بڑی بھاگ دوڑ ہوئی۔ یہ کہنا درست ہے کہ عالیہ بیگم کے علاج اور نگہداشت میں شاہد احمد زمین کا گز بن گئے۔ خود ڈریسنگ کرتے رہے۔ ناسور اس بلا کا تھا کہ اگر ایک دن ڈریسنگ نہ ہوتی تو ایسا عفن پھیلتا کہ پاس بیٹھنا دشوار ہو جاتا۔ شاہد احمد ہی کی ہمت تھی کہ وہ مریضہ کی ڈریسنگ بھی کرتے۔ تیمارداری بھی کرتے۔ دل جوئی بھی کرتے۔ بچّوں کو بھی دیکھتے اور ساقی کے سارے کام بھی کرتے۔ اُنہیں موسیقی سے غیر معمولی شغف تھا۔ موسیقی ان کی زندگی کا ضروری جزو بن گئی تھی۔ ریاض بھی ہوتا۔ اُستادوں کے یہاں حاضری بھی ہوتی۔ موسیقی کے جلسوں میں شرکت بھی ہوتی۔ ایک سر اور ہزار سودے تھے۔

آخر کار ۲۴ جون ۳۸ء کو سولہ سالہ رفاقت کا خاتمہ ہوگیا۔ عالیہ بیگم چھ بچّوں مشہود احمد۔ مسعود احمد۔ شہود احمد (مرحوم) عائشہ۔ شاہدہ اور مسعودہ کو چھوڑ کر رخصت ہوگیں۔ شاہد احمد کو بڑا صدمہ ہوا۔ اگلے مہینے کے ساقی کا اداریہ وہ خود نہیں لکھ سکے تھے۔

عالیہ بیگم کے اُٹھ جانے سے بچّوں کی پرورش کا مسئلہ پیدا ہوا لیکن بہن بھائیوں نے ساتھ دیا۔ شاہد احمد نے ایک خط میں صادق الخیری کو لکھا تھا کہ

''تین بچیاں بشریٰ کے ساتھ جگراؤں چلی گئیں۔ مشہود سراج کے پاس ہے۔ مسعود منجھو صاحب کے پاس ہے اور ان کے ساتھ حیدر آباد چلا جائے گا۔ چھوٹا دودھ پیتا بچہ اعظم خان کی حویلی میں ہے۔''

اس ہمدردی اور خلوص کے باوجود شاہد احمد کو اپنے گھر کی ویرانی۔ بچّوں کی پریشانی اور خود اپنی تنہائی کا

رہ رہ کر خیال آتا تھا۔ چھبیس برس پہلے اُن کے والد بشیر الدین احمد کو بھی اسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان کی بیوی سیّد زمانی چھ بچے چھوڑ کر اچانک انتقال کر گئی تھیں۔ عالیہ بیگم کا انتقال اچانک تو نہیں ہوا، تاہم ان کے انتقال سے بچے وقتی طور پر تتر بتر ہو گئے۔ بشیر الدین احمد سیّد زمانی کے انتقال کے وقت حاکمِ ضلع تھے۔ نوکروں چاکروں کی ایک پوری فوج تھی۔ بیٹی کے لئے گورنس رکھ لی۔ بچّوں کی نگرانی خود کی لیکن شاہد احمد کو تنہا یہ بار اُٹھانا پڑا۔

عالیہ بیگم کا انتقال ہوا شاہد احمد بتیس برس کے تھے عالیہ بیگم کی بیماری کی وجہ سے اُنہیں گھر کا سُکھ نہیں ملا۔ دنیاوی نقطہ نظر سے وہ اچھی سے اچھی جگہ شادی کے لئے موزوں تھے۔ عالیہ بیگم کے انتقال کے بعد اور ان کے انتقال سے پہلے بعض خواتین نے ان پر ڈورے ڈالنے کی بھرپور کوشش بھی کی تھی لیکن شاہد احمد نے اس سلسلے میں کوئی توجہ نہیں کی۔ انہوں نے بڑے غور و فکر اور بھائیوں کے مشورے اور اجازت سے عاصمہ بیگم سے شادی کی جو رشتے میں عالیہ بیگم کی بھانجی تھیں۔

عاصمہ بیگم نے اُنہیں سکون، راحت اور اطمینان کی راہ دکھائی۔ عاصمہ بیگم سے شادی سے پہلے شاہد احمد کا زیادہ وقت عالیہ بیگم کے علاج کی بھاگ دوڑ میں گزرتا تھا۔ بے اطمینانی اور بے یقینی کا خوف طاری رہتا تھا۔ اب قدرے سکون حاصل ہوا۔

شاہد احمد کی ازدواجی زندگی کا یہ پُرسکون پہلو ان کے بعض احباب کو بہت کھلا۔ سگے سوتیلے کا راگ الاپ کر ان لوگوں نے شاہد احمد کی وفات کے بعد عاصمہ بیگم کے خلاف دل کا بخار نکالا ہے (شاہد احمد کی زندگی میں کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس قسم کی بے سروپا باتیں کہتا اور لکھتا)۔ اصل میں ایک کا سُکھ دوسرے کا دُکھ بن جاتا ہے۔ کہنے والے کی زبان کون پکڑ سکتا ہے جو جس کا جی چاہے کہے۔ عاصمہ بیگم اپنے شوہر کے لئے صحیح معنوں میں رفیقِ حیات اور انیس و ہمدم ثابت ہوئیں۔

عاصمہ بیگم سے شادی کے بعد شاہد احمد بتاشوں والی گلی اور کھاری باؤلی کے ماحول سے بددل ہو کر اپنی سُسرال اعظم خاں کی حویلی میں جا بسے تھے۔ لیکن ساقی کا دفتر حسبِ دستور کھاری باؤلی والے مردانہ مکان ہی میں رہا۔ وہ خود صبح سے شام تک وہیں رہتے تھے۔ وہیں احباب کا جمگھٹ بھی رہتا تھا۔ ساقی کا سارا کام وہیں ہوتا تھا۔

شاہد احمد کے چچازاد بھائی مولانا رازق الخیری کا یہ بیان اپنی جگہ بڑا اہم ہے کہ:

''اس لحاظ سے (شاہد احمد) بڑے خوش نصیب تھے کہ دوسری بیوی نہایت شریف اور نیک نکلیں۔ شوہر کے بچّوں کو اپنے پیٹ کی اولاد سمجھا اور ایک طرف شفیق ماں ثابت ہوئیں تو دوسری طرف خدمت گزار اور غم گسار، صحیح معنوں میں رفیقۂ حیات ثابت ہوئیں۔''

شاہد احمد، اعظم خان کی حویلی منتقل ہو گئے لیکن کھاری باؤلی والے مکان سے کاروباری ربط کے علاوہ

بھی تعلقِ خاطر برقرار رہا۔ عید، بقرعید، تیج تیوہار کو سب بھائی کھاری باؤلی میں جمع ہوتے۔ بڑے بھائی نے دلّی کی سول لائنز میں کورٹ روڈ پر کوٹھی بنوالی تھی۔ وہاں منتقل ہوگئے تھے سراج الدین احمد بھی وہیں منتقل ہوگئے تھے۔ سارے بھائی۔ ان کی بیویاں، بچّے، کھاری باؤلی میں جمع ہوتے۔ نماز کو ساتھ جاتے۔ بڑی رونق رہتی تھی۔ ماشاءاللہ بڑا کنبہ تھا۔ سب جمع ہوتے تو میلے کا سا سماں ہوتا تھا۔

یہ دور شاہد احمد اور ان کے ادبی کاروبار کے عروج کا دور تھا اور موسیقی کے عروج کا دور بھی تھا۔ ریڈیو آہستہ آہستہ مقبول ہورہا تھا۔ شاہد احمد ریڈیو پر موسیقی کا پروگرام کرتے تھے مگر یہاں بھی بڑے بھائی کا ادب لحاظ قائم تھا۔ موسیقی کے پروگراموں میں ان کا نام ایس۔احمد تھا تاکہ بڑے بھائی اور خاندان والوں کو پتہ نہ چلے۔ وہ ریڈیو کی موسیقی کے پروگرام میں بڑے ٹھاٹ سے شریک ہوتے تھے۔ بڑا ٹھسّا تھا۔ اسٹیشن ڈائریکٹر آگے پیچھے پھرتا تھا۔ معاوضہ قبول ہی نہیں کرتے تھے مگر جب ان کے اُستاد چاند خاں نے کہا کہ آپ معاوضہ لے کر ہم لوگوں کو دے دیا کریں تو اس پر عمل ہونے لگا۔ دلّی میں شاہد احمد نے موسیقی کے حوالے سے کبھی کوئی رقم قبول نہیں کی۔ استاد بندو خاں کے صاحبزادے امراؤ خاں نے جو دلّی میں شاہد احمد کی نگرانی میں ریاض کیا کرتے تھے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ:

''لکھنؤ میں شاہد صاحب کا ریڈیو پروگرام سُن کر ایک ہندو صاحبِ ذوق نے ان کی دعوت کی اور بہت خاطر تواضع کی۔ اُس دن شاہد صاحب تقریباً دو گھنٹے تک گاتے رہے۔ جب محفل برخاست ہونے کے قریب آئی تو صاحب خانہ نے پانوں پر باون روپے رکھ کر بتاشوں کے ساتھ شاہد صاحب کی خدمت میں پیش کیے۔ شاہد صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرے اُستاد ہیں۔ یہ حق اُنہیں کا ہے۔ صاحبِ خانہ نے یہ تحفہ مجھے پیش کیا۔ یہ شاہد صاحب کی شرافت اور وضع داری تھی۔''

اگست ۱۹۴۷ء تک شاہد احمد کا ٹھاٹ باٹ قائم رہا۔ ادبی سرگرمیاں، ساقی میں ادبی معرکے، ساقی کے امتیازی حیثیت رکھنے والے خاص نمبر، ساقی کی ترقی پسند ادب کی ترجمانی نمایاں، معروف اور اُبھرتے ہوئے فن کاروں کا اجتماع، معیاری کتابوں کی اشاعت، ادیبوں اور شاعروں سے روابط، موسیقی کے جلسے۔ سب جاری رہے۔ یہ ناممکن تھا کہ اردو کا کوئی ممتاز ادیب دلّی آئے اور شاہد احمد سے نہ ملے یا شاہد احمد کے یہاں اُس کی دعوت نہ ہو۔ دوستوں اور عزیزوں کے لئے سراپا مہر و محبت رکھنے والے شاہد احمد کے مزاج میں اپنے بزرگوں کی طرح اکڑ بھی تھی۔ وہ ہر ظلم اور زیادتی کے خلاف ڈٹ جاتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی سراج الدین احمد کی ایک خوردسال بیٹی نعیمہ نے دو سکّے نگل لیے۔ بچّی کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے اوزار ڈال ڈال کر اُس کی غذا کی نالی زخمی کردی۔ دِلّی کی گرمی میں ان زخموں میں پیپ پڑ گئی اور بارہ دن کچھ نہ نگل سکنے کی وجہ سے پانی کو ترستی بچّی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ شاہد احمد نے ڈاکٹروں کی اس نااہلی اور غفلت پر ساقی میں بھی سخت احتجاج کیا۔ اخبارات میں بھی مہم

چلائی اور سارے شہر میں ہسپتال کے عملے کے خلاف پوسٹر چسپاں کروا دیے۔ پریس برانچ نے ساقی کو دھمکی دی لیکن مدراس سے ایک ڈاکٹر بلایا گیا جس نے تحقیق کر کے ہسپتال کے عملے کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ ساقی کو ملنے والی دھمکی کا انجام یہ ہوا کہ دلّی کے انگریز چیف کمشنر نے جو اردو خوب جانتا تھا شاہد احمد کو بلایا اور بڑی نرمی سے بات کر کے پریس برانچ کی دھمکی واپس لے لی۔ ڈاکٹر کا کہیں اور تبادلہ ہو گیا۔ شاہد احمد کا یہ انداز ان کے دادا مولوی نذیر احمد کے انداز کا پرتو تھا کہ حق کے لئے سینہ سپر ہو جاؤ اور ظالم کو کیفرِ کردار تک پہنچاؤ۔

زندگی بڑی عافیت سے گزر رہی تھی۔ شاہد احمد اور ان کے خاندان والے مطمئن اور خوش تھے لیکن فضا، ماحول اور حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔

شاہد احمد دہلوی کی دلّی سے رُخصت

چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ پندرہ اگست کو ہندوستان آزاد ہوا لیکن انتقالِ آبادی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ دونوں ملکوں کے سرکاری ملازم اپنی اپنی پسند کے مُلک روانہ ہو رہے تھے تاہم یہ عمل پُرسکون نہیں تھا۔ فضا میں خون کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ دلّی کے مسلمان باشندے بڑے پریشان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ ان کی پریشانی اور گھبراہٹ بالکل بجا تھی کیونکہ پاکستانی علاقوں سے آنے والے شرنارتھی دلّی کے مسلمانوں کے لئے سراپا قہر بنے ہوئے تھے۔

شاہد احمد سیاسی آدمی نہیں تھے۔ اُن کے ملنے جُلنے والوں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی تھے۔ کھاری باؤلی میں ان کا جدّی مکان ہندوؤں کے گڑھ میں تھا مگر اُنہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اُنہیں اس مکان سے نکلنا پڑے گا۔ مکان سے کیا دلّی ہی سے نکلنا پڑے گا اور دلّی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چُھٹ جائے گی۔

شاہد احمد کی سیاسی دلچسپی کی کیفیت یہ تھی کہ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں سجاد ظہیر کی خواہش پر وہ ایک ادیب اور ساقی کے مدیر کی حیثیت سے اس سے وابستہ ہو گئے سیکرٹری بھی بن گئے۔ وہ 'شاہ جہاں' کے نام سے ساقی کے علاوہ ایک اور رسالہ بھی نکالتے تھے اس رسالے کو انہوں نے ترقی پسند تحریک کا آرگن بھی بنا دیا تھا۔ اس رسالے پر ایڈیٹر کی حیثیت سے خمار دہلوی کا نام ہوتا تھا مگر سب جانتے تھے کہ پرچہ شاہد احمد کا ہے۔ کرشن چندر کے ایما پر انہوں نے دلّی میں ترقی پسند ادیبوں کی ایک کانفرنس بھی کی تھی جس کے اخراجات اُن کے بقول کرشن چندر اور ہندی کے ایک ادیب نے فراہم کیے تھے۔ اس کانفرنس کو دلّی کی حکومت نے پسند نہیں کیا اور اُنہیں دفتر میں طلب کیا۔ وہاں پریس برانچ میں

ان کا ایک ہندو ہم جماعت افسر تھا جو ان کے ساتھ آنرز میں پڑھ چکا تھا۔ اُس نے کہا۔ ''بھائی شاہد صاحب۔ زمانہ خراب ہے۔ احتیاط سے کام کرو۔'' اس ہندو ہم جماعت کے افسر ایک مسلمان تھے۔ انھوں نے شاہد احمد سے پوچھا۔ ''آپ کو روس سے کتنی رقم ملتی ہے۔'' شاہد احمد نے کہا ''کوئی رقم نہیں ملتی'' مگر انہوں نے شاہد احمد کی بات پر یقین نہیں کیا۔

ترقی پسند تحریک کے ادبی جلسے دلّی میں شاہد احمد کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ اشتراکی خیالات رکھنے والے ادیبوں کی پکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ سجاد ظہیر دلّی آئے ہوئے تھے۔ شاہد احمد نے اُن سے پوچھا کہ اگر میں گرفتار ہو گیا تو آپ میری کیا مدد کریں گے، انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ ''ہم آپ کی اخلاقی مدد کے علاوہ کوئی اور مدد نہیں کر سکتے۔'' ایسا کورا جواب سُننے کے بعد ترقی پسند ادب کی تحریک سے شاہد احمد کی دل چسپی برائے نام رہ گئی۔

ادبی سیاست سے وابستگی کا خاتمہ تو یوں ہوا۔ ویسے عام مسلمانوں کی طرح اُنہیں بھی تحریکِ پاکستان سے لگاؤ تھا۔ ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں وہ بھی اپنے چھوٹے بھائی سراج الدین احمد کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کسی اور سیاسی سرگرمی کا اظہار نہیں کیا۔ نہ یہ بات ان کے وہم و گمان میں تھی کہ اُنہیں بے سروسامان گھر سے نکلنا پڑے گا۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد ۱۸۵۷ء کی دار و گیر میں بائیس نیم جاں عزیزوں کے ساتھ بے سروسامان سجے سجائے گھر سے نکلے تھے۔ فرنگی سپاہیوں نے بندوقیں تانیں اور کہا گھر سے نکل جاؤ۔

بیسویں صدی میں شاہد احمد دہلوی کا اسی طرح دلّی سے ناتا ٹوٹ گیا۔ وہ اپنے گھر سے چند نایاب کتابیں لئے نکلے۔ جیب میں پچاس روپے تھے۔ ہاتھ میں کتابیں اور کُل اثاثہ پچاس روپے۔ اس شان سے نکلے۔ ان کے اہل خانہ کو بندوقوں کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا تاہم وہ جس طرح گھر سے نکلے اُس کی عبرت انگیز روداد کے جستہ جستہ اقتباسات سے کچھ اندازہ ہوگا کہ دلّی میں ہونے والے مظالم، دھاندلی، زبردستی اور حکومت کی جانب داری کتنی لرزہ خیز اور ہولناک تھی۔ شاہد احمد نے اپنے ذاتی حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک ایک لفظ خون میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ روداد حقیقت پر مبنی، سچّی اور بے حد اثر انگیز ہے دلّی کے یک طرفہ فسادات کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن شاہد احمد کی 'دلّی کی بپتا' سب سے منفرد ہے۔ ان کے بقول:

''۵ر ستمبر جمعہ کے دن میں اپنے دفتر گیا۔ ضروری خطوں کے جواب لکھ کر محلّے کی مسجد میں دو بجے نماز پڑھنے گیا۔ دفتر واپس آیا اور اپنے کمرے میں پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک زور کا دھماکا سُنائی دیا۔ معاً خیال آیا کہ کہیں بم پھٹا۔ سامنے فتحپوری مسجد کی طرف دیکھا تو سینکڑوں کبوتر اُڑتے اور تاوے کاٹتے دیکھے اور اس کے بعد ایک دل ہلا دینے والا شور برپا ہوا۔ غور سے سُننے پر معلوم ہوا کہ اللہ اکبر کے نعرے بلند

ہو رہے ہیں کسی نے فتح پوری کی مسجد میں بم پھینکا ہے۔ خدا خیر کرے، پانچ منٹ تک ساکت کھڑا مسجد کے گنبدوں کو دیکھتا رہا۔ گڈوڈیہ مارکیٹ کی چھت پر سے ہندو بھاگ رہے تھے۔ یہ وہی عمارت ہے جس نے مسجد کا پشتہ دبالیا اور اپنے پرنالے مسجد کی چھت پر نکالے ہیں۔ شور مسجد میں سے نکل کر کھاری باؤلی کے بازار اور بڑیوں کے کٹڑہ میں پھیلتا چلا گیا۔ کچھ لوگ بھاگتے ہوئے ہماری گلی میں سے نکلے، معلوم ہوا کہ نماز تو ختم ہو چکی تھی لیکن کسی وعظ کی وجہ سے نمازی رُکے ہوئے تھے کہ مسجد کی ایک کیاری میں بم پھٹا۔ ایک آدمی تو اُسی وقت مر گیا، آٹھ دس زخمی ہو گئے۔ نمازی جب نعرے لگا کر مسجد سے نکلے تو پولیس نے بندوقیں چھتیا کر انہیں منتشر کر دیا۔ سارے بازار چشم زدن میں بند ہو گئے اور خوف کے مارے سب اپنے اپنے گھروں کو بھاگ رہے ہیں۔ ہمارے سب گھر زیادہ خطرے میں تھے کہ ہندوؤں کا سارا محلّہ ہے مگر محلّے والوں نے کچھ نہیں کیا اور نہ کچھ کہا۔ تاہم جتنے بھی آس پاس کے مُسلمان تھے سب مع بال بچّوں کے ہمارے زنانہ گھر میں آ گئے تھے۔ دروازہ بند کر لیا گیا تھا۔ میں دفتر میں سے چھت پر سے ہو کر اندر گیا تو عجیب منظر دیکھا۔ پچاس ساٹھ عورتیں دالانوں میں بھری ہوئی ہیں، سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ صحن اور چھوٹے دالان میں مرد کھڑے ہیں، کسی کے ہاتھ میں چھُری ہے اور کسی کے ہاتھ میں لکڑی اور ایک صاحب جو دروازے کے قریب تھے، اُن کے ہاتھ میں دو نالی بندوق، کوئی پتھر پر چھُری رگڑ رہا ہے اور کوئی سیخ کی نوک تیز کر رہا ہے۔ ہر شخص تیار کھڑا ہے کہ اب حملہ ہوا کہ اب حملہ ہوا— تہہ خانے میں سے چند بڑی بُوڑھیاں جھولیوں میں اینٹیں بھر بھر کر لا رہی ہیں، اور خالی اور ٹوٹی ہوئی بوتلیں جمع کی جا رہی ہیں۔ کوئی مٹی کے تیل کا کنستر سنبھالے ہوئے ہے اور کوئی مرچیں ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ میں نے کوٹھے پر سے یہ سارا منظر دیکھا اور پھر چاروں طرف ہندوؤں کے مکانوں پر نظر ڈالی، سب اپنے اپنے گھروں میں خاموش کھڑے تھے اور تیور حملہ کرنے کے نہیں تھے۔ گلی میں سے مُسلمان بھاگے چلے جا رہے تھے، یہ دیکھ کر میں پھر چھت پر سے ہو کر اپنے دفتر میں آ گیا۔ دو منشی جامع مسجد ہی کی طرف رہتے تھے، ایک کھاری باؤلی میں اور ایک دفتر ہی میں۔ منشی آزاد مرزا اور منشی انوار سے میں نے کہا کام بند کرو اور گھر چلو، ورنہ کرفیو لگ جائے گا اور یہیں رہنا پڑے گا، اُدھر گھر والے پریشان ہوں گے۔ میاں مشہود احمد بھی دفتر میں تھے، تین بجے ہم سب دفتر سے نکلے، گلی میں ہندو کھڑے تھے مگر مُسلمانوں کی آر جار ہو رہی تھی۔ ہم چاروں بھی نکلتے چلے گئے۔ اور لال کنوئیں بازار میں سے آگے بڑھے۔ ہمدرد دواخانہ جمعہ کی وجہ سے بند تھا۔ ویسے بھی سب دُکانیں بند پڑی تھیں، دس بیس آدمی آ جا رہے تھے، ہمدرد کے ڈاکخانہ پر اشرف صبوحی کھڑے تھے، اُنہیں بھی گھر پہنچنے کی تاکید کر کے ہم آگے بڑھے ہی تھے کہ سامنے ایک رکشا میں موٹا سا ہندو آتا دکھائی دیا۔ دوبارہ جو اُدھر نظر اُٹھی تو دیکھا کہ رکشا والا خالی رکشا موڑ رہا ہے اور وہ اتنا موٹا آدمی نہایت تیز بھاگا چلا جا رہا ہے، اس کے پیچھے دو چھریرے

بدن کے لڑکے لگے ہوئے تھے جن سے وہ پیچھا چھڑا کر بھاگا جاتا ہے۔ ایک لڑکے کے ہاتھ میں اُس کی پھٹی ہوئی قمیص کا پچھلا حصہ تھا اور دوسرا اس سے قریب ہو کر الگ ہو چکا تھا۔ جب وہ ہمارے سامنے سے گُزرا تو اس کی دُھوتی اُوپر سے سُرخ ہو چکی تھی۔ اور وہ اس گراں ڈیل پر بھی اتنا تیز دوڑ رہا تھا کہ چھریرے بدن والے لڑکے اسے دوبارہ نہ پا سکے۔ ہم نے دیکھا کہ سامنے قاضی حوض پر پولیس کی چوکی ہے، اور انہیں کچھ خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ گھبراہٹ میں ہم چاروں پنڈت کے کوچے میں گھس گئے۔ سوچا کہ گلی شاہ تارا میں سے ہو کر قاضی حوض پر نکلیں گے۔ اُوپر سے کسی نے میرا نام لے کر دو تین آوازیں دیں۔ دیکھا تو ''کہکشاں'' کا دفتر ہے اور کاظم صاحب آواز دے رہے ہیں ''یہاں آ جایئے'' بیس منٹ اُن کے پاس بیٹھ کر مشورہ کیا کہ کدھر سے جانا چاہیے؟ چنانچہ ان کے بتائے ہوئے راستہ سے قاضی کے حوض پہنچے۔ چند اور مُسلمان جوڑی کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ لپک کر اُن کے ساتھ ہو لیے اور جوڑی والان کے سرے پر آ پہنچے، وہاں چند ہندو غنڈے کھڑے تھے اور اس علاقہ میں اکثر خنجر زنی کے واقعات ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ تو ہم جھجکے لیکن رکنے کا موقعہ نہیں تھا اور دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا اس لئے بڑھتے ہی چلے گئے، اُنہوں نے بُری بُری نظروں سے ہمیں دیکھا لیکن کچھ بولے نہیں، مطمع مجتبائی سے مُسلمانوں کی آبادی شروع ہو گئی اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ چار بجے گھر پہنچے تو گھر والے بھی مطمئن ہوئے۔ بس وہ دن اور آج کا دن، دوبارہ کھاری باؤلی جانا نصیب نہیں ہوا۔ خیال یہی رہا کہ دو ایک دن میں امن ہو جائے گا تو دفتر جا کر ضروری کاغذات، بینک اور ڈاکخانہ کی کاپیاں وغیرہ لے آؤں گا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کرفیو پر کرفیو لگنے شروع ہو گئے۔ چار چار دن گزر جاتے اور گھر سے نکلنے کی نوبت نہ آتی۔''

مزید دیکھئے۔

''ہمیں ہر قسم کی تکلیف پہنچ رہی تھی لیکن مجبور تھے کہ کہیں اور جا بھی نہیں سکتے تھے، اور میرا ارادہ بھی دلّی چھوڑ کر جانے کا نہیں تھا۔ پاکستان کے ملازموں کو کراچی لے جانے کے لئے ہفتہ عشرہ کے لئے چند ہوائی جہاز منگائے گئے تھے۔ پاکستان اسپیشل بم سے اُڑا دی گئی تھی۔ اس لئے جہازوں سے دفتر والوں کو لے جایا جا رہا تھا۔ ۱۳ر کو ایک صاحب نے اطلاع دی کہ آپ کے فلاں عزیز کے پاس چار سیٹیں خالی ہیں، آپ کے ہاں سے چار آدمی جا سکتے ہیں۔ میرے ہاں اُس وقت ماشاءاللہ بیس آدمی تو اپنے گھر کے تھے اور اتنے ہی وہ رشتہ دار جو خوف سے اپنے مکان چھوڑ کر میرے ہاں آ گئے تھے۔ کس کو بھیجا جائے اور کس کو نہ بھیجا جائے؟ بالآخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اور میرے بچّے تو نہیں جائیں گے۔ جائیں گے تو سب ساتھ اور مریں گے تو سب ساتھ۔ اس لیے میں نے اپنی ساس اور اُن کے تین بچّوں کو بھیج دیا۔ انہیں ہوائی اڈّے تک پہنچانے میرے ہم زلف عبدالعزیز صاحب گئے، یہ خود بھی پاکستان اسٹاف کے

آدمی تھے، اور اپنے ساتھ ہمارے ٹکٹ بنوانے میں سرگرداں! چلتے وقت کہہ گئے کہ آپ بھی سامان تیار رکھیے۔ اگر ہمارے ٹکٹ بن گئے تو میں ٹرک لے کر آؤں گا اور ہمیں فوراً جانا پڑے گا، رات ہوگئی اور وہ واپس نہیں آئے۔ بُرے بُرے خیال آنے شروع ہوئے۔ دریا گنج کی طرف سے جانا پڑتا تھا، جہاں دن دہاڑے مسلمانوں کو لُوٹ لیا جاتا، چھتوں پر سے گولیاں ماری جاتیں۔ پھر نئی دلّی کی منزل جہاں سِکھ تلواریں لئے گھات میں لگے رہتے اور جب یہ مفت خواں بھی خیریت سے طے ہو جائے تو ہوائی اڈّا جس کے بارے میں سُنا جاتا تھا کہ سارا سامان چھین لیا جاتا ہے اور ضرورت ہو تو مار بھی دیا جاتا ہے۔ ان سب افواہوں نے پریشان کرنا شروع کیا۔ گھر والوں نے سامان پیک کرنا شروع کیا۔ سامان تین طرح کا تھا۔ ریل سے جانے کا الگ، ہوائی جہاز کا الگ اور پیدل بھاگنے کا الگ۔ میں نے اپنی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھے تو یہیں رہنا تھا، دلّی مجھ سے بھلا کیسے چُھوٹ سکے گی؟ محلّے والے اکثر گھبرا گھبرا کر مجھ سے پُوچھتے کہ آپ تو نہیں جا رہے؟ اور میں کہتا کہ کسی کو نہیں جانا چاہئے۔ عورتوں اور بچّوں کو اگر نکال سکتے ہو تو نکال دو، یہی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ہیں۔ لیکن محلّے میں سے چپکے چپکے لوگ کھسکنے شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ جو بڑے جی دار اور پیش پیش تھے وہ بھی معلوم ہوا کہ پُرانے قلعہ چلے گئے اور یہ معلوم ہونے لگا کہ محلّے کو دق ہو گئی ہے۔ لوگ قافلے بنا بنا کر پیدل جا رہے تھے اور راستے میں لُٹ بھی رہے تھے، اُسی زمانے میں آصف علی صاحب امریکہ سے چند روز کے لئے دلّی آئے تھے، انہیں بعض مُسلمان کوچۂ چیلاں میں بھی لے آئے کہ ذرا چل کر دیکھیے دلّی کی کیا حالت ہو گئی ہے۔ ان کے تصور میں بھی یہاں کی ابتری نہیں تھی، وہ کوچۂ چیلاں اور اپنے گھر کو دیکھ کر رونے لگے۔ اور وفورِ غم سے ان کے مُنہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔"

"۵ر ستمبر کو میرے گھر میں سات سو روپے تھے۔ ایک ہفتہ ہی میں پانچ سو ختم ہو لیے، مہنگائی، چندے اور ضرورت مندوں نے دھڑ توڑ دیا۔ اور روپیہ کہیں سے ملنے کی اُمید نہیں تھی، بنک اور ڈاک خانہ دونوں نے روپیہ ادا کرنا روک دیا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دلّی سے لاہور کیسے پہنچ سکیں گے؟ خدا پر بھروسہ تھا اور اسی نے ہر موقعہ پر مدد کی تھی۔ یہ مشکل بھی وہی آسان کرنے والا تھا۔ ۱۴ر ستمبر کو ایک دوست کی بیوی برے حالوں ہانپتی کانپتی پہنچیں۔ یہ پہلے قرول باغ میں لُٹیں اور پھر جس کوارٹر میں ٹھہری تھیں وہاں لُٹیں۔ اب کوچۂ چیلاں میں اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں معہ بچّوں کے پڑی تھیں اور راشن خریدنے تک کو اُن کے پاس کچھ نہ تھا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ "انہیں جو کچھ دے سکتی ہو دے دو۔" اُن کے پاس سو روپے باقی تھے، پچاس انہیں دے دیے۔ ان کی مصیبت دیکھ کر ہم اپنی پریشانیاں بھول گئے۔"

"پُرانا قلعہ کیا کُھلا، دلّی والوں کے پاؤں اُکھڑ گئے، مگر قلعہ میں اس قدر تکلیفیں تھیں کہ اکثر آدمی وہاں سے لَوٹ آئے کہ اپنے گھر ہی میں مرجانا اچھا۔ میں نے سوچا کہ عزیز صاحب اگر ٹکٹ بنوا لائے تو

عورتوں اور بچّوں کو اُن کے ہمراہ کردوں گا کہ انہیں لے جاؤ۔ میں بھی امن ہونے کے بعد پہنچ جاؤں گا۔ مگر عزیز ۱۴ر کو بھی نہیں آئے۔ ۱۵ر کی صبح کو میں قریب کے محلّے سوئی والان میں گیا اور وہاں سب کی ڈھارس بندھائی کہ ''اپنے گھر سے زیادہ محفوظ مقام آج کل اور کوئی نہیں ہے، یہیں جمے بیٹھے رہنا۔'' اُنہوں نے پوچھا: ''اور آپ؟'' میں نے کہا۔ ''میں بھی اپنے گھر میں بیٹھا ہوں۔'' وہاں سے بارہ بجے واپس آ رہا تھا کہ ایک فائر کی آواز سُنائی دی دیکھا۔ تراہا بیرم خاں کے چوراہے میں ایک گورکھا رائفل چھتیائے کھڑا ہے۔ اب جو بھگدڑ مچی ہے تو قیامت کا نمونہ پیشِ نظر تھا۔ اس نفسانفسی میں دیکھا کہ ایک شخص زخمی پڑا ہے اور اسے چند آدمی اُٹھا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہی زخمی ہمارے محلّے کے اسکول میں لایا گیا تو معلوم ہوا کہ گولی سینے میں دائیں طرف لگی ہے۔ ہوا یہ کہ باہر آٹے کی چکّی پر سینکڑوں آدمی گیہوں پسوانے کھڑے ہوئے تھے، کہ گورکھے نے بغیر کچھ کہے سُنے گولی ماردی۔ کوئی قاعدہ قانون باقی نہیں رہا تھا۔ نہ داد نہ فریاد۔ کمرہ بنگش کے نیچے ایک پٹھان کی لاش تین دن سے پڑی سڑ رہی تھی، اسے بھی کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر گولی ماردی گئی تھی۔ ملٹری کا پہرہ لگا رہتا اور کرفیو کے اوقات میں مُسلمانوں کے گھر لُوٹ لیے جاتے تھے اور مُسلمان باہر نِکلا اور اس کے گولی لگی۔ ان وجوہ سے دلّی کا مُسلمان حکومت کی طرف سے بالکل مایوس ہوگیا تھا۔''

''جب سے دلّی میں ہنگامے شروع ہوئے تھے، مُسلمان بڑے خدا پرست ہوگئے تھے۔ چنانچہ مسجدوں میں پنج وقتہ نماز ادا کرنا ان کے فرائض میں داخل ہوگیا تھا۔ اور تہجد گزاری تک پر آمادہ ہوگئے تھے۔ جو لوگ اب بھی نماز سے گریز کرتے، ان سے زبردستی نماز پڑھوائی جاتی، ۱۵ر ستمبر کو میں نماز ظہر کی تیاری کر رہا تھا کہ یکا یک عزیز صاحب نہایت پریشان حال پہنچے، ان کے کپڑے میلے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ آتے ہی اُنہوں نے کہا ''جلدی چلیے ٹرک آ گیا۔ دس منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرے گا۔'' گھر میں جیسے بھونچال آ گیا۔ ہمارے سب آدمی جس کے ہاتھ میں جو چیز آئی لے کر کھڑے ہوگئے۔ جو مہمان آئے ہوئے تھے وہ شکوہ کرنے لگے کہ ''ہم کو چھوڑے جا رہے ہو، ہمیں بھی لے چلو۔'' میں عجیب شش و پنج میں پڑ گیا کہ کیا کروں؟ جب سب تیار ہو کر جمع ہوگئے تو میں نے کہا۔ ''تم چلو، میں بھی آ جاؤں گا۔'' اس پر میری بیوی اور بچّے بولے۔ ''تو ہم بھی جا کر کیا کریں گے؟ ہم بھی نہیں جاتے۔'' اور وہ سب دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ اُدھر ٹرک والا چیختا ہوا آیا کہ ''چلتے ہو تو چلو ورنہ ہم جا رہے ہیں۔'' میں اِس صورت حال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ ایک منٹ کے لیے سوچا کہ یہ بچّے اور عورتیں کیا کریں گی؟ کہاں جائیں گی؟ ان سے علیحدہ ہونا تو پیچھا چھڑانا ہے اور اپنی ذمہ داریوں سے رُوگردانی۔ یہ تو بڑی بُزدلی ہے کہ اس مصیبت کے وقت میں ان کا ساتھ چھوڑا جائے اور عزیز صاحب پر ساری ذمّہ داری ڈال دی جائے، وہ اکیلے کیا کیا کریں گے؟ خدا جانے آئندہ کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھانی لکھی ہیں۔ اگر

زندہ سلامت ہندوستان سے نکل بھی گئے تو پاکستان میں کہاں جا کر پڑیں گے، انہیں کون جانتا ہے؟ اور ایسے وقت میں کون پہچانتا ہے؟ پھر لے دے کے کُل پُونجی پچاس روپے ہے خرچ کہاں سے آئے گا؟ ادھر یہ خیال تھا کہ محلّے والے میرے جانے پر کیا کہیں گے؟ کہ ہم کو تو یہیں جمے رہنے کی تلقین کرتے رہے اور خود چل دیئے۔ انہیں اب تک دھوکے ہی میں رکھا۔ گھر کس پر چھوڑا جائے؟ جو لوگ مکان پر موجود ہیں، یہ بھی پا بہ رکاب بیٹھے ہیں۔ خود محلّے والے ہی گھر لوٹ لیں گے۔ کوئی ضابطۂ اخلاق تو باقی رہا نہیں ہے۔ مال کے مقابلے میں جان بچانا بہر حال ضروری ہے۔ مال تو اور بھی کما لیں گے۔ جان بچنی چاہئے۔ غرض احمقوں کی طرح اُٹھا اور الماری کھول کر چند نایاب کُتب نکالیں اور ساتھ ہولیا۔ بھرا پُرا گھر مہمانوں پر یونہی چھوڑا، سب نکل کھڑے ہوئے، محلّے میں جنہوں نے دیکھا کہا۔ ''لو بابو جی بھی چلے —'' ''کیوں میاں، آپ بھی جا رہے ہیں؟'' — ہائیں آپ بھی؟'' اور میں سر جُھکائے ملزموں کی طرح خاموش چلا جا رہا تھا۔ پھاٹک پر دو ٹرک کھڑے تھے جن کے ساتھ ایک کیپٹن اور دو رائفل والے تھے، اور بھی چند سواریاں ان میں بیٹھی تھیں، ہم بھی سوار ہو گئے۔ اتنے میں اس زخمی کی چارپائی چار آدمی اُٹھائے ہوئے آ گئے جس کے صبح گولی لگی تھی۔ کیپٹن نے ترس کھا کر اُس کو بھی ٹرک میں مع چارپائی کے رکھ لیا، اس کے بعد ٹرک میں اتنے آدمی اور سامان بھرا گیا کہ تِل دھرنے کی جگہ باقی نہ رہی۔ ٹرک تراہے سے ہو کر نکلے، بازار سُنسان پڑے تھے۔ سامنے وہ گورکھا اوپچی بنا کھڑا تھا جس نے صبح گولی ماری تھی۔ اس سے آگے پُھول کی منڈی میں بھی ایک گورکھا کھڑا تھا۔ جب ہم اور آگے بڑھے تو ایک بالا خانے سے عورتوں کے قہقہوں کی آواز آئی، دیکھا تو ایک ہمارے جاننے والے وکیل صاحب کی عورتیں ہمیں دیکھ دیکھ کر ہنس رہی ہیں اور ہماری عورتوں اور بچیوں سے کہہ رہی ہیں کہ تم بھی بھاگی جا رہی ہو؟ فیض بازار میں ہندو اور سکھ مکانوں اور پٹڑیوں پر کھڑے گالیاں دے رہے تھے اور ہم سہم رہے تھے کہ کہیں چھتوں پر سے حسب معمول گولیاں نہ آنے لگیں، مگر اللہ نے خیر ہی رکھی۔''

''قلعے میں اتنی بھیڑ تھی کہ ٹرک چیونٹی کی چال چلتے تھے ایک گھنٹے میں دروازے سے باہر نکلے اور نظام الدین کی سمت ہو لیے۔ اسٹیشن کے باہر کئی ہزار آدمی پڑے تھے۔ انھوں نے جھٹ پٹ اپنا سامان ریل میں بھرا خود بھی پھیل پھیل کر بیٹھ گئے۔ آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد ہم بھی ایک ڈبے میں زبردستی گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔''

''رات ہو گئی۔ ریل میں روشنی نہیں تھی۔ باہر ہلکی ملگجی چاندنی تھی، مُسافروں کو مُسلسل پریشانیوں نے اس قدر چڑچڑا بنا دیا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر اُلجھنے لگتے۔ خود غرضی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ مجھ سمیت کسی کو سوائے اپنے آپ کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایک صاحب جو نظام الدین سے پھیل کر دو آدمیوں کی جگہ پر بیٹھے تھے لاہور تک اسی فراخ دلی سے بیٹھے آئے۔ ان سے بات کرو تو کاٹنے کو آتے، یہ نہیں کہ

جاہل اور نچلے طبقے کے ہوں، کسی دفتر کے کلرک تھے۔ انگریزی بھی بول لیتے تھے۔ اُنہوں نے پھیلتے پھیلتے اپنے بچّوں کو بھی دھکیل کر ہم میں دھنسا دیا تھا۔ اور بچّے تنگ آ کر آخر کھڑے ہو گئے تو باپ کو ان کی سعادت مندی پر دلی مسرّت ہوئی۔ عزیز صاحب سے یہ بربریت نہ دیکھی گئی اور وہ بول پڑے ''اوروں کا خیال نہیں کرتے تو نہ کرو، مگر اپنے بچّوں کا خیال کرو۔'' انہوں نے نہایت بُری شکل بنا کر جواب دیا۔ ''آپ کو کیا تکلیف ہے؟ آپ کے تو بچّے نہیں ہیں؟'' یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنے آپ کو دو اُنگل اور پھیلا دیا۔ گرمی کے مارے سب کا فِشار نِکلا جا رہا تھا۔ ریل چلتی اور رُکتی رہی اور سب بیٹھے بیٹھے اونگھنے اور سونے لگے۔ میں بھی کھڑکی سے سر باہر نکالے اونگھ رہا تھا، دو بج رہے تھے اور لدھیانہ آنے والا تھا۔ گاڑی خوب تیز چل رہی تھی، کہ ایک دم سے جھٹکا کھا کر رُک گئی۔ ساری گاڑی میں ایک شور برپا ہو گیا۔ جھٹکوں سے جامنیں سی گھل گئیں۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا؟ کسی نے کہا ''ٹکّر ہو گئی۔'' کسی نے کہا۔ ''بم لگا دیا۔'' اور عورتوں اور بچّوں نے رونا شروع کر دیا۔ کسی نے رو رو کر کلمہ اور کسی نے دعائیں پڑھنی شروع کر دیں، باہر سے کسی فوجی کی آواز آئی ''کھڑکیاں بند کرو۔'' ساری کھڑکیاں چڑھ گئیں اور بعض نے اپنے ٹرنک اور بستر ے ان میں اڑا دیئے۔ ہمارے پاس اتنی جگہ بھی نہیں تھی کہ پہلو ہی بدل لیں۔ میں اپنی سیٹ پر کھڑا ہو گیا اور بچّوں کو پنکھا جھلنے لگا، اتنے میں فوجی موٹروں اور جیپوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اب سب کو معلوم ہو گیا کہ ریل پر حملہ ہونے والا ہے۔ مُسافروں میں سے کسی کے پاس چھڑی تک نہ تھی۔ بھیڑ بکریوں کی طرح سب بھرے ہوئے تھے۔ اور انہی کی طرح سب کو مرنا تھا۔ عورتیں چیختیں تو مرد اُن سے زیادہ چیختے کہ خاموش رہو۔ ورنہ سب مارے جائیں گے۔ وہ سہم کر چپکی ہو جاتیں اور پھر اللہ کو یاد کرنے لگتیں، مگر بچّے کیسے چپکے ہوں۔ اُنہیں تو گرمی اور اندھیرے نے اُلٹا دیا۔ ڈبّے کا پانی ختم ہو چُکا تھا اور جس کے پاس تھوڑا سا باقی تھا وہ کاہے کو دیتا۔ بچّے پیٹے گئے اور زور سے روئے تو اُن کے گلے گھونٹے گئے۔ محمود جب چُمکار پُچکار سے چُپکا نہیں ہوا تو طیش میں، میں نے اسے اِس زور سے بھینچا کہ وہ دہم ہو کر رہ گیا اور سسکیاں لینے لگا۔ بیوی قلّتِ خون کی مریضہ، اُنہیں غش آ گیا۔ دُور سے گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور نزدیک ہوتی جا رہی تھیں۔ ہمارے محافظ دستے نے بھی اُتر کر گولیاں چلانی شروع کر دی تھیں۔ فرق یہ تھا کہ ان کے پاس برین گنیں بھی تھیں۔ ہم سب اپنی موت کے منتظر تھے کہ اب گولی لگی یا اب، دروازہ اور کھڑکیاں توڑ کر سکھ داخل ہوئے۔ باہر کسی فوجی کے بولنے کی آواز سُنائی دی تو ایک صاحب نے ہمّت کر کے پُوچھا کہ ''ہم اُتر کر کہیں بھاگ جائیں؟'' فوجی نے کہا۔ ''تم ریل میں بیٹھے رہو، جب تک ہم زندہ ہیں، تم نہیں مر سکتے — اس سے بڑی ڈھارس بندھی۔ مگر کھڑکی کا تختہ بھلا رائفل کی گولی کو کیسے روک سکتا ہے۔ اور باہر گولیاں برس رہی تھیں۔ خدا جانے باہر اور آگے ریل پر کیا گزر رہی تھی، یہاں تو اپنی موت سامنے کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ بے کسی کی موت! کیا خبر تھی کہ یوں مارے جائیں گے ورنہ دلّی سے ہرگز نہ نکلتے، اور اب یہ لڑکی ماری جائے گی اور اس لڑکی کو سکھ کھینچ

لے جائیں گے اور ان کے برچھے ہمارے سینے توڑ کر پار ہو جائیں گے۔ یا اللہ! تُو اس بے عزّتی سے پہلے مجھے موت دے دیجیو، اور اس مختصر سے وقفے میں اپنی پُوری زندگی کئی دفعہ آنکھوں کے آگے سے گزر گئی۔ ایک گھنٹہ تک دونوں طرف سے گولیاں چلتی رہیں اور شور مچتا رہا۔ اور یہ ایک گھنٹہ قیامت کا دن ہو گیا۔ پھر گولیاں کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئیں اور موٹروں کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں اور کسی فوجی کے کہنے کی آواز سُنائی دی۔ ''بھاگ گئے حرامزادے۔'' میں نے کھڑکی تھوڑی سی کھولی کہ دیکھوں باہر کیا گزری، لیکن سب نے مِل کر مجھے اس زور سے ڈانٹا کہ میں نے آدھی کھڑکی کھول کر خوب باہر دیکھا۔ وہ خودغرض اور چڑچڑا آدمی بھی بولا۔ ''کھڑکی بند کر دو، گولی مار دے گا کوئی۔'' میں نے کہا۔ ''گولی میرے لگے گی، آپ کے تو نہیں لگے گی۔'' وہ کہنے لگا۔ ''ہمیں بھی مرواؤ گے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا ذمہ نہیں لیتا۔'' اب تو خُدا خُدا کر کے جان بچی تھی اور طبیعت حاضر ہوئی تھی۔ آدھی کھڑکی میں نے کھلی رکھی تا کہ ہَوا تو آئے، ایک گھنٹے میں ڈبہ تپ کر تنور بن گیا تھا اور پسینہ چوٹی سے ایڑی تک بیسیوں دفعہ آ چُکا تھا، کپڑے ایسے ہو گئے کہ اُنہیں نچوڑ لو۔ خیر تو باہر مدھم چاندنی میں کچھ دکھائی نہیں دیا البتہ جب گاڑی چلی تو دُور جھاڑیوں میں سے کئی آوازیں آئیں کہ ہمیں یہاں سے نکال لو، اور کپتان نے کہا۔ ''تم خود آ جاؤ۔ ہم نہیں آ سکتے۔'' اور وہ بیچارے وہیں رہ گئے۔ اور ریل چل دی۔ لدھیانہ آیا اور چلا گیا۔ چار بجے جالندھر پہنچ کر گاڑی کھڑی ہوئی اور کپتان نے پہرہ لگوا کر اعلان کر دیا کہ گاڑی اب صبح کو چلے گی جو اُترنا چاہے پلیٹ فارم پر اُتر سکتا ہے اور پانی لے سکتا ہے، بیٹھے بیٹھے پاؤں جڑ گئے تھے اور اس ایک گھنٹے میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم سب برسوں کے بیمار ہیں اور ہم میں سکت ہی باقی نہیں ہے، دروازے تو کیا کُھل سکتے تھے کہ چھت تک سامان چُنا ہوا تھا۔ البتہ کھڑکیوں میں سے کُود کُود کر ہم سب مرد باہر نکلے اور پانی پر ٹوٹ پڑے۔ عورتوں اور بچّوں کو پانی دیا اور تاکید کی کہ تھوڑا تھوڑا پئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ طبیعت بگڑ جائے۔ پھر خود پیا، مُنہ ہاتھ دھویا اور جب اوسان ٹھیک ہوئے تو آگے کے ڈبّے دیکھنے چلے کہ ان پر کیا گزری۔ راستے میں سکھ کپتان مِلا۔ یہ کوئی بھلا آدمی تھا اور ہم نے اُس سے انگریزی میں ساری کیفیت دریافت کی۔ انگریزی میں اِس لیے پُوچھا کہ یہ ہمیں ہمارے حُلیے سے احمق نہ سمجھ لے۔ اُس نے بتایا کہ لائن پر پتھر ڈال دیئے گئے تھے۔ اور انجن ڈرائیور نے ریل کو اُلٹنے سے بچا لیا۔ ڈرائیور بھی سکھ تھا اور وہ چاہتا تھا کہ انجن نکال کر لے جائے۔ مگر کپتان نے فوراً ایک آدمی دوڑایا کہ انجن نہ جانے پائے۔ ممکن ہے کہ حملہ آوروں سے ڈرائیور کا ساز باز ہو۔ بہر حال انجن نہ جا سکا۔ ورنہ ساری ریل کاٹ کر ڈال دی جاتی۔ حملہ آور ہزاروں کی تعداد میں آئے تھے، ان میں گولیاں چلانے والے اور تھے، برچھے مارنے والے اور، اور سامان اُٹھا کر لے جانے والے اور۔ بڑے انتظام سے آئے تھے اور بڑی باقاعدگی سے لُوٹ مار کر کے چلے گئے۔ کپتان کا اندازہ تھا کہ حملہ آوروں میں سے پانسو مارے گئے مگر یہ مبالغہ ہے۔ ہم سے دو ڈبّے آگے حملہ کا پُورا زور رہا اور تین ڈبّے بالکل خالی ہو گئے۔ ان میں لاشیں پڑی تھیں۔ اور

باہر پلیٹ فارم پر بیسیوں زخمی مرد اور عورتیں پڑے تڑپ رہے تھے۔ سینکڑوں مُسافر لاپتہ تھے، بہت سے گھبراہٹ میں اُتر کر بھاگ گئے اور پھر واپس نہ آ سکے، انہیں بھی مُردہ ہی سمجھنا چاہیے۔ وہ کیا بچّے ہوں گے۔ زخمیوں کی مرہم پٹی بالکل نہیں ہو سکی وہ یوں ہی تڑپتے سِسکتے لاہور تک لائے گئے۔ جالندھر پر گاڑی دس بجے تک کھڑی رہی۔ عذر یہی تھا کہ لائن صاف نہیں ہے۔ دس بجے جالندھر سے روانہ ہوئے اور ماناںوالہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رُکی کی رُکی رہ گئی۔ معلوم ہوا کہ انجن بارہ گھنٹے سے زیادہ کام کر چُکا ہے اور آگے نہیں جا سکتا۔ اب دوسرا انجن منگایا ہے جو اسے آ کر لے جائے گا۔ اتنی اجازت مِل گئی کہ جو نیچے اترنا چاہے اُتر آئے۔ پانی پھر ختم پر تھا، صراحی میں جو پانی تھا وہ چھوٹے بچّوں کو بطور دوا کے دیا جا رہا تھا۔ اسٹیشن کے پاس ایک کنواں تھا۔ لیکن سب کو اندیشہ تھا کہ اس میں زہر نہ ڈال دیا گیا ہو۔ اس لیے کسی نے اس میں سے پانی لینے کی ہمّت نہ کی۔ مگر جب پیاس نے بہت بے چین کیا تو سامنے جوہڑ میں جو برسات کا پانی بھرا ہوا تھا، اُسے چند آدمیوں نے سُونگھا، چکھا اور پینے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی ساری ریل نے وہی مٹیالا پانی پیا۔ میں نے بھی ایک گلاس بھر کے پیا۔ مزے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ رنگ البتہ چائے کا تھا۔ چار گھنٹہ بعد ایک چھوٹا انجن آیا اور ریل مریل چال سے روانہ ہوئی۔ امرت سر پر خوب گہما گہمی تھی ہزاروں شرنارتھی پڑے ہوئے تھے اور ان کی ریلیں بھر بھر کے جا رہی تھیں۔ ہماری گاڑی پلیٹ فارم پر تھوڑی دیر ٹھہری لیکن آگے یارڈ میں آ کر پھر کھڑی ہو گئی۔ سامنے نل کُھلے ہوئے بہہ رہے تھے اور دُھوپ میں انکی موٹی موٹی دھاریں بلّور کی دکھائی دے رہی تھیں۔ کئی دفعہ ارادہ ہوا کہ ہمّت کر کے پانی لے آئیں مگر دو چار خوف ناک شکلیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ آخر ایک صاحب سے نہ رہا گیا اور اُنہوں نے سکھ گارڈ سے پُوچھا۔ ''کیوں صاحب ہم سامنے نل میں سے پانی بھر لیں؟'' اُس نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ''یہ امرتسر ہے، جانتے نہیں؟'' ریل کھڑی رہی، پانی بہتا رہا اور پیاسے سِسکتے رہے۔ معلوم ہوا کہ بریک خراب ہو گئے ہیں اس لیے مستری کی تلاش ہو رہی ہے۔ ایک گھنٹے کے بعد امرتسر سے نجات ملی۔ بیاس کے اسٹیشن پر بھی یہی ماجرا پیش آیا۔ نل بھی بہہ رہے تھے اور کورے کورے مٹکے بھی بھرے رکھے تھے، لیکن ان مسافروں کے لیے جو مشرقی پنجاب جا رہے تھے۔ سکھ ہر جگہ تلواریں لیے پھر رہے تھے۔ بیاس میں بھی سکھ بڑی تعداد میں اِدھر اُدھر جمع ہو گئے تھے، مگر دن کا وقت اور پہرہ دار مستعد تھے۔ اس لیے کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ ریل سب اسٹیشنوں سے خیریت کے ساتھ گُزر گئی، اٹاری ہندوستان کا آخری اسٹیشن بھی آ گیا۔ یہاں حفاظتی دستہ بھی ہمیں اللہ کے سپرد کر کے رُخصت ہو گیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد یہاں سے گاڑی روانہ ہوئی تو جیسے مُردوں میں جان پڑ گئی۔ پاکستان زندہ باد اور قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگنے شروع ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ ہم پاکستان کی سرحد میں داخل ہو چکے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پاکستان کا پہلا اسٹیشن جلّو آ گیا۔ یہاں سینکڑوں آدمی ریل کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ریل کے رُکتے ہی ہر ڈبّہ پر کئی کئی آدمی آ گئے اور سب کو روٹیاں، دال اور اچار تقسیم کرنے لگے۔ دو دن کے بھوکے اِن روٹیوں پر اس طرح گرے

جیسے کبھی روٹی دیکھی ہی نہ تھی۔ ایک ایک آدمی دس دس روٹیاں ہو کے میں دبا کے بیٹھ گیا۔ عورتیں اور بچے جو دوسری طرف تھے۔ مانگتے ہی گئے، وہ تو کہیے کہ کھانے کا انتظام اس قدر وافر تھا کہ سب کو حصّہ پہنچ گیا۔ میں نے ۱۸ ستمبر کی رات کو کھانا کھایا تھا اور اب ۲۰ کی رات کو پُورے اڑتالیس گھنٹے بعد آدھی روٹی کھائی۔ میرا پہلا روزہ آٹھ یا نو برس کی عمر میں رکھوایا گیا تھا۔ جب روزہ کُھلا تو میری اتنی بُری حالت ہوگئی تھی کہ نہ تو کچھ کھایا گیا اور نہ پیا گیا۔ بالکل وہی کیفیت اس وقت بھی ہوئی، بڑی مشکل سے آدھی روٹی آم کے اچار سے کھائی اور ایک گلاس پانی کا پیا۔ مُنہ کا مزا بدلا ہوا تھا۔ نبض دیکھی تو بخار تھا۔ ایک گھنٹہ بعد گاڑی روانہ ہوئی، ۹½ بجے لاہور پہنچ گئی۔''

یہ تفصیل شاہد احمد کے دلّی سے لاہور پہنچنے کی تھی۔ لاہور اسٹیشن پر اُن کا دو سالہ بیٹا محمود گم ہوگیا۔ سب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ نجانے کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھا کر اللہ آمین کے پلے ہوئے بچے کو کلیجے سے لگا کر لائے تھے۔ لاہور پہنچتے ہی وہ غائب۔ چاروں طرف ڈھنڈیا پڑی۔ ہزاروں آدمی اسٹیشن پر پڑے ہوئے تھے۔ اسٹیشن کیا تھا۔ انسانوں کا ایک جنگل تھا۔ بارے محمود ایک جگہ بیٹھا ہوا مل گیا۔

شاهد احمد دهلوی لاهور میں

شاہد احمد اپنے گھر والوں کے ساتھ رات کو لاہور پہنچے۔ رات کے گیارہ بجے سے شہر میں کرفیو لگ جاتا تھا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور سب لوگ بارود خانے میں میاں ایم اسلم کے یہاں پہنچے۔ مکان کی ڈیوڑھی میں ڈاکٹر تاثیر اور دو چار آدمی اور بیٹھے ہوئے تھے۔ تاثیر صاحب پہلے تو شاہد احمد کو پہچانے ہی نہیں۔ جب پہچانے تو کہنے لگے'' کہ آپ تو دس سال زیادہ بوڑھے نظر آتے ہیں۔'' میاں ایم اسلم کو خبر ہوئی۔ باہر آئے۔ شاہد احمد کو دیکھ کر سنّاٹے میں آ گئے۔ خواتین اور بچے اندر گئے۔ شاہد احمد کو بھی وقتی طور پر چین مل گیا۔

دوسرے دن سے بحالی کی کاروائی شروع ہوئی۔ میاں صاحب نے پانی والے تالاب کے کوچہ سیٹھاں میں ایک مکان الاٹ کروادیا، لیکن بیس بائیس دن تک اُنہیں اپنے یہاں مہمان رکھا۔ روزگار کی صورت یہ نکلی کہ ''اندرون لوہاری گیٹ'' نرائن دت سیگل کی دکان الاٹ ہوگئی۔ نرائن دت سیگل تیرتھ رام فیروزپوری کے جاسوسی ناولوں کے ترجمے شائع کرنے کے لیے سارے مُلک میں مشہور تھا۔ جاسوسی ناولوں کے علاوہ اس کے یہاں بنگالی ناولوں اور اسی قسم کی دوسری کتابوں کی اشاعت ہوتی تھی۔ دکان میں مال وال تو برائے نام تھا۔ بہرحال ایک ٹھیا ضرور تھا۔ مشہود احمد اس کتابوں کی دکان پر بیٹھنے لگے۔

شاہد احمد کے بعض احباب نے ان کی وفات کے بعد جو تاثرات قلم بند کیے اُس میں اُنہیں اس حوالے

سے سادہ لوح ٹھہرایا۔ لکھنے والوں نے لکھا کہ وہاں تو دولت کی گنگا بہہ رہی تھی۔ انہوں نے ایک معمولی سی دکان اور مکان پر قناعت کر لی۔ افسوس یہ ہے کہ ان لوگوں نے شاہد احمد کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ شاہد احمد رئیس اور رئیس زادے تھے۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا یا سوال کرنا اُن کے مسلک کے خلاف تھا۔ میاں صاحب نے جو کچھ کیا خود کیا۔ دوست نوازی کے طور پر کیا۔ کیا شاہد احمد میاں صاحب یا کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلاتے کہ مجھے فلاں مکان اور فلاں دکان الاٹ کرادو۔ اس قسم کا مطالبہ ان کی خاندانی غیرت کے منافی تھا۔

لاہور میں شاہد احمد لشتم پشتم گزر کرتے رہے۔ دلّی کا سارا کاروبار تلپٹ ہو گیا۔ جائداد کی آمدنی ختم، کیونکہ جائداد پر کسٹوڈین نے قبضہ کر لیا تھا۔ دلّی سے روانہ ہوئے تھے تو پچاس روپے جیب میں تھے۔ اب یہ صورتِ حال کہ آمد ایک پیسے کی نہیں اور ایک بڑے کنبے کی ذمہ داری۔ نجانے کیا کیا جتن کیے۔ کس طرح وقت گزارا۔ یہ انہیں کا دل جانتا ہوگا۔ دلّی میں سب کچھ برباد ہو چکا تھا۔ وہاں جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کشتیاں جل چکی تھیں۔

کتابوں اور رسالے کے کاروبار کو سنبھالنا چاہا۔ از سرِ نو شروع کرنے کا خیال ہوا لیکن بے یقینی کی فضا اور بیچارگی کے ماحول میں لوگ کتابیں اور رسالے نہیں پڑھتے نہ خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ مرے پر سو دُرّے یہ کہ ساقی کے لیے ڈیکلریشن کی بھاگ دوڑ کرتے رہے لیکن حکومت پنجاب کی پریس برانچ میں چودھری محمد حسین بیٹھے تھے۔ چودھری صاحب نے منٹو اور عصمت کے افسانوں کے خلاف فحاشی کے الزام میں حکومت کی طرف سے مقدمے دائر کیے تھے۔ شاہد احمد، منٹو اور عصمت پر جُرمانہ بھی ہوا تھا لیکن ہائی کورٹ میں اپیل ہوئی اور مقدمے ختم کر دیے گئے۔ شاہد احمد نے دس مہینے تک بھاگ دوڑ کی مگر ڈیکلریشن نہ ملنا تھا نہ ملا۔ عاجز آ گئے اور ناامید ہو گئے کہ یہاں ساقی کے اجراء کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ چودھری صاحب جب تک محکمے میں ہیں ساقی کے اجراء کی اجازت نہیں ملے گی۔ بڑی پریشانی کا دور تھا۔ شاہد احمد روز بروز کُھک ہوتے جا رہے تھے۔ آمدنی کوئی نہیں۔ خرچ وہی شاہانہ۔ آخر پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ شاہد احمد کی نوجوانی کا کچھ حصہ لاہور میں گزرا تھا۔ جب موقع ملا تو رسیاں تُڑا کر دلّی واپس چلے گئے۔ اب دلّی کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ایک دن کوچہ سیٹھاں کا مکان بھائی ولّی کے حوالے کیا۔ دکان کے کاغذات واپس کیے اور کراچی آ گئے۔

شاھد احمد دھلوی کراچی میں

شاہد احمد کراچی میں ایک عزیز کے ساتھ مارٹن روڈ پر رہنے لگے۔ چھوٹا سا کوارٹر۔ نہ پانی نہ بجلی۔

سارے کوارٹر ایک جیسے۔ ایک شام کہیں سے واپس آئے۔ اندر گئے۔ شیروانی اُتاری۔ کھونٹی پر ٹانگنی چاہی تو کھونٹی ندارد۔ بیگم کو آواز دی۔ آواز سُن کر ایک اجنبی عورت دوڑی آئی۔ غیر مرد کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ شاہد احمد نے جھپٹ کر شیروانی سنبھالی اور باہر نکل آئے۔ اندر عورتیں چیخنے لگیں۔ شاہد احمد نے معذرت کی اور اپنا کوارٹر ڈھونڈنے لگے۔ یہ واقعہ وہ بڑے دل چسپ انداز سے خود سناتے تھے۔

مارٹن روڈ کے کوارٹر میں گزر بہت مشکل تھی۔ ناچار بہار کالونی میں مکان بنوانا شروع کیا۔ وہاں سیلن، بدبو، شہر سے دوری۔ سبھی آفتیں تھیں۔ ان دنوں پیر الٰہی بخش کالونی زیرِ تعمیر تھی۔ شاہد احمد نے یہاں دو مکان خرید لیے اور باقی ساری عمر یہیں گزاری۔ ان کے ایک مکان کا نمبر ۱۹۰۶ تھا۔ کبھی کبھی کہتے تھے میرے مکان کا نمبر اور میرا سالِ پیدائش دونوں ایک ہیں۔

کراچی میں اُنہیں ساقی کا ڈیکلریشن آسانی سے مل گیا۔ رسالے کا اجرا ہوا لیکن نہ وہ ساقی نہ وہ شاہد احمد۔ دونوں پژمُردہ ہو گئے تھے۔ مکان کے ایک بڑے کمرے میں شاہد احمد کی نشست رہتی تھی۔ ایک طرف بڑا سا تخت بچھا تھا۔ ایک مسہری کھڑکی سے لگی، بچھی تھی۔ یہی ساقی کے مدیر کا دفتر اور شاہد احمد کے مطالعے، لکھنے پڑھنے، اُٹھنے بیٹھنے، دوستوں سے ملاقات کرنے کا مرکز تھا۔ برابر میں ایک چھوٹی سی گول میز۔ لکھنے لکھانے میں استعمال ہوتی تھی۔ اس کے پاس ایک صوفہ۔ ایک کونے میں منشی انوار بیٹھے کاپی لکھتے رہتے تھے۔ ایک دفتر کھاری باؤلی میں بھی تھا۔ اُجلی دری چاندنی۔ دو ایک منشی کام میں مصروف۔ کتابوں کے بنڈل بندھ رہے ہیں۔ پرچہ لپیٹا جا رہا ہے۔ یار دوست جمع ہیں۔ کہاں یہ نوبت آ گئی کہ پروف بھی خود ہی پڑھو۔ کاپیاں اپنے سامنے جُڑواؤ۔ پرچہ آ جائے تو خود ہی لپیٹو اور خود ہی پتے لکھو۔ کراچی آ کر کتابوں کا کاروبار انہوں نے بالکل ہی بند کر دیا تھا۔ کہتے تھے ''اَب مجھ میں دم نہیں نہ میرے پاس سرمایہ ہے۔''

ہاتھی لاکھ لٹے گا پھر بھی سوا لاکھ کا رہے گا۔ شاہد احمد کا روزگار بگڑ گیا۔ حالات خراب ہو گئے۔ مگر ۱۹۰۶ پیر الٰہی بخش کالونی میں بڑے بڑے شاہد احمد سے ملنے آتے تھے۔ صبح سے شام اور شام سے رات تک آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ صبح سے رات تک آدھا پاؤنڈ چائے مہمانوں کی تواضع پر اُٹھ جاتی تھی۔

انہیں اکیلے پن کا بھی احساس تھا۔ میاں مشہود کراچی نہیں آئے تھے۔ انہوں نے راولپنڈی ریڈیو اسٹیشن پر اناؤنسر کے فرائض سنبھال لیے تھے۔ دوسرے بیٹے مسعود طالب علم تھے۔

دوست احباب تتر بتر ہو گئے۔ لاہور میں ایک حلقہ بن گیا تھا۔ بھائی ولی تھے۔ عسکری صاحب تھے مولانا صلاح الدین تھے سب سے بڑھ کر میاں ایم اسلم تھے۔ کراچی آئے تو ڈھاک کے تین پات۔ ایک خود دوسرے فضلِ حق قریشی جو مکان نہ ملنے کی مصیبت میں مبتلا تھے۔ تیسرے صادق الخیری جو ایک

غیر مُلکی کمپنی میں ملازم ہو گئے تھے۔ دونوں ادب سے بھی دور ہو گئے اور شاہد احمد سے بھی دور تر ہوتے گئے۔ کہاں تو چوبیس گھنٹے ساتھ ہیں کہاں یہ عالم کہ چھٹے چھماہے ملاقات ہو گئی تو ہو گئی۔ صادق الخیری نے بعد میں ایک اشتہاری کمپنی قائم کر لی تھی اور لکھنے لکھانے کی طرف بھی آ گئے تھے۔ فضلِ حق قریشی نے بھی آخری عمر میں چند مضامین لکھے۔ لیکن ساقی اور شاہد احمد دونوں ان کے لطف و کرم سے محروم ہو گئے۔ شاہد احمد کو اس کا دُکھ تھا اور چونکہ وہ صاف گو آدمی تھے لہٰذا ان لوگوں کی روش پر صاف صاف اور برملا ناپسندیدگی کا اظہار بھی کرتے تھے۔

چودہ اگست ۴۸ء کو کراچی میں بھی ریڈیو اسٹیشن قائم ہو گیا۔ کراچی ان دنوں چھوٹا سا شہر تھا۔ ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو اللہ میاں کے پچھواڑے اینٹے لی جنس اسکول میں — سمندر کے کنارے قائم ہوا۔ ایک لمبی بیرک میں اسٹیشن ڈائریکٹر کا کمرہ۔ اسٹوڈیو۔ سب کچھ تھا دفتر بھی خیمے میں اور دفتر والے بھی خیموں میں۔ ریڈیو اسٹیشن قائم ہونے کے کچھ عرصے بعد شاہد احمد جن کا شمار اُستادانِ موسیقی میں ہوتا تھا پانچ سو روپے ماہوار پر شعبۂ موسیقی میں میوزک سپروائزر مقرر ہو گئے۔ تقرر سالانہ معاہدے کی بنیاد پر ہوا — اللہ کی شان ہے۔ نہ ادب کام آیا نہ لکھنا لکھانا کام کیا آیا؟ موسیقی جو خاندان والوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ شاہد احمد کے لیے موسیقی کیا تھی کھوٹا پیسہ تھا جو آڑے وقت پر کام آ گیا۔

اُس زمانے میں پیر الٰہی بخش کالونی سے اینٹے لی جنس اسکول جانا مشکل کام تھا۔ ایمپریس مارکیٹ سے صرف ایک بس چلتی تھی شاہد احمد نے بس کے جھنجھٹ سے بچنے کے لیے سائیکل خرید لی۔ روزانہ صبح ایک بڑے سے ناشتے دان میں تین چار آدمیوں کا کھانا لیے پیر کالونی سے اینٹے لی جنس اسکول آنے لگے۔ شام کو سائیکل ہی پر واپس جاتے تھے۔ جب ریڈیو اسٹیشن بندر روڈ کی نئی عمارت میں منتقل ہو گیا تو اُنہیں سائیکل سے نجات ملی۔

خیموں والے ریڈیو اسٹیشن کے شعبۂ موسیقی کی کیفیت اسلم نے شاہد احمد کے خاکے میں بڑی تفصیل سے بیان کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''اسی ریڈیو اسٹیشن میں آخری خیمہ شاہد بھائی کا تھا۔ ایک طرف میز لگی تھی۔ دو چار کرسیاں بچھی تھیں۔ یہ میز قاری عباس حسین کی تحویل میں تھی اب وہ بھی مرحوم و مغفور ہو چکے ہیں۔ خدا بخشے بڑے زندہ دل اور سیر چشم بزرگ تھے۔ ہر کام وقت پر کرتے تھے۔ قاری صاحب تحریکِ آزادی کی زندہ تاریخ تھے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں مولانا محمد علی کے ہمدرد سے متعلق رہے تھے۔ بہت اچھا زمانہ دیکھ چکے تھے۔ لیکن داغِ فراقِ صحبتِ شب کے گلہ مند نہیں تھے۔ اس خیمے میں قاری صاحب ہی ایسے آدمی تھے جو نظم و ضبط برقرار رکھتے تھے۔ شاہد بھائی دن کے گیارہ بجے سائیکل پر سوار ایک بڑا سا ناشتے دان لیے آتے تھے۔ ان کے آتے ہی چہل پہل شروع ہو جاتی تھی۔ ہم لوگوں نے اس خیمے میں عجیب عجیب

قاعدے مقرر کر رکھے تھے۔ شعر پڑھنا اور گالی بکنا قطعاً ممنوع تھا۔ شعرا کو صرف ایک مصرع پڑھنے کی اجازت تھی۔ پورا شعر وہ بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ خلاف ورزی کرنے والے سب کے لیے چائے منگواتے تھے۔ لیکن یہ اصول بھی تھا کہ ایک آدمی دن بھر میں دو مرتبہ سے زیادہ چائے نہ منگوائے۔ شاہد بھائی آتے ہی جیب سے ایک روپیہ نکال کر قاری صاحب کی نذر کرتے اور کہہ دیتے کہ دو مرتبہ کا جُرمانہ ادا کر دیا ہے اب مجھ پر کسی قسم کی پابندی نہیں۔ جو جی میں آئے گا کہوں گا۔ بڑی دلنواز فضا تھی۔ شاہد بھائی کی وجہ سے ہر شخص یہاں کھنچا چلا آتا تھا۔ شمس زبیری۔ وجد چغتائی اور میں تو اس خیمے کے باسی ہی تھے۔ نصر اللہ خان صاحب۔ خالد لطیف اور خالد حسن قادری بھی ایک آدھ پھیرا ضرور کرتے تھے۔ منشی ضامن جعفری، منشی سلیمان، معین شاہ اور آصف علی تھوڑی دیر کے بعد آتے رہتے تھے۔ سُرور قدوائی کھانے کے وقت آتے اور شاہد بھائی کے بقول ''پھونک مار کر'' چلے جاتے۔ دوپہر کے کھانے پر اچھا خاصا مجمع ہو جاتا تھا۔ دو تین آدمیوں کا کھانا تو شاہد بھائی لاتے تھے۔ اور لوگ بھی خاصا کھانا منگوا لیتے تھے۔ قاری صاحب ضابطے کے پابند تھے۔ میں نے ان کے کھانے میں جو چیزیں پہلے دن دیکھیں وہی آخری دن بھی دیکھیں۔ ان کی وضعداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی کھانے کے مہتمم ہوتے تھے۔ دسترخوان بچھوانے سے چائے منگوانے تک سارا انتظام انہیں کا ہوتا تھا۔ شاہد بھائی بھی ان کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ احترام کا لفظ استعمال کرنا تو غلط ہوگا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ شاہد بھائی قاری صاحب کے سامنے سپر ڈال دیتے تھے اور عام طور پر انہیں اپنے فقروں سے محروم ہی رکھتے تھے۔ کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ یہ محفل کتنی جلدی درہم برہم ہوگئی۔ قاری صاحب رخصت ہو گئے۔ شاہد بھائی چلے گئے۔ ضامن جعفری اور سلیمان ختم ہو گئے۔ جو باقی بچے وہ بھی ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔''

یہ بیان بڑا دل چسپ اور واضح ہے۔

ریڈیو میں شاہد احمد کی اچھی نبھی۔ دلّی میں وہ ریڈیو اسٹیشن جاتے تھے تو افسران ان کے آگے پیچھے ہوتے تھے۔ کراچی میں یہ صورت تو نہیں تھی لیکن ان کا احترام اور وقار سب کے دلوں میں تھا۔ بخاری صاحب سے لے کر معمولی اہلکار بھی ان کا گرویدہ تھا۔ ریڈیو کے ادبی اور ڈراما سیکشن کے تمام پروڈیوسر اُن کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ اُس زمانے کے ریڈیو پروڈیوسر بھی اپنے اپنے فن میں طاق ہوتے تھے اور اپنے پروگراموں کو بہتر بنانے کے لیے جان لڑا دیتے تھے۔ شاہد احمد اس حلقے میں بھی اپنی ادبی قامت کی وجہ سے محترم سمجھے جاتے تھے۔ ادبی مسائل میں حکم بنائے جاتے تھے اور باوجودیکہ وہ ریڈیو پاکستان کراچی کے نگرانِ موسیقی تھے ان کی ادبی تقریریں اور فیچر بھی مسلسل نشر ہوتے رہتے تھے۔ مدتِ دراز تک اتوار کے اتوار اُن کی ایک تقریر صبح نشر ہوتی تھی۔ یہ تقریر اردو زبان کے بارے میں ہوتی تھی اور ریڈیو کے سامعین میں بڑی مقبول تھی۔ ان تقریروں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ شاہد احمد کی علمی

معلومات کتنی گہری ہیں اور اُنہیں زبان اور متعلقات زبان سے کیسی آگاہی ہے۔ پھر جب ریڈیو سے دانش کدے کا پروگرام شروع ہُوا تو شاہد احمد اس کے میرِ سوالات بنائے گئے۔

دانش کدہ پروگرام سامعین کے سوالات اور ماہرین کی زبانی ان کے جوابات پر مُشتمل ہوتا تھا۔ ہر پروگرام کسی مخصوص موضوع کے حوالے سے ہوتا جس کا اعلان پہلے سے کر دیا جاتا تھا۔ ریڈیو کے پروڈیوسر اس موضوع کے ماہرین کی جستجو کرتے۔ اکثر ماہرین کی فہرست شاہد احمد کے مشورے سے مرتب ہوتی۔ بعض عالم ایسے بھی تھے جو ریڈیو پر آنے اور سوال سُن کر فوری جواب دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ ایسے موقعوں پر افسران بالا شاہد احمد سے مدد کی درخواست کرتے۔ شاہد احمد کا نام ہی سُن کر بہت سے عالم پروگرام میں شرکت کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ بعض بزرگوں کے یہاں اُنہیں بہ نفس نفیس جانا پڑا اور اکثر بزرگوں نے ان کے آنے کا بھرم رکھا لیکن ایک دفعہ اُنہیں خفّت بھی اُٹھانی پڑی تھی۔ انہوں نے یہ واقعہ خود بیان کیا ہے۔

''ہُوا یہ کہ موضوع ادب اور فلسفہ تھا۔ کسی کو خیال آیا کہ اس پروگرام میں پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی کو بُلانا چاہیے۔ مرزا صاحب قاموسی علم کے حامل تھے۔ پطرس بخاری کے اُستاد تھے۔ پطرس بخاری جیسا زیرک انسان بھی ان کی شاگردی پر فخر کرتا تھا۔ مرزا صاحب کو پروگرام میں شرکت کی دعوت دی گئی تو انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ ریڈیو کے اربابِ حل وعقد نے شاہد احمد سے درخواست کی کہ آپ کسی طرح مرزا صاحب کو پروگرام میں لائیے۔ آپ ہی کے کہنے سے آسکتے ہیں۔ مرزا صاحب اُن دنوں انٹے لی جنبس اسکول میں ریڈیو کے قریب ہی مقیم تھے۔ شاہد احمد ان کے یہاں پہنچے۔ مرزا صاحب نے آؤ بھگت کی مگر ریڈیو پروگرام میں شرکت سے معذوری ظاہر کی اور کہا ''شاہد میاں ریڈیو پروگرام میں شرکت کے تین سبب ہو سکتے ہیں۔ اوّل شہرت۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے تھوڑی بہت شہرت ہے۔ لوگ جانتے ہیں۔ دوسرا سبب جلبِ منفعت۔ اُس کی ہوس نہیں۔ پینشن ملتی ہے۔ گزراوقات ہو جاتی ہے۔ تیسرا سبب۔ خلقِ خُدا کو فائدہ پہنچانا۔ وہ مقصود نہیں تو میں ریڈیو کیوں آؤں۔''

دانش کدے میں شرکت کرنے والے ماہرین کو سنبھالنا اور توازن قائم رکھنا خاصا مشکل کام تھا لیکن اُن کی پُروقار شخصیت اور اعتدال پسندی سے پروگرام میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ اُس زمانے میں پروگرام براہ راست نشر ہوتے تھے۔ ریکارڈنگ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس وجہ سے پروگراموں میں بڑی احتیاط برتی جاتی تھی۔

موسیقی کے شعبہ میں شاہد احمد کی بزرگ شخصیت نے موسیقاروں کو سیدھے سبھاؤ رہنے اور کام کرنے کا راستہ دکھایا۔ فن کار فن کار ہوتا ہے۔ اُسے اپنے فن پر ناز بھی ہوتا ہے اور اس میں انانیت بھی ہوتی ہے۔ زندگی بھر کے ریاض کے بعد وہ کسی مقام پر پہنچتا ہے اور متمنی ہوتا ہے کہ اُس کے مقام کا لحاظ رکھا جائے۔ نوجوان پروڈیوسر جو موسیقی اور موسیقاروں سے پوری تو کیا سطحی واقفیت بھی نہیں رکھتے تھے اپنی

نام نہاد افسری کے زعم میں اکثر موسیقاروں سے اُلجھ پڑتے تھے لیکن شاہد احمد معاملے کو بڑی خوبی سے رفع دفع کر دیتے تھے۔

شعبۂ موسیقی میں بہت بڑا عملہ تھا۔ سارنگی نواز، طبلچی، ستار نواز، وائلن نواز، مختلف ساز کار تھے۔ ان میں اُستاد بھی تھے اور جواں عُمر بھی۔ دُھنیں بنانے والے اور فن کاروں کے گانے کی نگرانی کرنے والے بھی تھے۔ آنے والوں میں اُستاد بندو خاں اور اُستاد حبیب علی خاں جیسے بزرگ بھی تھے اور امراؤ خان اور نہال عبداللہ جیسے جوان بھی تھے۔ شوقیہ گانے والوں کا بھی ایک سلسلہ تھا۔ مگر جو آتا پہلے شاہد احمد کو سلام کرتا۔ سلام دُعا کے بعد پروگراموں کی بات ہوتی تھی۔

شعبۂ موسیقی میں شاہد احمد کو تہری خدمت انجام دینی پڑتی تھی۔ اوّل تو یہ کہ وہ نامی گرامی فن کار تھے۔ مہینے میں دو چار دفعہ اُن کا گانے کا پروگرام ہوتا تھا۔ وہ بالعموم وقت کا راگ ہی گاتے تھے اور بڑے ٹھاٹ سے گاتے تھے۔ راگ کے بول میں وہ مروّجہ اور روایتی الفاظ کے بجائے فارسی اور اردو کے شعر گاتے تھے۔ یہ ان کا اپنا مخصوص انداز تھا۔ پڑھے لکھے سامعین اس انداز کو پسند کرتے تھے۔ روایت پرستوں کو یہ جدّت نہیں بھاتی تھی۔ شاہد احمد ہلکی پھلکی موسیقی کے قائل نہیں تھے۔ عموماً غزل نہیں گاتے تھے لیکن ریڈیو میں اُنہیں کبھی کبھی غزل بھی گانی پڑ جاتی تھی۔

دوسری خدمت یہ تھی کہ وہ کراچی اسٹیشن سے نشر ہونے والے موسیقی کے تمام پروگراموں کے نگراں تھے۔ دُھنیں ترتیب دینے والے گانے والوں کے لیے دُھنیں مرتب کرتے تھے لیکن آخری فیصلہ شاہد احمد کا ہوتا تھا۔ عام طور پر وہ دُھنیں بنانے والوں کے کام اور محنت کو رد نہیں کرتے تھے بلکہ تقریباتی پروگراموں میں انہیں ذمہ داری بھی سونپتے تھے۔ ان کی رہ نمائی بھی کرتے تھے۔ موسیقاروں اور سازندوں سے ان کا روّیہ بڑا مشفقانہ ہوتا تھا۔ یہ بات سب کے علم میں تھی کہ وہ موسیقاروں کو خاموشی سے قرض بھی دیتے رہتے تھے۔ اگرچہ ان کے مالی حالات اس کے متقاضی نہیں تھے لیکن کسی کے سوال کو رد کرنا یا انکار کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ موسیقاروں کو قرض دینے کی مد میں ان کا بہت سا روپیہ ڈوب گیا لیکن انھوں نے کبھی اس کا خیال نہیں کیا اور نہ کسی سے قرض کی واپسی کا تقاضا کیا۔

تیسری اور نہایت اہم خدمت موسیقی پر مبنی فیچر تھے۔ جو شاہد احمد کی شناخت تھے۔ شاہد احمد نے موسیقی سکھانے کا ایک پروگرام 'ریڈیو میوزک اسکول' بھی شروع کیا تھا۔ ریڈیو پاکستان میں شاہد احمد کی مصروفیت بہت زیادہ تھی۔ صبح سے شام تک کام کرتے تھے لیکن کبھی اُکتاتے نہیں تھے نہ بددل ہوتے تھے۔ سارے کام ہنسی خوشی کرتے رہتے تھے۔ ان کی وجہ سے شعبۂ موسیقی میں رونق، چہل پہل اور زندگی رہتی تھی۔

ادب کی طرح موسیقی میں بھی شاہد احمد نئے اور اُبھرتے ہوئے فن کاروں کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اُن کا دل بڑھاتے۔ رہ نمائی کرتے۔ ایک پارسی لڑکی دینا زمن والا شوقیہ گانے والوں کی محفل میں

شریک ہوئی۔ شاہد احمد نے اُسے سُنا تو پسند کیا۔ اُس کی رہ نمائی کی اور پھر اُسے اُستاد حامد حسین سارنگی نواز کا شاگرد کروادیا۔ دیناز نے گانے میں بڑی ترقّی کی۔ سارے کراچی میں شہرہ ہوگیا تھا لیکن وہ کراچی کی محفلوں کو سونا کر کے امریکہ چلی گئی۔

ایک اور لڑکی شوقیہ گانے والوں میں آئی تو شاہد احمد اُس کی آواز، سُر کی خوبصورتی اور ادائیگی سے بہت متاثر ہوئے۔ اس لڑکی کی آواز میں غیر معمولی چمک تھی اور اُسے موقعے کی مناسبت سے آواز کو دور تک پہنچانے کا سلیقہ تھا۔ شاہد احمد نے اس لڑکی کی بھی سرپرستی کی لیکن وہ اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے موسیقی کا شغل جاری نہ رکھ سکی۔ جب تک گاتی رہی محفل میں جادو جگاتی رہی۔

شعبۂ موسیقی میں شاہد احمد کے خاص رفیق قاری عباس حسین تھے۔ قاری صاحب اردو کے ایک مشہور ادیب قاری سرفراز حسین کے بڑے بیٹے اور دلّی کے مشہور صحافی اور سیاسی رہ نما تھے۔ حکیم اجمل خاں کے خاص آدمی سمجھے جاتے تھے۔ حکیم صاحب نے انہیں ہندوستانی دواخانے کا مینجر مقرر کیا تھا قاری صاحب نے صحافت مولانا محمد علی سے سیکھی تھی۔ بڑے نستعلیق بزرگ تھے۔ کراچی آ کے بے سہارا ہو گئے تھے۔ ریڈیو نے انہیں پناہ دی۔ پناہ ملی بھی تو شعبۂ موسیقی میں، وہ اپنی مستعدی اور ہر کام ایک خاص وقت پر کرنے کی عادت سے شاہد احمد اور تمام موسیقاروں کو پابند رکھتے تھے۔ شمس زبیری اور وجد چغتائی بھی شاہد احمد کے معاون تھے۔ اسلم کی ادبی تربیت میں شاہد احمد کا نمایاں ہاتھ ہے۔ شمس زبیری نے ساقی کی اشاعت میں شاہد احمد کا ہاتھ بٹایا۔ وجد چغتائی گانے کے شوقین تھے۔ یہ مثلث شاہد احمد کے دم کے ساتھ لگا رہتا تھا۔

اسلم کا بیان ہے کہ انہوں نے شاہد احمد سے لکھنے کے آداب سیکھے۔ غنائیے اور فیچر لکھنے کے انداز سیکھے اور اس طرح ان کے ادبی ذوق کی جلا ہوئی۔ اسلم آج بھی شاہد احمد کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات اور ان سے حاصل کی ہوئی معلومات بیان کرتے نہیں تھکتے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھے فخر ہے کہ میں برسوں شاہد احمد کے ساتھ رہا ہوں۔ شاہد احمد بھی ان کو بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔

میں نے اسلم کے بعض ریڈیائی فیچروں کے مسوّدے دیکھے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر ''دیدہ شدہ'' لکھا ہوا ہے اور شاہد احمد کے دستخط ہیں۔

یہ سب کچھ تو تھا مگر ''سب اچھا'' نہیں تھا۔ ریڈیو کے بعض افسرانِ بالا شاہد احمد کی مقبولیت احترام اور انانیت سے ناراض بھی رہتے تھے۔ لیکن شاہد احمد کسی بات کی فکر نہیں کرتے تھے اور نہ پریشان ہوتے تھے۔ اسلم کے بقول:

''ایک مرتبہ ریڈیو اسٹیشن پر کچھ ایسا انقلاب ہوا کہ شاہد بھائی تخفیف میں آ گئے۔ ساقی سے کوئی آمدنی تھی نہیں جو کچھ سہارا تھا وہ ریڈیو کی ملازمت ہی سے تھا۔ لگی بندھی ملازمت کا بیٹھے بٹھائے یکا یک ختم

ہو جانا انتہائی تکلیف دہ بات ہے مگر شاہد بھائی نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ ملازمت کے ختم ہونے کا وقت قریب آتا رہا اور وہ اسی طرح مطمئن رہے۔ نہ کسی سے کچھ کہنا نہ سننا نہ پیشانی پر بل۔ وہ جس طرح پہلے ہنستے تھے اسی طرح ہنستے رہے۔ ملازمت ختم ہوگئی ہم لوگوں کو بڑی تکلیف ہوئی لیکن کیا کر سکتے تھے۔ شاہد بھائی کچھ کرنے یا سننے کو تیار نہیں تھے۔ ہنستے ہوئے ریڈیو اسٹیشن سے رخصت ہو گئے۔ اتفاق سے دوسرے ہی دن ان کا گانے کا پروگرام تھا۔ صبح صبح ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی حسب معمول ہنس رہے تھے۔ پروگرام شروع ہوا۔ شاہد بھائی عموماً خیال کے روائتی بولوں کے بجائے فارسی اشعار گاتے تھے۔ چنانچہ ادھر اناؤنسر نے اعلان کیا کہ اب ایس۔ احمد سے صبح کا راگ سنئے، شاہد بھائی نے گانا شروع کیا۔

کار سازِ ما بہ فکر کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

لہجے میں شگفتگی یقین اور اعتماد میں ڈوبی ہوئی آواز۔ صبح کا سہانا وقت۔ سماں بندھ گیا۔ میں اسٹوڈیو میں جا کر بیٹھ گیا اور سنتا رہا۔ لیکن یہ واقعہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ انصاف اور دیانت کا تقاضا ہے کہ واقعہ پورا بیان کیا جائے۔ شاہد بھائی نے جیسے ہی گانا ختم کیا ویسے ہی بخاری صاحب کا ٹیلیفون آیا۔ بخاری صاحب ان دنوں ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل تھے۔ ان کا دستور تھا کہ صبح کا پورا پروگرام سنتے تھے اور پروگرام کے بارے میں برابر ٹیلیفون کرتے رہتے تھے۔ بخاری صاحب کہہ رہے تھے۔ شاہد بھائی سے کہو ذرا انتظار کر لیں۔ میں آرہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ گئے۔ شاہد بھائی سے باتیں ہوتی رہیں۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ بخاری صاحب نے کیا کوشش کی۔ مگر شاہد بھائی جلد ہی بحال ہو گئے اور ملازمت کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔''

شاہد احمد کے تخفیف میں آنے کا سبب ان کی انانیت تھی۔ وہ ریڈیو کے چھوٹے موٹے افسروں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ یہ لوگ ان سے جلتے رہتے تھے کیونکہ وہ ان لوگوں کو دیکھ کر نہ تو کھڑے ہوتے تھے نہ خیر مقدمی الفاظ کہتے تھے۔ بس آؤ بھگت یہ تھی کہ ''آیئے صاحب'' اور اپنی کُرسی پر بیٹھے رہتے۔ بخاری صاحب سے ان کا برابر کا ملنا جُلنا تھا۔ ان کے علاوہ وہ کسی اور سے نہیں ملتے تھے نہ کسی کے گھر جاتے تھے۔ آئے، کام کیا اور چلے گئے۔ خوشامد پسندوں کو یہ روش ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس وجہ سے تخفیف کا مسئلہ پیدا کیا گیا لیکن بخاری صاحب چونکہ جوہر شناس تھے اس وجہ سے یہ سازش کامیاب نہیں ہو سکی۔

اس جھٹکے کے علاوہ ریڈیو سے ان کی وابستگی مستقل اور خوش گوار رہی۔ ریڈیو میں رہ کر ساقی نکالتے رہے۔ شمس زبیری کے رسالے نقش پر بھی اُن کا نام آتا رہا۔ ایک بڑے کاروباری ادارے نے ایک اردو روزنامہ جاری کیا۔ مولانا رازق الخیری کے بھانجے شاہد الغفور نے اُنہیں اس اخبار میں گھسیٹا۔ شاہد احمد نے کچھ دن تک بادل نخواستہ اخبار میں کالم لکھا لیکن جلد ہی اخبار بند ہو گیا اور قصہ تمام ہو گیا۔

شاہد احمد انجمن ادبی رسائل کے سیکرٹری رہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے قیام میں حصّہ لیا اور اس کے عہدے دار رہے۔ سیٹو کے ممالک کا ثقافتی دورہ کیا اور وہاں پاکستانی ثقافت پر لیکچر دیے۔ (ان سب کی تفصیل آگے بیان ہوگی) ریڈیو پاکستان نے اُن کی ساری ہم نصابی سرگرمیوں کو خوشی خوشی گوارا کیا۔ لیکن جب وہ بیمار ہوئے اور بیماری کا سلسلہ دسمبر ۶۶ء سے آخر دم تک جاری رہا اور طول کھینچتا رہا تو ریڈیو نے ان کی زندگی کے آخری دو ماہ میں اُنہیں کوئی تنخواہ نہیں دی کیونکہ وہ معاہداتی ملازم تھے۔ مستقل نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں ممتاز افسانہ نگار حجاب امتیاز علی کو لکھا تھا کہ ''بے مروت محکمہ ہے۔ دو مہینے کی تنخواہ نہیں دی کیونکہ اسٹاف آرٹسٹ کو بیمار نہیں پڑنا چاہیے۔'' یہی شکایت انہوں نے اپنے ہمدمِ دیرینہ انصار ناصری سے بھی کی ہے جو ریڈیو میں بڑے افسر تھے۔ شاہد احمد کے اس لکھنے میں کتنا ذہنی اور روحانی کرب چُھپا ہوا ہے کہ اسٹاف آرٹسٹ کو بیمار نہیں پڑنا چاہیے۔ نجانے کتنے اسٹاف آرٹسٹ زندگی کے آخری دور میں کوئی مالی سہارا نہ ہونے کی وجہ سے بے کسی کی موت مر گئے۔

ریڈیو سے شاہد احمد کا تعلق کم و بیش اٹھارہ برس رہا۔ ان کی وجہ سے ریڈیو پاکستان کراچی کے شعبۂ موسیقی کا افتخار اور وقار بڑھا۔ نئے نئے پروگرام مرتب ہو کر نشر ہوئے۔ سامعین ان کے پروگراموں کے منتظر رہتے تھے۔ موسیقار اُنھیں ماہرِ فن سمجھتے اور راگوں راگنیوں کے حوالے سے ان کی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔

ریڈیو سے وابستگی کے دور میں کلاسیکی موسیقی کو مقبول بنانے اور فروغ دینے کے لیے انہوں نے ایک ادارہ پاکستان میوزک اکیڈمی کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس ادارے کو اُس عہد کے مرکزی وزیر خوراک پیرزادہ عبدالستار کی سرپرستی حاصل تھی۔ پاکستان میوزک اکیڈمی چھوٹا سا ادارہ تھا۔ بقول شخصے کُلھیا میں گڑ پھوڑنے والی بات تھی۔ مرینا ہوٹل میں موسیقی کے دو تین جلسے ہوئے اور بس۔ لوگوں نے کوئی توجّہ نہیں کی چنانچہ اکیڈمی ختم ہوگئی۔ ریڈیو میں شاہد احمد نے عصمت کے مدیر مولانا رازق الخیری کے ساتھ مل کر انجمن ادبی رسائل کا ڈول ڈالا۔ اس انجمن کے حوالے سے مولانا لکھتے ہیں۔:

''۱۹۵۲ء میں، میں لاہور گیا۔ کوئی مہینہ بھر کے قریب آغا شورش کاشمیری کا مہمان رہا۔ وہیں مجھے پرانے ادبی رسالوں کی زبوں حالی کا احساس ہوا۔ کراچی واپس آ کر میں نے مولوی شاہد احمد کو بلایا۔ دفتر ''عصمت'' میں پچیس کے قریب کراچی کے رسالوں کے مدیران جمع ہوئے۔ گو اخبارات کی انجمن کئی سال سے کام کر رہی تھی۔ مگر رسائل کے مسائل ان سے مختلف تھے۔ یہ میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ انجمن مقامی نہیں ہوگی اور اس کا پہلا جلسہ کراچی میں نہیں، ڈھاکا یا لاہور میں ہوگا۔ ان دنوں روزانہ نہیں تو دوسرے تیسرے دن مولوی شاہد احمد میرے دفتر بارہ بجے کے قریب آ جاتے مدیران کو خطوط لکھے جاتے۔ رُکن بننے کی ترغیب دی جاتی۔ سرکلر لپیٹے جاتے، پتے لکھے جاتے، خطوط کے جواب لکھے

جاتے۔ انجمن کا سارا کام ہم دونوں ہی انجام دیتے۔ کئی مہینے یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ اگست ۱۹۵۲ء میں انجمن کا پہلا اجلاس لاہور میں ہوا جس میں کراچی اور سندھ کے ایک درجن مدیرانِ رسائل شریک ہوئے۔ جس کا افتتاح اس وقت کے پنجاب کے وزیراعلیٰ سر فیروز خاں نون نے کیا۔ دوسرا اور تیسرا اجلاس کراچی میں ہوا۔ سالانہ اجلاس دو تین سال بعد ہوتا تھا۔ چوتھا اجلاس پھر لاہور میں ہوا۔ پانچواں اجلاس ڈھاکا میں ۱۹۶۵ء میں ہوا۔ چھٹا اجلاس پھر ڈھاکا میں ۱۹۶۷ء میں کیے جانے کی کوشش ہو رہی تھی کہ مولوی شاہد احمد..... نائب صدرِ انجمن، ہم سے رخصت ہو گئے۔ اس انجمن کی کوششوں سے ادبی رسالوں کے خاص نمبروں تک کو ضرورت کے مطابق کاغذ ملنے لگا۔ اشتہارات کے لیے حکومت کو دو ہزار کی شرط اُڑانی پڑی اور رسالوں کو کشادہ دلی سے اشتہارات ملنے لگے۔ پھر اشتہارات کے بلز کی ادائیگی میں سہولتیں پیدا کر دی گئیں۔''

اگرچہ یہ انجمن بھی ہر اچھی انجمن کی طرح ختم ہو گئی لیکن اس نے بڑی اہم خدمت انجام دی۔ ادبی رسائل کو ایک مرکز پر جمع کیا۔ ہر مکتب خیال کے رسائل اس میں شامل ہوئے۔ ادیبوں اور شاعروں کی اکثریت نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس کی وجہ سے ادبی رسائل کی حیثیت اور اہمیت مستحکم ہوئی۔ حکومت نے بھی اس انجمن کی کارروائی کا لحاظ کیا۔ رسائل کو سرکاری اشتہارات کے سلسلے میں عائد کی جانے والی پابندیوں سے مستثنیٰ کیا گیا۔ لاہور میں انجمن کا پہلا قومی اجلاس بڑی دھوم دھام سے ہُوا تھا۔ کراچی سے ایک بڑا وفد شرکت کے لیے لاہور گیا تھا۔ دوسرے شہروں کے مندوبین بھی شریک ہوئے تھے۔ اُس عہد کے پنجاب کے وزیراعلیٰ فیروز خاں نون مہمان خصوصی تھے۔ انہوں نے انجمن کو پانچ ہزار روپے کا عطیہ بھی دیا تھا۔ کراچی اور دوبارہ لاہور میں بھی انجمن کے اجلاس ہوئے۔ ڈھاکے میں اجلاس کی تیاریاں تھیں لیکن وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔

انجمن ادبی رسائل کے حوالے سے مولانا رازق الخیری اور شاہد احمد کی کوششوں کو سراہا گیا۔ یہ دوررس نتائج کی حامل ثابت ہوئی۔ ایک مدت تک اس کا غلغلہ رہا۔ شاہد احمد کے کارناموں میں اس انجمن کا قیام اور اس کی ترقی بھی شامل ہے۔

ریڈیو کی ملازمت جاری تھی کہ ملک انقلاب سے دوچار ہوا۔ پاکستانی افواج کے سپہ سالار جنرل محمد ایوب خاں نے مارشل لا نافذ کر کے صدارتی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ بظاہر اس واقعے سے شاہد احمد کا کوئی ذاتی تعلق نہیں تھا تاہم آگے چل کر انہوں نے اردو کے دوسرے اخباروں اور رسالوں کی طرح ساقی میں بھی ایوب خاں کی بنیادی جمہوریت پر مثبت انداز میں اظہار خیال کیا تھا۔

ادب اور ادیبوں کے نقطہ نظر سے مارشل لا حکومت کا اہم کارنامہ پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام تھا۔ چار دسمبر ۱۹۵۸ء کو کراچی کے آٹھ ادیبوں کی جانب سے ایک اعلان جاری ہوا جس میں ادیبوں کے

ایک کنونشن کے منعقد کرنے کا اعلان تھا۔ اس اعلان کے بعد ''راہرو آتے رہے اور کارواں بنتا رہا۔'' شاہد احمد کنونشن کی مجلسِ عمل کے صدر منتخب ہوئے۔ تیس۔ اکتیس جنوری ۱۹۵۹ء کو کراچی میں یہ کنونشن منعقد ہوا۔ شاہد احمد دہلوی نے کنونشن میں خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ کنونشن میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے بیشتر ادیب اور شاعر یکجا ہوئے۔ بڑے زبردست جلسے ہوئے۔ صدر ایوب نے بھی جلسے میں شرکت کی۔ پاکستان رائٹرز گلڈ (ادارہ مصنفین) کا قیام عمل میں آیا۔

کنونشن کے انعقاد میں شاہد احمد نے بڑی محنت سے کام کیا۔ کنونشن کے لیے اردو اور بنگلہ میں جو دعوت نامہ جاری کیا گیا تھا وہ مجلس عمل کے صدر کی حیثیت سے شاہد احمد کے نام سے جاری ہوا تھا۔ اُن کے اس خطبے کے چند اقتباسات یہاں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان سے اندازہ ہو سکے گا کہ شاہد احمد کو ادب اور ادیبوں کے مسائل سے کتنی گہری دل چسپی تھی اور وہ بے خوف و خطر نتائج سے بے پروا کھری بات ڈنکے کی چوٹ پر کہنے کے قائل تھے۔

''چودہ دسمبر ۱۹۵۸ء کو کراچی کے آٹھ ادیبوں نے ایک اعلان نامہ جاری کیا جس میں اس کنونشن کی تجویز پیش کی۔ یہ ادیب کسی ایک مجلس کے رکن نہیں تھے بلکہ کسی ایک شہر کے رہنے والے بھی نہیں تھے۔ اس اعلان نامے کے بعد انہوں نے اپنے حلقۂ عمل کو وسیع کیا اور مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی۔ میری دلی آرزو بھی یہی تھی۔ اس لیے باوجود خرابی صحت کے میں ان کے ساتھ ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ہر مکتب فکر کے کارکن بلائے اور یہ سب ان کی نیک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہم سب ایک جگہ جمع ہیں۔''

''قیامِ پاکستان کو ساڑھے گیارہ سال ہوئے۔ قومی زندگی کے ہر شعبے کی طرح ادب اور ادیبوں میں بھی افراتفری کا دور رہا۔ سیاست دانوں اور اہل اقتدار نے اوّل تو ہماری طرف اور ہماری گزارشات کی طرف کبھی توجہ نہیں کی اور اگر کی بھی تو یہ کی کہ کچھ ادیبوں پر الزام لگا کر اُنہیں قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر دیا جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کو فیشن کے طور پر اختیار کرنے والے چند افسروں کے ہاتھ میں پورے ملک کی ادبی تحریکوں اور ثقافتی اداروں کی اجارہ داری آ گئی۔ سرپرستی کی تو یہ کہ چند شعرا اور ادبا کو ذاتی وظیفوں سے نواز دیا۔ ہمیں ان وظائف اور ان افسروں کی بالادستی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پچھلی حکومتوں نے اتنا بھی کیا تو بہت کیا مگر ہم اپنی شکایات میں حق بجانب ہیں کہ انہوں نے اتنے بڑے ملک کے اس سرمائے کو جسے ادب کہتے ہیں ترقی دینے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ شاید وہ ادیبوں کو بدقماش، بیکار اور تماش بینوں کی ایک تفریحی جماعت اور کبھی کبھار ریڈیو پر مشاعرہ اور ایک آدھ تقریر کروا دینا یا ملک کے ایک آدھ سرکاری رسالے کے اجرا کو پورے ملک کے تہذیبی اور ثقافتی مطالبات کا جواز سمجھتے رہے۔ انہوں نے مصوری۔ رقص اور موسیقی پر تو کبھی کبھار توجہ دی بھی کیونکہ ایسی نمائشوں اور محفلوں میں اُنہیں کچھ مزا بھی آ جاتا تھا اور ان کی ذہنی پسماندگی کا پول بھی نہیں کھلتا تھا مگر ادب اور ادیب

کی بنیادی حیثیت سے وہ کبھی آگاہ نہیں ہو سکے۔ اس غلط اندیشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو تازگی اور جوشِ عمل ہمارے ادیبوں میں ۱۹۴۷ء میں تھا وہ ۱۹۴۸ء تک یکسر معدوم ہو گیا۔''

کیسی کھری کھری اور کڑوی باتیں ہیں۔ آزادانہ اور حقیقت پسندانہ تجزیہ ہے۔ ایسی کھری کھری باتیں شاہد احمد ہی کر سکتے تھے۔

گلڈ کے قیام کے بعد وہ اس کی مرکزی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ بعد ازاں کراچی ریجن کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ انتخاب میں گلڈ کے مقامی اراکین نے حصہ لیا تھا۔ عام رائے شماری ہوئی تھی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ انتخاب میں حصہ لینے کے باوجود شاہد احمد نے کسی بھی رکن سے اپنے لیے ووٹ کی درخواست نہیں کی۔ سب نے اُنہیں خوشی خوشی ووٹ دیے۔

گلڈ میں شاہد احمد کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر وقار عظیم نے بڑے پتے کی بات کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔ ''شاہد احمد نے گلڈ کی سرگرمیوں میں بغیر معاوضے کے اُسی انہماک سے حصّہ لیا جیسے ساقی کے کام میں۔'' یہ شاہد احمد کے خلوص، محنت، فروغ ادب اور ادیبوں کی بہبود کی کوششوں پر بہترین تبصرہ ہے۔ گلڈ کے کارناموں کا جائزہ یہاں مقصود نہیں۔ صرف یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ادارے نے پاکستان کے لکھنے والوں کو حوصلہ بخشا اور اُن کی خدمت کی۔

۱۹۵۹ء میں شاہد احمد کو سیٹو کی جانب سے تھائی لینڈ اور فلپائن میں پاکستانی موسیقی پر لیکچر دینے کی دعوت ملی۔ انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی اور تھائی لینڈ اور فلپائن میں پاکستانی موسیقی اور ثقافت کے حوالے سے بڑے معلومات افزا اور دلکش لیکچر دیے۔ موسیقی کے حوالے سے انہوں نے عملی مظاہرہ بھی کیا جسے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ اس سفر میں وہ ہانگ کانگ اور جاپان بھی گئے۔ اُنہیں جاپان جانے کا شوق تھا۔ اُن کے ایک عزیز پروفیسر نورالحسن برلاس جاپان کی کسی یونیورسٹی میں اردو کے اُستاد تھے۔ وہ ساقی میں جاپان کے بارے میں مضامین لکھتے رہتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ساقی کا ایک جاپان نمبر بھی شائع ہوا تھا۔ اس حوالے سے شاہد احمد جاپان کا دورہ کرنا چاہتے تھے چنانچہ اب جو اُنہیں موقعہ ملا تو اُن کی یہ دیرینہ خواہش بھی پوری ہو گئی۔

موسیقی اور ثقافت کے حوالے سے وہ پاکستانی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے دلّی بھی گئے۔ ڈھاکا میں 'یومِ خسرو' منایا گیا تو انہوں نے اس تقریب میں خسرو پر لیکچر بھی دیا اور موسیقی میں ان کی اختراعات کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ مختلف شہروں سے بلاوے آتے رہتے تھے اور وہ بالعموم وہاں منعقد ہونے والے موسیقی کے جلسوں اور ادیبوں کی کانفرنسوں میں شرکت کرتے رہتے تھے۔

ڈھاکے میں اردو کے ادیبوں نے اُن سے گلہ کیا کہ مغربی پاکستان کے ادیب اور ادبی رسالے ہمیں غیر سمجھتے ہیں۔ ہمارے بارے میں ان کی معلومات سطحی، سرسری اور ادھوری ہیں۔ ہم کیا لکھ رہے ہیں

ہمارے کیا مسائل ہیں ان پر مغربی پاکستان میں کوئی غور نہیں ہوتا اور ہمارے معدودے چند ادیبوں کے سوا بیشتر کی تخلیقات کو مغربی پاکستان کے رسالوں میں کوئی جگہ نہیں ملتی۔ شاہد احمد کو اس گلے میں حقیقت کی جھلک محسوس ہوئی۔ انھوں نے ایک مدیر اور ادیب گر ادیب کی حیثیت سے ان لوگوں کے ذہنی اور روحانی کرب کو محسوس کیا اور ان لوگوں سے وعدہ کیا کہ وہ ان کے اشتراک اور تعاون سے ساقی کا مشرقی پاکستان نمبر شائع کریں گے۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں نے ان سے تعاون کیا اور ۱۹۶۳ء میں ساقی کا مشرقی پاکستان نمبر شائع ہوا۔ یہ نمبر مشرقی پاکستان اور اس کے ادیبوں کے بارے میں پہلی یادگار ادبی دستاویز ہے۔

۱۹۶۳ء میں شاہد احمد کو صدرِ پاکستان کی جانب سے 'افتخارِ ادب' کا اعزاز عطا کیا گیا۔ یہ اُن کی ادبی خدمات کا بجا اعتراف تھا۔ خاندانی وضع داری کی بات یہ تھی کہ جب شاہد احمد کو تمغہ ملا تو ان کی سوتیلی والدہ کراچی میں تھیں۔ وہ تمغہ اور مٹھائی لے کر ماں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تمغہ اُنہیں دکھایا اور اُن سے دعائیں لیں۔

علالت اور انتقال

زندگی اپنے ڈھرّے پر آہستہ آہستہ رواں تھی۔ دورے بھی ہو رہے تھے۔ جلسے بھی ہو رہے تھے۔ اعزاز بھی ملے لیکن شاہد احمد ذہنی اور روحانی شکست و ریخت سے بھی دوچار تھے۔ ٹوٹ پھوٹ تو اُسی دن شروع ہوگئی تھی جس دن انہوں نے دلّی چھوڑی تھی لیکن آدمی تھے حوصلہ مند۔ شکست و ریخت کو برداشت کرتے رہے۔ ان کے ایک بیٹے مسعود باہر چلے گئے۔ انہوں نے بیٹے کے باہر چلے جانے پر کسی کے سامنے رنج کا اظہار نہیں کیا۔ غم کو اندر ہی اندر برداشت کیا۔ پھر سب سے چھوٹا بیٹا محمود بھی باہر چلا گیا۔ محمود کے جانے کا دہاکا اُن کے لیے بہت سخت تھا کیونکہ وہ محمود کو بہت چاہتے تھے لیکن اس کے جانے پر بھی چُپ رہے۔ مُنہ سے کچھ نہیں کہا۔ چہیتی بیٹی ارجمند بھی امریکہ چلی گئیں۔ گھر میں سناٹا ہو گیا وہ پھر بھی چُپ رہے اور اندر ہی اندر گھلتے رہے۔

تکلیفیں تو بہت تھیں لیکن ۶۵ء میں شاہد احمد کو اپنی دائیں ٹانگ میں غیر معمولی تکلیف محسوس ہوئی ذرا سا چلتے تھے ٹانگ تھک جاتی تھی۔ چلنے میں بڑی اذیت ہوتی تھی۔ پہلے تو مالش والش ہوئی۔ پھر ڈاکٹروں کو دکھایا۔ مختلف ماہروں نے دیکھا۔ ایکسرے ہوئے۔ طرح طرح کے ٹسٹ ہوئے۔ وہ اذیت ناک ٹسٹ جسے ڈائی ڈالنا کہتے ہیں، ہوا۔ شاہد احمد کو بڑی سخت اذیت ہوئی۔ تشخیص یہ ہوئی کہ ٹانگ کی رگ گھٹنے کے نیچے سے موٹی ہوتی جا رہی ہے۔ پنڈلی کو پورا خون نہیں مل رہا ہے۔ اس کا علاج صرف آپریشن ہے۔ آپریشن نہ

ہوا تو رگ بند ہو جائے گی اور پیر گل جائے گا۔ آپریشن انگلستان یا جرمنی میں ہو سکتا ہے۔

یہ کوئی معمولی آپریشن نہیں تھا۔ بڑا اور ہولناک آپریشن تھا۔ شمس زبیری اور اسلم کے گہرے دوست ڈاکٹر دلاور عباس نے بڑا سہارا دیا۔ کہا: ''آپریشن میں کروں گا'' ڈاکٹر دلاور عباس اور ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر یاور عباس کا تعلق دہلی سے تھا۔ دلّی کے رشتے اور شمس زبیری اور اسلم کے تعلق سے شاہد احمد کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ دونوں بھائی کراچی کے ادبی حلقوں کی معروف شخصیت تھے۔ بالخصوص یاور عباس کا شمار کراچی کے محترم شعرا میں ہوتا تھا۔ دلاور عباس نے ایف۔ آر۔ سی۔ ایس۔ کیا تھا۔ اچھے سرجن تھے اور دلیر آدمی تھے۔ طے ہوا کہ آپریشن اُن کے سعید منزل والے مطب میں ہوگا۔ دلاور عباس نے سارا انتظام کیا۔ آپریشن کی رات ہر مریض کے لیے پریشان کُن ہوتی ہے مگر شاہد احمد مطمئن تھے۔ بعد کی روداد اسلم کی زبانی سنئے۔

''صبح کو ان کا آپریشن ہونے والا تھا۔ رات کو ہم سب لوگ ان کے یہاں جمع ہوئے۔ ہمیں یہ احساس تھا کہ آپریشن بہت خطرناک اور تکلیف دہ ہے۔ اس لیے ہم لوگ یہ چاہتے تھے کہ شاہد بھائی اس کے بارے میں پہلے سے سوچنا نہ شروع کریں اور بہلے رہیں لیکن بجائے اس کے کہ ہم اُنہیں بہلاتے وہ اپنی دل چسپ اور حوصلہ افزا باتوں سے ہمیں کو بہلاتے رہے۔ اُنہیں نہ تو کسی قسم کی پریشانی تھی نہ طبیعت میں یہ کُرید تھی کہ کل کیا ہوگا۔ کیا صورت پیش آئے گی۔ یہ احساس ہی نہیں تھا کہ کل کوئی آپریشن ہونے والا ہے۔ جس وقت ہم لوگ رُخصت ہوئے تو ہمارا تاثر یہ تھا کہ اس عالم میں بھی شگفتگی اور خندہ جبینی کو قائم رکھنا شاہد بھائی ہی کا کام ہے۔''

آپریشن صبح دس بجے شروع ہوا اور دوپہر کے بعد ختم ہوا۔ شمس زبیری اسلم اور ڈاکٹر جمیل جالبی آپریشن کے دوران پورے وقت موجود رہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے آپریشن سے پہلے اور آپریشن کے بعد شاہد احمد کی بڑی خدمت کی۔ ڈاکٹر دلاور عباس نے بڑی محنت سے آپریشن کیا اور کسی قسم کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کیا۔ پرانے زمانے میں محبت کرنے والے ایسے ہی ہوتے تھے۔

آپریشن کامیاب رہا۔ شاہد احمد بخیریت گھر واپس آ گئے۔ کچھ دن پیر کی مالش ہوتی رہی۔ آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ لکڑی کے سہارے چلنے لگے۔ ریڈیو اسٹیشن آنے جانے لگے مگر صحت برباد ہو گئی تھی۔ غضب یہ ہوا کہ جوان جہان بیاہی تیاہی بیٹی مسعودہ جو منّی کہلاتی تھیں ایک سخت بیماری کے باعث دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

پیر کی تکلیف میں افاقہ ہو گیا تھا لیکن کام تمام کرنے والی بیماریٔ دل نے اُن کا پیچھا لے لیا۔ فروری ۶۷ء میں ایک حملہ ہوا۔ علاج معالجے سے بہتر ہو گئے لیکن احتیاط، پرہیز، لکھنے پڑھنے پر پابندی نے زندگی دوبھر کر دی۔ ستائیس مئی کا دن انہوں نے عام دنوں کی طرح گزارا۔ رات کو میل ڈیڑھ میل

پیدل ٹہلے۔ گھر آئے بیٹی فرزانہ کے ساتھ کھانا کھایا۔ یہ اُن کا آخری کھانا تھا۔ سونے کے لیے لیٹے تو کھانسی کی دھسک اُٹھی۔ خود اُٹھے۔ دوا پی لی۔ دوبارہ کھانسی اُٹھی۔ سانس میں خرخراہٹ پیدا ہوئی۔ یہ آخری سانس تھا۔ اس کے ساتھ ہی شاہد احمد اللہ کو پیارے ہو گئے۔

دنیا کا دستور ہے کہ جیتے جی چاہے نہ پوچھیں لیکن مرنے کے بعد بڑا چرچا ہوتا ہے تاہم شاہد احمد زندگی میں بھی پوچھے گئے۔ مرنے کے بعد بھی لوگوں نے اُنہیں دل میں جگہ دی۔ اُن کے جنازے میں بڑا مجمع تھا۔ کراچی کے عمائد، ادیب، شاعر، صحافی، موسیقار اور دوست احباب سبھی شامل تھے۔ سرشاہ سلیمان روڈ کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ قبر ایک اونچی جگہ پر ہے اور کتبہ لگا ہوا ہے۔ قبر کے گرد اگرو سیمنٹ کی جالیوں کا کٹہرا بھی ہے۔

انتقال کے فوراً بعد یعنی اکتیس مئی کو کراچی کے ادیبوں اور شاعروں نے شاہد احمد کو تعزیت کے ایک بڑے تعزیتی جلسے میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جلسے کا آغاز میرے آٹھ سالہ بیٹے آصف فرخی کے مضمون سے ہوا۔ صدارت جوش ملیح آبادی کی تھی۔ بے شمار ادیبوں اور شاعروں نے شاہد احمد کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ اس بات پر سب کا اتفاق تھا کہ شاہد احمد دلّی کی قدیم وضع داری کا آخری نمونہ تھے۔ وہ اپنی تحریروں سے دلّی کی زبان، رسم و رواج، طور طریقوں، سیر تماشوں، میلوں ٹھیلوں، زبان کے چٹخاروں اور دلّی کے متعدد اہلِ ادب کو حیاتِ جاوید عطا کر گئے۔

کراچی اور بیرونِ کراچی کی مختلف ادبی انجمنوں اور اداروں نے اُنہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ریڈیو پاکستان کراچی نے ایک خصوصی تعزیتی پروگرام نشر کیا۔ اس پروگرام میں بزرگ ادیب مولانا رازق الخیری نے شاہد احمد کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

''شاہد احمد اردو کے مایہ ناز ادیب اور پاکستان بھر میں علمِ موسیقی کے سب سے بڑے عالم تھے۔ ان کے ارد گرد دلّی اور کراچی میں لکھنے والوں یا موسیقی سے دل چسپی رکھنے والوں کا جمگھٹا رات گئے تک رہتا تھا۔ متعدد مصنفین کی شہرت میں شاہد احمد کا ہاتھ تھا۔ ان کا طرز بیان دلاویز تھا۔ وہ دلّی کی ٹکسالی زبان لکھتے تھے۔ اُن کی پہلی شادی سولہ سترہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ پہلی بیوی طویل علالت کے بعد گزر گئیں تو بیوی کی موت کُہنی کی چوٹ نہ نکلی بلکہ اس صدمے نے ان کی جان پر بنادی۔ اس لحاظ سے وہ بڑے خوش نصیب تھے کہ ان کی دوسری بیوی نہایت نیک اور شریف نکلیں۔ شوہر کے بچوں کو اپنے پیٹ کی اولاد سمجھا اور ایک طرف شفیق ماں ثابت ہوئیں تو دوسری طرف خدمت گزار اور غم گسار رفیقۂ حیات''

انصار ناصری نے جو شاہد احمد کے ہمدمِ دیرینہ تھے کہا:

''انہوں نے اگلی پچھلی صحبتیں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ قدیم اور جدید ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اپنے لیے انہیں کی آمیزش سے ایک مخصوص طرزِ انشا اختراع کی تھی جو خود اُنہیں کے ساتھ ختم ہو گئی۔''

فضلِ حق قریشی بھی انصار ناصری کی طرح شاہد احمد کے بہت قریب تھے۔ انہوں نے اپنے تاثرات یوں بیان کیے۔

''جس نے چالیس برس تک کہیں ملازمت نہ کی ہو اُسے مجبوراً ملازمت کرنی پڑ گئی۔ جس نے مظاہرۂ موسیقی کر کے کبھی معاوضہ نہ لیا ہو اُسے گانا سکھانے کا کنٹریکٹ کرنا پڑ گیا۔ یہ بُری بات نہیں تھی لیکن حساس طبیعت کو گوارا نہیں تھا..... کون کہتا ہے کہ شاہد مر گئے۔ وہ محض جسم کی حد تک فنا ہوئے ہیں۔ روحانی اعتبار سے ساقی کے لیے زندہ ہیں اور ساقی اُنہیں زندہ رکھے گا اور بقولِ حافظ۔ جہانِ فانی و باقی ہمیشہ شاہد و ساقی پر فدا ہوتے رہیں گے۔''

اسلم کا تاثر یہ تھا۔

''دادا نے اردو نثر کو وہ انداز دیا تھا جس سے ناول اور افسانے کی زبان کو فروغ پانے کے امکانات بہت واضح ہو گئے تھے۔ پوتے نے اس ادبی ورثے اور روایت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اردو افسانے کو ترقی کے نئے راستے پر گامزن کر دیا۔

شاہد صاحب اُجڑی ہوئی دلّی کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے دلّی کے حسن، رعنائی بانکپن اور وضع داری کو اپنی تحریروں میں جذب کر لیا۔ اُن کی پُر وقار شخصیت میں بھی یہی حُسن، رعنائی، بانکپن اور وضع داری نمایاں تھی۔ اب ایسی وضع داری کہاں۔''

شخصیت

شاہد احمد کا چہرا کتابی۔ ناک قدرے پھیلی ہوئی اور اونچی۔ ہونٹ پتلے۔ ہنستی آنکھیں۔ پیشانی فراخ۔ ڈاڑھی مونچھ صاف۔ سر پر جناح کیپ۔ ایک زمانے میں تُرکی ٹوپی اوڑھتے تھے۔ تحریکِ پاکستان کے دور سے جناح کیپ اختیار کی۔ آنکھوں پر عینک، گہرا سانولا رنگ، چہرے مہرے سے بڑا پن اور وقار آشکار، ان کے چہرے میں کشش بھی تھی اور وضع قطع سے انفرادیت کا اظہار بھی ہوتا تھا۔ ہمیشہ شیروانی پہنتے۔ غالباً کوٹ پتلون اُنہوں نے کبھی پہنا ہی نہیں۔ علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ جس کے پائچوں میں جالی بنی ہوتی تھی۔ یہ بھی ان کی انفرادیت کا نشان تھا۔ شیروانی کے نیچے گول گلے کی قمیص، گرمیوں میں ململ کا سفید کُرتا سونے کے بٹن لگے ہوتے۔ دلّی میں اعلیٰ درجے کی فِٹ شیروانی پہنتے تھے۔ کراچی آ گئے تو لباس میں کوئی اہتمام نہیں رہا۔ معمولی، ڈھیلی ڈھالی شیروانی سے کام چلانے لگے۔ گھر میں بیٹھے ہیں تو بالعموم تہہ بند بندھا ہے۔ ملنے جُلنے والے آتے رہتے تھے مگر وہ اسی لباس میں مگن بیٹھے رہتے۔ ان کے دادا مولوی نذیر احمد بھی گھر میں تہہ بند باندھے بیٹھے رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی سراج الدین احمد اور مُسلم احمد بھی اسی شعار کے پابند تھے۔ جوانی میں بدن چھریرا تھا۔ بُڑھاپے میں جسم قدرے بھاری ہوگیا تھا۔ جامہ زیب تھے۔ جب اچھی سِلی ہوئی فِٹ شیروانی پہنتے تھے تو بہت جچتے تھے لیکن کراچی میں اس جچاؤ کے موقعے بہت کم آئے۔

باہر نکلتے تو عموماً شیروانی اور ٹوپی کا اہتمام ہوتا۔ ننگے سر کہیں نہیں جاتے تھے۔ اکیلے جانا بھی اُنہیں پسند نہیں تھا۔ کوئی ساتھ ہوتا تو اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلتے۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے۔ ان کی چال میں نرم روی تھی۔

کراچی کے گھر میں وہ بالعموم اپنے کمرے میں مسہری پر پیر لٹکائے بیٹھے رہتے تھے۔ سامنے ایک چھوٹی سی میز تھی۔ جس پر قلم دوات رکھی رہتی تھی۔ بہت معمولی قلم سے لکھتے تھے اور مختلف اداروں سے آنے والے پریس نوٹوں کی پشت پر لکھتے تھے۔ ریڈیو کے بے شمار فیچر اور تقریریں انہوں نے انہیں کاغذوں پر لکھیں۔ دلّی میں لکھنے اور کاغذ دونوں کا بڑا اہتمام تھا۔ کراچی آ کر طبیعت میں کچھ بے پروائی آ گئی تھی۔ سارا اہتمام ختم ہوگیا تھا۔ اندازِ تحریر میں انفرادیت اور جاذبیت تھی۔ لکھ کر کاٹتے نہیں تھے۔

خراب کاغذ کی وجہ سے تحریر کی خوشنمائی برائے نام رہ جاتی تھی۔

کراچی آ کر کھانے میں بھی کوئی نخرا نہیں رہا تھا۔ نخرا تو دلّی میں تھا۔ وہاں کھاری باؤلی میں مشترک کھانا مردانے میں پکتا تھا۔ باورچی کھانا پکاتا۔ کوئی ماما دسترخوان پر کھانا چُن دیتی تھی۔ شاہد احمد کی سوتیلی والدہ کا اہتمام ہوتا تھا اعظم خاں کی حویلی میں یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ شوکت تھانوی اور نسیم انہونوی دلّی میں پہلی مرتبہ اُن سے ملنے آئے۔ اس ملاقات کی داستان شاہد احمد ہی کی زبانی سنیے:

''جاڑوں کے دن تھے۔ میں نے ان حضرات سے کہا کہ آپ کل صبح ہمارے ساتھ نہاری کھایئے۔ یہ دِلّی کی ایک خاص چیز ہے اور دلّی والے ہی اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ مگر اس کے کھانے کا لُطف علی الصباح کا ہے۔ اس لیے آپ حضرات چھ بجے آ جایئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے ماموں چشتی صاحب سے کہا کہ کل صبح کے لیے نہاری کا انتظام کر دیجئے۔ مَیں خود چونکہ رات کو دیر سے سوتا ہُوں اس لیے صبح دیر سے اُٹھتا ہُوں۔ اُس دن الارم لگا کر اُٹھا۔ چشتی صاحب نہاری کا دیگچہ اور دُوسرے لوازم لیے ہُوئے چھ بجے سے پہلے پہنچ گئے۔ انگیٹھی دہکائی گئی۔ اس پر گھی کڑکڑایا گیا۔ نہاری پر سے تار اُتار کر الگ کر دیا گیا اور جب گھی میں پیاز سُرخ ہوگئی تو پیاز ایک الگ پیالے میں نکال لی اور گھی سے نہاری کو داغ دیا۔ چھ بجے، ساڑھے چھ بجے، سات بجنے لگے۔ چشتی صاحب نے کہا۔ ''بھئی تمھارے مہمان نہیں آئے۔'' مَیں نے کہا۔ ''لکھنو والے ہیں۔ تکلّف میں کہیں رہ گئے۔ بس آتے ہی ہوں گے۔'' ''لو صاحب، سات بھی بج لیے، ساڑھے سات ہونے کو آئے۔ انتظار میں طبیعت بڑی بدمزہ ہُوئی۔ جوانی کی ترنگ۔ اُس زمانے میں، مَیں ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ جب آٹھ بجے تو میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ مَیں نے چشتی صاحب سے کہا۔ ''ماموں جان، یہ سارا سامان زنانے میں بھیج دیجئے۔'' وہ گھبرا کر بولے۔ ''کیوں میاں! کیوں؟ تھوڑا سا انتظار اور کرلو۔'' مگر میرا پارہ چڑھ چکا تھا۔ مَیں نے کہا۔ ''اب اگر وہ آئیں گے بھی تو مَیں نہیں کھلاؤں گا۔'' ماموں جان نے کہا۔ ''یہ بڑی نامناسب بات ہوگی۔'' مگر مَیں نے سارا سامان اُٹھوا کر اندر بھیج دیا اور خود بھی اندر چلا گیا۔ کوئی نو بجے دونوں حضرات تشریف لائے۔ مجھے اطلاع ہُوئی کہ مہمان آ گئے۔ مَیں نے بیوی سے کہا۔ ''چائے اور پان بھیج دینا۔'' اُنھوں نے پُوچھا۔ ''اور نہاری؟'' مَیں نے کہا۔ ''اب وہ نہاری کہاں رہی، وہ تو باسی قورمہ ہوگیا۔ اُسے مت بھیجنا۔'' انہوں نے سر کو حرکت دی جیسے کہہ رہی ہوں۔ ''عجب اوندھی مت کا آدمی ہے۔'' اور باورچی خانہ میں خاموش چلی گئیں۔ مَیں مردانے میں آیا تو شوکت صاحب نے کہا: ''ہمیں کچھ دیر ہوگئی۔'' میں نے کہا۔ ''جی ہاں۔'' ع

حریفاں بادہ ہاخوردند و رفتند

بولے: ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ آپ سے ملانے کے لیے جن احباب کو بُلایا تھا۔ انہوں نے دو گھنٹے تک آپ کا انتظار

کیا۔اس کے بعد کھاپی کر رُخصت ہو گئے۔''

''یعنی نہاری ختم؟''

''جی ہاں۔دلّی کے شُرفا سُورج نکلنے سے پہلے ہی نہاری کھا چکتے ہیں۔ویسے بازاروں میں مزدوروں اور کام پیشہ لوگوں کے لیے دن چڑھے تک بکتی رہتی ہے۔''

''یہ تو برا ہوا۔''

وقت کی پابندی نہ کرنے کا نتیجہ برا ہی ہوتا ہے۔اب آپ کچھ اور باتیں کیجئے۔کہئے کل کس کس سے ملے۔''

کراچی میں نہ یہ طنطنہ رہا تھا نہ کھانے میں نخرا۔رات کے وقت بالعموم کھچڑی کھاتے تھے۔دوپہر کا کھانا ریڈیو اسٹیشن پر ہوتا تھا۔وہاں باقاعدہ کھانے کی محفل جمتی تھی۔

شاہد احمد کی اکسٹھ سالہ زندگی دو بڑے واضح ادوار پر مشتمل ہے۔پہلا دور دلّی کا۔دوسرا دور کراچی کا۔ دلّی کے دور میں ان کی حیثیت ایک رئیس زادے کی تھی لیکن اس رئیس زادے کے دل میں بچپن سے ایک خلش تھی۔محرومی کا ایک احساس تھا جو مضطرب رکھتا تھا۔وہ چھ برس کی عمر میں ماں کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔بڑی ہُڑک اُٹھتی تھی ماں کی یاد آتی تھی اور بڑی شدّت سے آتی تھی۔ماں کی شفقت سے محرومی کا احساس اُنھیں زندگی بھر رہا لیکن انہوں نے اپنی اس خلش کو دل میں چھپائے رکھا۔شفیق باپ نے دیکھ بھال کی۔پیار محبت سے پالا پوسا لیکن باپ کی شفقت ماں کی ممتا کا بدل نہیں ہو سکتی۔

شاہد احمد کا لڑکپن ہنسی خوشی، کھیل کود میں گزرا۔بھائیوں میں شاہد احمد کا نمبر تیسرا تھا۔بڑے بھائی منذر احمد بردبار، سنجیدہ اور متین تھے۔بڑے بیٹے ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے تھے۔ منجھلے، تیز، شریر، ہنسوڑ اور ہر وقت کسی نہ کسی نئی شرارت کی دھن میں رہتے تھے۔ان کے برعکس شاہد احمد متین اور سنجیدہ تھے۔چھوٹے سراج الدین احمد بھی تیز طرار تھے لیکن تینوں چھوٹے بھائی بڑے بھائی کا بڑا ادب کرتے تھے۔بڑے بھائی اور سراج الدین احمد کو شکار کی لت تھی۔بڑے بھائی نے شاہد احمد کو بھی اس راہ پر لگانا چاہا لیکن وہ صاف بچ کر نکل گئے۔گھر میں ہر وقت اُچھل کود رہتی تھی۔ رفّو اور ناگا بھی اس چوکڑی میں شریک تھے۔ناگا ہی نے شاہد احمد کو بیڑیاں پلا پلا کر اُنھیں زندگی بھر کے لیے بیڑی پینے کے عارضے میں مبتلا کر دیا تھا۔

میٹرک کے امتحان سے تین مہینے پہلے شاہد احمد کی شادی ہو گئی تھی۔شادی میں پاس لیکن میٹرک میں فیل ہو گئے۔اگلے سال میٹرک کیا تو ایف ایس سی کے لیے لاہور بھیجے گئے۔یہ دوسری خلش تھی۔بھرے پُرے گھر سے دوری۔تنہائی کا احساس۔پھر بیوی کی بیماری۔ذہنی اور روحانی خلش سوا ہو گئی۔

میڈیکل کی تعلیم ترک کرنے کے بعد دلّی واپسی۔انگریزی میں آنرز۔شفیق باپ کی بیماری اور

انتقال۔ بیوی کی بیماری کا طول۔لیکن زندگی کے معمولات ہنسی خوشی جاری تھے۔دوستوں کا ایک بڑا حلقہ تھا جو شاہد احمد کو ہر وقت گھیرے رہتا تھا۔اسی حلقے نے ساقی کے اجرا کی تحریک کی اور شاہد احمد تن من دھن سے ساقی کو ترقی دینے میں لگ گئے۔ان کی محنت نے رنگ دکھایا ساقی اردو کا مقتدر ادبی رسالہ بن گیا اور شاہد احمد کے حلقے میں بڑا اضافہ ہوگیا۔اب تک ان کا حلقہ دلّی تک محدود تھا اب اس میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوئی۔ جو بھی قابلِ ذکر ادیب اور شاعر دلّی آتا وہ شاہد احمد کے یہاں ضرور حاضری دیتا۔ دعوتیں ہوتیں۔مہمان داری ہوتی۔ سیر سپاٹے ہوتے۔ سارے کام بڑی دریا دلی سے ہوتے۔ پیسہ دونوں ہاتھوں سے لُٹتا رہا۔شاہد احمد کو احساس ہی نہیں ہُوا۔وہ سیر چشم،خوش باش اور بامروت آدمی تھے۔ ساقی میں لکھنے والوں کو معاوضہ دیتے تھے۔موسیقی کا شوق بھی بڑھ رہا تھا۔گویّوں نے اُن سے خوب پیسہ اینٹھا کیونکہ وہ قرض دینے میں حاتم تھے۔موم بتّی دونوں سروں سے جلتی رہی تو ایک دن معلوم ہوا کہ سارا اثاثہ ختم ہوگیا مگر وہ حوصلہ مند انسان تھے۔کاروبار خود سنبھالا اور مالی طور پر مستحکم ہوگئے۔یہ ان کے کردار کا نمایاں وصف تھا۔ وہ پریشان نہیں ہوتے تھے۔ مایوسی ان کا شیوہ نہیں تھا۔ جو اللّے تللّے پہلے جاری تھے سب جاری رہے بلکہ ان میں اضافہ ہوتا گیا۔

عالیہ بیگم کا انتقال ہوگیا۔ بڑا صدمہ ہوا لیکن یہ صدمہ بھی انہوں نے خاموشی سے برداشت کرلیا۔بعض دوستوں سے اس سانحے کے بارے میں اپنے دُکھ کا بھرپور اظہار کیا لیکن جی چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار نہیں کی۔ زندگی کے کاروبار جاری رہے۔ساقی ترقی کرتا رہا۔نئی نئی کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ساری اردو دُنیا میں ساقی اور مدیر ساقی کا چرچا ہوا۔مدیر ساقی اپنی وضع پر قائم رہے اور وضع داری نباہتے رہے۔وضع داری انہوں نے ساری عمر نباہی۔ جب وہ رئیس تھے اس وقت بھی اور جب وہ کُھک ہوگئے تھے اُس وقت بھی۔

دلّی میں اُن کے یہاں آرجار بہت تھی۔ادیبوں۔شاعروں اور موسیقاروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔سب کو ترنوالے ملتے تھے اور جب وہ کراچی میں مالی طور پر بالکل کمزور ہوگئے تھے۔اُس زمانے میں بھی انکے یہاں آرجار بہت تھی۔کراچی آنے والے ادیبوں کا ان کے یہاں کھانا ضرور ہوتا تھا۔کوئی تکلّف نہیں۔ تخت پر دسترخوان بچھا۔مہمان آرام سے بیٹھے۔گھر کا پکا ہوا مزے دار کھانا کھایا۔اس کے علاوہ بعض لوگ ایسے تھے جنہوں نے مستقل طور پر ڈھئی دے رکھی تھی۔ایک ہارمونیم ماسٹر تھے۔استاد یعقوب خان تھے۔امام الدین تھے۔ایک درزی تھے جو دن بھر کپڑے سیتے رہتے تھے۔ایک طبلہ نواز سجاد تھے۔ جو کبھی آگئے تو آگئے۔ چلے گئے تو چلے گئے۔شاہد احمد سب کی آؤ بھگت کرتے تھے۔سب کا خیال کرتے تھے۔ ان کے برتاؤ سے کسی آبگینے کو ٹھیس نہیں لگتی تھی۔صبح شام کے آنے والے بھی تھے۔استاد رمضان خان بیٹھے ہیں۔دلّی کے تین بڈھے بیٹھے ہیں۔شام کو عسکری صاحب آئے ہوئے ہیں۔ڈاکٹر احسن فاروقی کی آواز کمرے میں گونج رہی ہے۔شمس زبیری اور اسلم بیٹھے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی بیٹھے ہیں۔

سب چائے پی رہے ہیں اور دُنیا جہان کی باتیں ہو رہی ہیں۔ شاہد احمد آنے جانے والوں سے گھبراتے نہیں تھے۔ ان کا خیر مقدم کرتے تھے۔ دوسروں کے کام کرنے میں اُنھیں خوشی محسوس ہوتی تھی۔ آنے والے کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ شاہد احمد کی مہمان نوازی اور دوست پروری میں کسی قسم کی کمی ہے۔ ان کی دوسری شریکِ حیات عاصمہ بیگم نے ان کی مہمان نوازی اور دوست پروری کا بھرم ہمیشہ قائم رکھا۔ انہوں نے کراچی کے رونقِ اسلام اسکول میں تدریسی ذمہ داری قبول کرلی تھی۔ رونقِ اسلام اسکول اللہ تعالیٰ کے پچھواڑے کھارادر میں ہے۔ ٹریفک جام سے ناآشنا۔ اُس عہد کی رواں دواں بسوں میں پیر الٰہی بخش کالونی سے کھارادر جانے میں پورا ایک گھنٹہ لگتا تھا۔ شاہد احمد کے بقول ایک گھنٹہ جانے کا ایک گھنٹہ آنے کا اور ایک گھنٹہ کوفت کا۔ لیکن عاصمہ بیگم نے ملازمت کے باوجود گھر کا گھروانہیں ہونے دیا خاموشی سے ایم۔اے بھی کرلیا۔ شاہد احمد کی طرح وہ بھی روزمرّہ کے آنے والوں اور خاص لوگوں کی تواضع میں کوئی کمی نہیں کرتی تھیں۔ ہنس مُکھ تھیں۔ اپنے شوہر کی صحیح معنوں میں رفیقِ حیات تھیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، اسلم اور شمس زبیری سے مادرانہ شفقت کا اظہار کرتی تھیں۔ وہ اور شاہد احمد کمرے میں بیٹھے ہوں اور ان تین صاحبان میں سے کوئی موجود ہو تو بڑی چُہل رہتی تھی۔ عاصمہ بیگم ہنستی رہتی تھیں۔ شاہد احمد اُنہیں چھیڑتے لیکن وہ محض ایک مسکراہٹ سے اس چھیڑ کا جواب دیتی تھیں مجھ سے اسلم کی شادی اُنہیں کی پسند، ایما اور کوشش سے ہوئی تھی وہ شمس صاحب کے ہاتھ بھی پیلے کرنا چاہتی تھیں مگر وہ راہ پر نہیں آئے عاصمہ بیگم کا انتقال دس نومبر ۱۹۸۵ء کو لاہور میں ہوا۔ اُنہیں اپنی آخری آرام گاہ کے لیے لاہور کی سرزمین پسند آئی۔

دلّی میں گانے کے جلسے گھر پر نہیں ہوتے تھے نہ ہو سکتے تھے۔ لیکن کراچی میں یہ جلسے آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ بڑے جلسے بھی اور معمولی بھی۔ اُستاد بندو خاں کے انتقال پر ان کے برادر نسبتی اُستاد چاند خان جو شاہد احمد کے اُستاد تھے پُرسے کے لیے کراچی آئے۔ ان کے اعزاز میں دو بڑے زبردست جلسے ہوئے جس میں انہوں نے خود بھی اپنے اُستادانہ فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ حیدرآباد دکن کے معروف موسیقار، رؤف کراچی آئے تو ان کے اعزاز میں بھی ایک بڑا جلسہ ہوا تھا۔ آج اُستاد اسد علی خان آئے ہیں۔ آج اُستاد امیر علی خاں آئے ہیں۔ معمولی جلسہ ہے تو کمرہ بھرا ہوا ہے۔ بڑا جلسہ ہے تو شامیانہ لگا ہوا ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان جلسوں اور دعوتوں کا خرچ کیسے پورا ہوتا تھا۔ بڑی برکت تھی اس شاہ خرچی میں۔ ہاتھ رُکتا ہی نہیں تھا۔

تقریبیں بھی مسلسل ہوتی رہتی تھیں۔ آج میلاد ہے۔ آج بی بی (ارجمند) کی سال گرہ ہے۔ آج فلاں تقریب ہے۔ سارا خاندان مدعو ہوتا تھا۔ بڑی رونق ہوتی تھی۔ بڑا ہنستا مسکراتا گھر تھا لیکن قبر کا عذاب مردہ ہی جانتا ہے۔ شاہد احمد کی ان گھریلو تقریبوں کے پس منظر میں ایک شکستہ دل لیکن محنتی اور

باہمت انسان کا چہرہ بھی اُبھرتا ہے۔ ایسا انسان جس نے جیتے جی ہار نہیں مانی۔

اُجلا خرچ اور لگی بندھی آمدنی۔ لیکن شاہد احمد نے کبھی مالی مشکلات کی شکایت نہیں کی۔ آپریشن کے بعد بڑے بھائی منذر احمد نے ڈاکٹر جمیل جالبی کے ذریعے سے ان سے کہلوایا۔ ''میں بڑا بھائی باپ کی جگہ ہونے کی حیثیت سے تمھاری کچھ مالی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔'' انہوں نے بڑے پس وپیش کے بعد جواب دیا۔ ''جیسی تمہاری مرضی'' اس کے بعد کیا ہوا یہ کسی کو نہیں معلوم۔ یہ ضرور معلوم ہے کہ جب مسعود احمد باہر جا رہے تھے تو بڑے بھائی نے اُنہیں سو پاؤنڈ دیے تھے۔ یہ تایا اور بھتیجے کا مسئلہ تھا۔ شاہد احمد کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

شاہد احمد کا روّیہ تو یہ تھا کہ دلّی میں وہ ادیبوں اور شاعروں کو معقول معاوضہ دے کر اُن کی کتابیں اشاعت کے لیے لے لیتے تھے۔ کرشن چند، منٹو، عصمت، عظیم بیگ چغتائی، بہزاد لکھنوی، سب کی کتابیں اُنہوں نے شائع کیں اور معقول معاوضہ دیا۔ ایک بار کرشن چندر نے اُن سے کہا کہ میں کشمیر جا کر ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں۔ اس واقعے کی تفصیل شاہد احمد کی زبانی سنیے:

''کرشن چندر بڑے خرچیلے آدمی تھے۔ تنخواہ کے ڈھائی تین سو روپے شاید دس دن بھی نہیں چلتے ہوں گے۔ کتابیں لکھتے تھے یا مرتّب کرتے تھے اور لاہور سے اُن کی کتابیں چھپتی رہتی تھیں۔ اُن کی آمدنی سے وہ اپنے اخراجات پورے کرتے تھے۔ ایک دن شام کو کُتب خانہ علم وادب پر آئے۔ احباب حسبِ معمول جمع تھے، کرشن چندر عموماً تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جایا کرتے تھے، مگر اُس دن جمے رہے اور پہلو بدلتے رہے۔ جب دکان بند ہونے لگی اور سب اپنے اپنے گھر جانے لگے تو کرشن چندر نے مجھ سے کہا: ''آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' میں نے کہا: فرمایئے؟ بولے: ''آپ اِن سب سے رُخصت ہو لیں تو کہیں چلیں۔'' میں اُن کے ساتھ ہو لیا۔ اُنہوں نے ایڈورڈ پارک کا رُخ کیا۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے مچھلی والوں میں سے گزر گئے۔ کرشن چندر جب کچھ نہ بولے تو میں نے کہا: ''فرمایئے، کیا بات ہے؟'' بولے: ''میں ساقی بک ڈپو کے لیے ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا: ''ضرور لکھیے، اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے؟'' ہنس کر بولے: ''مگر اس کے لیے مجھے کشمیر جانا ہوگا۔'' میں نے کہا ''تو جایئے'' کہا: ''میں چاہتا ہوں کہ آپ اِس ناول کا کاپی رائٹ مجھ سے لے لیں۔'' کرشن چندر کو معلوم تھا کہ جب سے ایک معروف ادیب نے اپنی ایک کتاب کی رائلٹی کے سلسلے میں مجھ سے بدگمانی کی تھی، میں نے رائلٹی پر کتابیں چھاپنے سے توبہ کر لی تھی اور دائمی حقوق خریدنے شروع کر دیے تھے۔ لہٰذا کرشن چندر نے کاپی رائٹ خریدنے کی پیش کش کی تھی۔ اب گھبرانے کی میری باری تھی کہ اتنا بڑا اور مقبول مصنّف نجانے کیا مانگ بیٹھے؟ میں نے اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے پوچھا کہ ''آپ کیا قبول کر لیں گے؟'' بہت ہچکچاتے ہوئے انہوں نے کہا ''کیا آپ مجھے اس کے لیے ایک ہزار روپے دے دیں گے؟''

میری ساری گھبراہٹ رفو چکر ہوگئی۔ میں نے کہا: ''مجھے منظور ہے۔'' پھر انہوں نے بڑی ہمت کر کے کہا: ''کیا آپ مجھے یہ روپیہ پیشگی دیں گے؟'' میں نے کہا: ''ہاں، دے دوں گا۔'' بولے: ''تو جب آپ مجھے یہ روپیہ دیں گے تو میں کشمیر چلا جاؤں گا اور ایک مہینے میں ناول لکھ لاؤں گا۔'' میں نے کہا: ''روپیہ آپ کو کل مل جائے گا۔'' بہت خوش ہوئے، بولے: ''بس تو میں پرسوں چلا جاؤں گا۔'' پچیس دن بعد وہ کشمیر سے واپس آ گئے اور مجھے اپنے ناول ''شکست'' کا مسوّدہ دے گئے۔ میں نے حیران ہو کر اُن کی طرف دیکھا۔ ''کمال کر دیا آپ نے!'' کہنے لگے: ''روپے ختم ہو گئے تھے، اس لیے میں کچھ جلدی واپس آ گیا۔'' ۲۵ دن میں ایک ہزار خرچ کر دینے پر تو مجھے تعجب ہوا ہی تھا، اس سے زیادہ تعجب کرشن چندر کی راست معاملگی اور دیانت داری پر ہوا۔ یہ پہلے ادیب تھے جنہوں نے اپنی بات کا پاس کیا۔ ورنہ یار لوگ بڑے بڑے وعدے کر کے مجھے جھنکاتے ہی رہے۔''

باوجودیکہ ادیب اُنہیں جھنکاتے رہے اُن کے روّیے میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ادیب دوستوں کی مدد اپنا فرض سمجھتے تھے۔ انہوں نے جس فراخ دلی سے عظیم بیگ چغتائی کی مدد کی اُس سے ان کی دوست نوازی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کراچی میں جب اُن کا ہاتھ تنگ تھا انہوں نے عظیم بیگ چغتائی کی کتابوں کے حقوق از خود مسز چغتائی کو واپس کر دیے تھے۔ مسز چغتائی ان کے یہاں برابر آتی جاتی رہتی تھیں۔ سعادت حسن منٹو کی وفات کے بعد ان کی کتابوں کے حقوق بھی بیگم صفیہ منٹو کو واپس کر دیے تھے۔ یہ دلداری ان کا خاندانی مزاج تھا۔ ادیبوں کے جھنکانے کی بات یہ ہے کہ کشمیر کے حوالے سے کرشن چندر کا ناول شکست جب شائع ہوا تو اس کی مقبولیت سے متاثر ہو کر بعض ادیبوں نے شاہد احمد سے پیشگی معاوضہ وصول کر کے ناول لکھنے کا معاہدہ کیا۔ لیکن ناول کسی نے بھی نہیں لکھا۔ نہ رقم واپس کی۔ رقم صرف فیض احمد فیض نے واپس کی اور کہا ''ناول نہیں لکھا گیا۔'' باقی سب لوگ رقم کھا گئے۔ شاہد احمد نے کسی سے تقاضہ بھی نہیں کیا۔ تقاضہ کرنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔

شاہد احمد غیرت مند اور خوددار تھے۔ غریبی میں خودی کی نگہبانی اُن کا شیوہ تھا مگر ایک دفعہ ایسی صورت حال بھی پیش آئی کہ اُنہیں اپنے اصول سے ہٹنا پڑا۔ تاہم اس اصول شکنی میں بھی احتیاط اور مدد کرنے والے کی دلداری کا لحاظ کچھ زیادہ ہی عیاں ہے۔ ہوا یہ کہ ایک دن جمیل الدین عالی اُن سے ملنے گئے اُنہیں شاہد احمد کی مالی پریشانیوں کا احساس تھا۔ کچھ مدد بھی کرنا چاہتے تھے مگر تامّل بھی تھا۔ انہوں نے لکھا ہے۔

''ایک مرتبہ سلام کو حاضر ہوا تو دیکھا کہ ''ساقی'' کے پیکٹ بنا رہے ہیں اور پیکٹوں پر ٹکٹ لگا رہے ہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولے اس حال میں تو میں کب سے ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ ''ساقی'' چھاپ رہا ہوں۔ میاں سب وقت گزر جاتے ہیں..... اب ہمت کر کے عرض کرتا ہوں کہ میں نے حسبِ استطاعت کچھ مالی خدمت کی پیش کش کی۔ سختی کے ساتھ انکار کر دیا۔ میرے بہت اصرار پر بولے کہ

کچھ خریدلو۔ کیا خریدلو..... اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک وچتر وینا رکھی تھی۔ (ایسے برابر کے تونبے کم ملتے ہیں) بولے یہ خریدلو۔ میں نے سنا تھا تم سیکھ رہے ہو۔ سچ سنا تھا۔ میں نے خریدلی۔ اس وقت میرے پاس اپنی کار نہیں تھی۔ رکشا منگوا کر اس میں رکھوائی رخصت کرتے وقت بولے دیکھو یہ بات میری حیات میں نہ لکھنا۔ کسی سے کہنا بھی نہیں..... یہ اشتہار طلب بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ زمانہ بڑا خراب ہے میاں۔"

زمانہ واقعی خراب ہے اور خرابی ہے کہ روز بروز بڑھتی جاتی ہے لیکن خراب زمانے کے اس واقعے میں شاہد احمد کی خودداری۔ غیرت اور احتیاط کا بھرپور اظہار بھی ہے۔ امداد قبول نہیں کی۔ شوق کی ایک چیز دوسرے شوقین کے حوالے کردی اور اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کی زندگی میں اس کا کوئی تذکرہ نہ ہو۔ شاہد احمد کی شخصیت کا یہ رُخ قابلِ غور بھی ہے اور قابلِ قدر بھی۔

شاہد احمد جب تک بذاتِ خود کتابوں کی اشاعت کا کام کرتے رہے اُس وقت تک وہ حتی المقدور ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کرتے رہے۔ کراچی میں جب اُنہوں نے کتابوں کی اشاعت کا کام ترک کردیا اُس وقت بھی وہ اپنے ادیب دوستوں کی سرپرستی کرتے رہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کے بعض ناولوں کی اشاعت کا معاملہ اردو اکیڈمی کے علاؤالدین خالد سے طے کرایا۔ اس کے علاوہ ایک اور صاحب تھے نفاست حسین صدیقی جوان کے پڑوس میں رہتے تھے۔ درسی کتابوں کی اشاعت کا کام کرتے تھے۔ اُنہیں فاروقی صاحب سے متعارف کرایا صدیقی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی کچھ کتابیں بھی خریدلی تھیں۔ ایم اسلم کا معاملہ بھی شاہد احمد کی توجہ اور کوشش سے صدیقی صاحب سے طے ہُوا تھا۔ دوستوں اور جاننے والوں کی مدد میں وہ ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔ انہوں نے شاید ہی کسی کی مدد سے انکار کیا ہو۔

شاہد احمد رئیس زادے ہونے کے باوجود بڑے محنتی انسان تھے۔ صبح سے شام تک مصروف رہتے۔ دلّی میں ساقی کے ایک کاتب تھے 'انوار'— کراچی آگئے تھے۔ ساقی کی کتابت کرتے رہتے تھے۔ اُن کا ٹھیا شاہد احمد کے کمرے میں ایک کونے میں تھا۔ بیٹھے کاپی لکھتے رہتے تھے۔ ادھر انہوں نے کام ختم کیا اور شاہد احمد نے تصحیح کے لیے قلم سنبھالا۔ انگریزی کا کوئی اقتباس ہے تو اپنے قلم سے لکھ دیا۔ کراچی کے ترقی اردو بورڈ نے میر امن کی باغ و بہار کا ایک مستند ایڈیشن شائع کیا تھا۔ اس کے پروف شاہد احمد ہی نے پڑھے تھے۔ رسالہ چھپ کر آتا تو خود ہی لپیٹتے۔ خود ہی پتے لکھتے۔ سنا ہے بعد میں شمس زبیری بھی اس کام میں ہاتھ بٹانے لگے تھے۔

روزمرّہ کے کاموں کے علاوہ خط و کتابت کا کام بھی بہت تھا۔ شاہد احمد بالعموم کارڈ لکھتے تھے۔ اُن کے ایک دوست نے کارڈ لکھنے کو ان کی کاہلی پر محمول کیا ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ کارڈ لکھنا اُس زمانے کا عام طریقہ تھا۔ اُن کے معاصرین میں پروفیسر رشید احمد صدیقی ہمیشہ کارڈ ہی لکھتے تھے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کا بھی یہی دستور تھا۔ میرے خیال میں اس میں کاہلی اور مستعدی کا کوئی

مسئلہ نہیں۔ مضمون طویل ہو تو لفافہ استعمال ہوتا تھا۔ مختصر ہو یا طولانی۔ منفرد انداز کا حامل ہوتا تھا جسے شاہد احمد کا خاص انداز کہہ سکتے ہیں۔ طویل خطوں میں افسانوی اور ڈرامائی انداز بھی ہوتا تھا۔

یہ معمول کے کام تھے۔ لکھنا لکھانا اس کے علاوہ تھا۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ لکھ رہے ہیں۔ ترجمہ ہو رہا ہے۔ غنائیہ لکھا جا رہا ہے۔ کوئی مضمون چل رہا ہے۔ کتنی ہی کتابیں اُنہوں نے ہنستے کھیلتے اپنے معمول کے کاموں کے ساتھ ساتھ لکھ دیں۔ محنت کی عادت بھی تھی اور وقت میں برکت بھی بہت تھی۔ جبھی تو اتنے سارے کام خوش اسلوبی سے ہو جاتے تھے۔

ملنے جلنے، آنے جانے میں شاہد احمد کو کوئی تامّل نہیں تھا۔ ادبی جلسوں میں شوق سے جاتے تھے مضمون بھی پڑھتے تھے۔ صدارت بھی کرتے تھے اور کبھی کبھی جلسوں سے بھناتے بھی تھے۔ موسیقی کی محفلوں میں بھی کثرت سے شریک ہوتے تھے۔ لیکن یہ محفلیں ان کے معمولات زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتی تھیں۔

چائے کے معاملے میں دریا نوش تھے۔ دلّی کے بارے میں تو کچھ کہنا مشکل ہے لیکن کراچی میں ہر وقت چائے کی پیالی سامنے رکھی رہتی تھی۔ جب دیکھو چائے پی رہے ہیں۔ دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ ناممکن ہے کہ کوئی شخص ملنے آئے اور چائے پیے بغیر چلا جائے۔ ہر مہمان کے ساتھ خود بھی چائے پیتے تھے۔ سنا ہے ریڈیو اسٹیشن پر بھی یہی حال تھا وہاں بھی ہر وقت چائے چلتی رہتی تھی۔ نجانے چوبیس گھنٹوں میں کتنی پیالیاں پی جاتے تھے۔ گانے کی محفلوں میں بھی چائے پیتے تھے۔ محفل میں گا رہے ہیں۔ چائے کی پیالی سامنے ہے۔ گانے کے دوران پیالی کنڈے سے پکڑنے کے بجائے چاروں طرف سے پکڑتے اور ہاتھ میں اُٹھائے رہتے۔ یہ بھی ایک خاص ادا تھی۔

شاہد احمد ہر کسی سے نہیں کھلتے تھے۔ نئے آنے والے اکثر اوقات اُنہیں مدمّغ اور مغرور سمجھتے تھے۔ نئے لوگوں سے وہ عموماً مختصر گفتگو کرتے تھے اور دوٹوک بات کہتے تھے۔ کسی کی ہاں میں ہاں ملانا یا بلاوجہ تعریف کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ صاف اور کھری بات کہتے تھے۔ اُن کی طبیعت میں سفاکانہ حقیقت پسندی تھی جو ان کی ساری تحریروں میں نمایاں ہے۔ بعض اوقات ان کی بات پرایوں ہی کو نہیں اپنوں کو بھی ناگوار گزرتی تھی لیکن وہ عادت سے مجبور تھے۔ ہاں جن لوگوں سے بے تکلفی تھی اُن سے بڑے مزے کی گفتگو کرتے تھے۔ فقرہ ایسا کہتے تھے کہ سُننے والا جھوم جاتا تھا۔ صرف کہتے ہی نہیں تھے فقرہ لکھتے بھی ایسا ہی تھے۔ نام رکھنے اور بگاڑنے میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ کتنے ہی لوگ اپنے اصلی ناموں کے بجائے ان کے رکھے ہوئے ناموں سے مشہور ہوئے۔

شاہد احمد کی حسِ مزاح بہت تیز تھی لیکن یہ حس بے تکلّف احباب کے حلقے تک محدود تھی۔ عام طور پر لیے دیے رہتے تھے مگر اس میں بدمزاجی یا اکھل کھرے پن کی آمیزش نہیں تھی۔ ملنے جُلنے میں مرعوب کسی

سے نہیں ہوتے تھے۔ سعادت حسن منٹو جب پہلی بار دلّی میں اُن سے ملے تو کہا ''میں نے فلاں رسالے کا روسی ادب نمبر مرتب کیا ہے۔ اب میں ساقی کا فرانسیسی ادب نمبر مرتب کرنا چاہتا ہوں۔'' شاہد احمد نے برجستہ جواب دیا۔ ''ساقی کے نمبر تو میں خود ہی مرتب کرتا ہوں۔'' منٹو کو اندازہ ہو گیا کہ شاہد احمد پر میری بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر دونوں دوست ہو گئے اور شاہد احمد نے ساقی میں منٹو کے افسانے اور ساقی بک ڈپو سے اُن کے افسانوی مجموعے بھی شائع کیے۔

جب تک دلّی میں رہے خوش حال رہے۔ کسی کا احسان نہیں اُٹھایا۔ ریڈیو سے پروگرام کرتے تھے مگر معاوضہ نہیں لیتے تھے۔

ہر طرح کے انسان ہوتے ہیں۔ بعضوں کو معاوضہ اور رقم وصول کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ بعض کسی حال میں بھی معاوضے سے دست بردار نہیں ہوتے۔ شاہد احمد دلّی میں معاوضے کے نام سے بدکتے تھے۔ ایک دفعہ مشہور فلم ساز سہراب مودی دلّی آئے۔ وہ مرزا غالب پر ایک فلم بنانا چاہتے تھے۔ کسی نے اُنہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ فلم کے مکالمے شاہد احمد سے لکھوائے جائیں۔ چنانچہ وہ دلّی میں شاہد احمد سے ملے اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ شاہد احمد نے مکالمے لکھنے کی حامی بھر لی۔ سہراب مودی نے معاوضے کے بارے میں دریافت کیا۔ معاوضے کی بات سنتے ہی شاہد احمد ہتھے سے اُکھڑ گئے اور بات ختم ہو گئی۔ ایک انداز یہ تھا اور کراچی کے دوسرے انداز کی جھلک پہلے گزر چکی ہے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا لیکن بڑا آدمی وہ ہے جو بُرے وقت میں بھی عزتِ نفس اور خودداری کو قایم رکھے۔ کراچی میں ہر شخص اُنہیں شاہد بھائی اور بھائی صاحب کہتا تھا۔ ریڈیو کا ہر شخص اس لقب سے واقف تھا۔ آپ ریڈیو پہنچ کر کسی سے پوچھیں کہ بھائی صاحب کہاں ملیں گے تو وہ فوراً آپ کو شاہد احمد کے پاس پہنچا دے گا۔ خاندان والوں کے لیے ان کی عرفیت 'شدّو' تھی۔ چھوٹے بڑے سب اُنہیں شدّو یا شدّو بھائی کہتے تھے۔ بھائی صاحب اور شدّو بھائی دونوں ناموں میں محبت کی ایک لہر ہے، اپنائیت کی ایک جھلک ہے۔

یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ میں نے شاہد احمد کے ریڈیائی دور کا تذکرہ اتنی کثرت اور تسلسل سے سُنا ہے کہ وہ یادوں کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ اس حوالے سے مختلف واقعات کو جوڑ کر ایک تصویر یہاں پیش کی گئی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ ایک بار ایک بڑے میاں کچھ ہولا جبلا سے شاہد صاحب کو پوچھتے ہوئے ریڈیو پاکستان کے شعبۂ موسیقی میں آئے۔ لوگوں نے اُنہیں شاہد احمد کے پاس پہنچا دیا۔ نہ سلام نہ دعا انہوں نے شاہد احمد کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ ''اخاہ۔ شاہد میاں۔ وہ مرزا انیس تھے نا۔ تمہیں یاد ہوگا۔ وہ کہاں گئے۔'' شاہد احمد نے بڑا سوکھا منھ بنا کر کہا۔ ''مدّت ہوئی۔ فوت کھیل گئے۔'' فوت کھیل گئے کا جملہ اتنا مقبول ہو گیا کہ شعبۂ موسیقی اور شاہد احمد کے حلقے میں زبان زد ہو گیا۔

ایک زمانے میں کراچی میں ایمپریس مارکیٹ کے قریب ٹھیلوں پر مُرغیوں کی یخنی فروخت ہوتی تھی۔

اُبلی ہوئی مرغیاں، ٹنگی ہوئی ہیں۔ گرم گرم یخنی تیار ہے۔ لوگ کھڑے نوشِ جاں کر رہے ہیں شاہد احمد کے ایک دوست کو اس یخنی سے رغبت پیدا ہوگئی۔ وہ گاہے گاہے یہ یخنی پینے جاتے تھے۔ شاہد احمد اور شمس زبیری کو بھی ساتھ لے جاتے۔ ایک دن شاہد احمد سے کسی نے پوچھا۔ ''آپ صدر میں نظر آئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''ہاں۔ کوّوں کا غسلِ میت پینے گیا تھا'' ''کوّوں کے غُسل میت'' کی پھبتی بھی بہت دن تک زبانوں پر رہی۔ خوش مزاجی اور انفرادیت کا ایسا اظہار اکثر ہوتا تھا۔

مولوی نذیر احمد کی اکڑ اور جوابی کارروائی میں شدّت اُن کی شخصیت کا نمایاں وصف ہے۔ یہ وصف خود اعتمادی اور شخصیت کی مضبوطی سے وجود میں آتا ہے۔ کمزور طبیعت والے لوگ جوابی کارروائی کے متحمل نہیں ہوتے اور حق بات پر اڑنے سے گریز کرتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد کی اکڑ اور جوابی کارروائی میں شدّت ان کے بیٹے بشیر الدین احمد میں بھی تھی، بشیر الدین احمد کا غُصّہ بھی مشہور تھا۔ کھاری باؤلی میں مائیں اپنے بچّوں کو سُلانے کے لیے کہتی تھیں۔ سو جاؤ ورنہ ڈپٹی صاحب ڈانٹیں گے۔ بچے روتے تھے تو مائیں چپ کرانے کے لیے کہتیں ''مولوی صاحب گھر میں ہیں۔ چپ ہو جاؤ ورنہ.....'' شاہد احمد کے غُصّے کی کوئی داستان خاندان والوں نے نہیں سُنی تاہم اکڑ اور جوابی کارروائی میں شدّت اُن کے مزاج کا حصہ تھی۔ بگڑ جاتے تو پھر سنبھالے نہیں سنبھلتے تھے۔ مزاج کی یہ حدّت اور شِدّت اُن کے ادبی معرکوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ کبھی کبھی حد سے بھی گزر جاتے تھے۔

ایک دفعہ یہ ہوا کہ ساقی میں صادق الخیری کا ایک افسانہ ''دیور'' شائع ہوا۔ یہ ترقی پسند تحریک کا ابتدائی دور تھا۔ لکھنے والوں کے قلم میں بیبا کی پیدا ہو چلی تھی۔ صادق الخیری کے افسانے میں بھی بیبا کی اور تیزی تھی۔ اس افسانے کا انداز دارالمصنفین اعظم گڑھ کے عالموں کو ناگوار گزرا اور دارالمصنفین کے رسالے 'معارف' میں اس پر ایک طویل تبصرہ شائع ہوا جس کا لہجہ خاصہ سخت تھا۔ شاہد احمد کو معارف کا تبصرہ بڑا گراں گزرا اور انہوں نے فوری طور پر اس کا جواب بھی شائع کر دیا۔ ساقی کے جس شمارے میں یہ جواب شائع ہوا اُس کے لیے شاہد احمد نے اردو کے ممتاز مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی سے دانتے کے 'انفرنو' کا بطور خاص ترجمہ کروایا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ ساقی کی ''نگاہِ اولیں'' کے لیے وہ اس کے بارے میں ایک تفصیلی مقالہ قلم بند کریں گے لیکن وہ معارف کے تبصرے سے ایسے مشتعل ہوئے کہ مقالہ وقالہ چھوڑ چھاڑ ایک نہایت ہی تیز اور تلخ اداریہ قلم بند کیا اور شائع کر دیا۔ اس اداریے میں شاہد احمد نے سیّد سلیمان ندوی کی بزرگی اور خدمات کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ بلکہ یہ مُنھ نوچ لینے والا انداز تھا۔ باتیں سچّی اور کھری تھیں لیکن بڑے درشت اور ناروا انداز میں لکھی گئی تھیں سیّد صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بحث ختم ہوگئی لیکن شاہد احمد کے مزاج کی یہ تیزی بہتوں کو اچھی نہیں معلوم ہوئی مگر اکڑ تو اکڑ ہے مگر یہ بات بھی اپنی جگہ مُسلّم ہے کہ اگر کوئی ان سے اپنی غلطی پر معذرت کرتا تو وہ خوش دلی سے معاف بھی

کر دیتے تھے۔ پروفیسر عزیز احمد اُن سے اکڑے۔ بڑا فیل مچایا مگر جب ادھر سے جوابی کارروائی سخت اور تیز ہوئی تو انہوں نے گھٹنے ٹیک دیے اور معذرت خواہ ہوئے۔ شاہد احمد نے اُنہیں صدقِ دل سے معاف کر دیا اور اس کے بعد عزیز احمد کا ایک آدھ افسانہ ساقی میں شائع ہوا۔ اور ملال جاتا رہا۔

عام زندگی میں وہ ناراض نہیں ہوتے تھے۔ گھر کے کاموں میں دخل نہیں دیتے تھے۔ بچّوں کی تعلیم و تربیت کا سارا بار عاصمہ بیگم پر تھا۔ شاہد احمد اپنے خاندانی مزاج کے مطابق بچّوں سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔ بچّوں نے بھی ماشاء اللہ بڑی ترقی کی۔ مشہود احمد ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔ مسعود احمد البرٹا یونیورسٹی کے شعبۂ ریاضیات کی لائبریری سے وابستہ تھے۔ مسعود کی بیٹی عالیہ نے (مسعود احمد نے بیٹی کا نام ماں کے نام پر رکھا ہے) موسیقی میں ماسٹرز کیا ہے۔ دادا کی طرح موسیقار ہے۔ دادی کی ہم نام عالیہ شاہد احمد کے ذوقِ موسیقی کی ورثہ دار ہے۔ محمود امریکہ میں ہیں۔ سب خوش ہیں اور مصروف ہیں۔ شہود احمد کم سنی میں وفات پا گئے تھے۔

بیٹیوں میں عائشہ اور شاہدہ کراچی میں ہیں۔ ارجمند اور فرزانہ امریکہ میں بس گئی ہیں سب سے چھوٹی صائمہ لاہور میں ہیں۔ پیر کالونی والے مکان میں جو کبھی ادیبوں اور موسیقاروں کا مرکز تھا مشہود احمد آباد ہیں۔ غالب کے بقول ''ہوتا ہے ہر مکاں کو مکیں سے شرف اسد''۔ اب اُدھر سے گزر ہوتا ہے تو شاہد احمد کا وہ سارا دور جو یہاں گزرا آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ جانے والا چلا گیا یادیں چھوڑ گیا۔

شاہد احمد کی شخصیت کا ایک نمایاں رُخ دلّی سے ان کی والہانہ محبت تھی۔ وہ اپنے نام میں دہلوی لکھنا ضروری سمجھتے تھے اور اگر کوئی کسی سلسلے میں ان کا نام لکھتا تو کہتے ''میرے نام کے ساتھ ''دہلوی'' ضرور لکھئے۔ یہ دلّی کے دل والوں کی باتیں تھیں۔

کمالاتِ فن

شاہد احمد نے ہوش سنبھالا تو دادا کی کتابیں دیکھیں۔ ان کی تصانیف کے چرچے سُنے۔ گھر میں ہر طرف اُن کی کتابیں نظر آتی تھیں۔ سب انہیں شوق سے پڑھتے تھے۔ باپ کو دیکھا کہ کتابیں لکھ رہے ہیں۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر لکھنے بیٹھ گئے اور مسلسل لکھے جا رہے ہیں۔ کتابیں لکھ کر بچّوں کو پڑھا رہے ہیں۔ دلّی کی عمارتوں کا حال مرتب کر رہے ہیں۔ شعر کہہ رہے ہیں۔ دیوان مرتب کر رہے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی اُنہیں ادب کے خاندانی ورثے کے حامل ہونے کی بنا پر وارث الادب کہتے اور لکھتے تھے۔ ملنے جُلنے والے جو آتے ہیں وہ بھی اسی مزاج کے ہیں۔ کتابیں دھڑا دھڑ شائع ہو رہی ہیں۔ گھر میں اخبار اور رسالے آ رہے ہیں۔ قسم قسم کی کتابیں باہر سے آ رہی ہیں۔ خاندان کے ایک اور گھرانے یعنی شاہد احمد کے ایک چچا مصورِ غم راشد الخیری زور و شور سے لکھ رہے ہیں۔ اُدھر ننھیال میں ماموں زاد بھائی اشرف صبوحی ۲۴ء سے لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس ماحول میں شاہد احمد کا پڑھنے لکھنے سے متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔ بڑے بھائی منذر احمد کو بھی لکھنے پڑھنے سے شوق تھا۔ کتابوں کی اشاعت کا کام وہی سنبھالے ہوئے تھے۔ کچھ لکھ بھی لیتے تھے۔ اشرف صبوحی کے رسالے ''ارمغاں'' کے پہلے شمارے میں ان کا ایک افسانہ نما مضمون بھی شائع ہوا تھا۔ مُبشّر احمد اس راہ پر نہیں آئے۔ حیدر آباد جا کر پولیس میں ملازم ہو گئے۔ شاہد احمد سے چھوٹے سراج الدین احمد (میرے والد) کو بھی نثر لکھنے کا شوق تھا۔ شکار کے حوالے سے انہوں نے کچھ مضامین بھی لکھے تھے لیکن بعد میں وہ مزاحیہ شاعری کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کی مزاحیہ شاعری کا ایک مجموعہ ''طوفانِ ظرافت'' ساقی بک ڈپو سے شائع ہوا تھا۔

باپ کو ہر وقت لکھنے کی دُھن میں غلطاں دیکھنے کا اثر شاہد احمد پر بھی ہوا۔ اُنہیں باپ دادا کے ادبی ورثے کا امین ہونا تھا۔ قدرت نے اُنہیں ادب کا ذوق بھی عطا کیا تھا۔ اسکول کی تعلیم کے زمانے میں اُنہوں نے کچھ لکھا لکھایا ہو تو اس کا اب کوئی نشان نہیں ملتا لیکن ایف سی کالج لاہور پہنچ کر انہوں نے افسانہ نگاری کی طرف توجہ کی۔ لاہور کے رسالے ''شبابِ اردو'' میں ان کا افسانہ۔ ''مالی کی لڑکی'' فروری ۲۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ ایک اور افسانہ ''دیوانہ'' ''شباب اردو'' کے اگست ۹۲ء کے

شمارے میں شائع ہوا۔ ۲۵ء سے ۲۹ء تک کی مدّت میں انہوں نے کچھ نہ کچھ لکھا ضرور ہوگا لیکن تحقیق کرنے والے اس کا پتہ نہیں چلا سکے۔

جنوری ۳۰ء میں 'ساقی' کا آغاز ہوا۔ چوبیس سالہ شاہد احمد ادبی اعتبار سے پختہ ہو گئے تھے۔ قلم میں توانائی آ گئی تھی۔ رسالے کی اشاعت کو انہوں نے دہلی کی زبان، تہذیب اور ثقافت کی بازیافت قرار دیا تھا۔ اُن کے بقول۔ ''ساقی بنیادی طور پر دلّی کی زبان اور ثقافت کا نقیب ہوگا''، ساقی نے یہ فریضہ بہ حسن وخوبی انجام دیا اور آہستہ آہستہ اس کے مزاج سے ادبی آفاقیت کا اظہار بھی ہونے لگا۔ دوسروں کے علاوہ خود شاہد احمد نے مغرب کے متعدد شہ کاروں کو اردو میں منتقل کر کے اپنے قارئین کی علمیت کو وسعت دی۔ اُن کی ادبی زندگی میں اس کارنامے کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اسی کارنامے کے گرداگرد ان کے دوسرے تمام کارنامے اپنا حق جتاتے ایوان ادب میں نئے نئے چراغ روشن کرتے نظر آتے ہیں۔

شاہد احمد کے کمالاتِ فن کی ابتدا اُن کے رسالے۔ ''ساقی'' سے ہوتی ہے۔ چنانچہ شاہد احمد کے کمالاتِ فن کا جائزہ بھی اسی سے شروع کیا جاتا ہے۔

ساقی (دھلوی دور)

شاہد احمد کو اللہ تعالیٰ نے دس بچے عطا فرمائے تھے۔ 'ساقی' اُن کی گیارہویں اولاد تھی۔ شاہد احمد کو اپنا یہ بچہ جی جان سے پیارا تھا۔ سینتیس برس کی عمر کو پہنچا۔ دلّی میں پھلا پھولا۔ کراچی میں وہ انداز تو برقرار نہیں رہا پھر بھی شاہد احمد کا نام روشن کیے رہا۔

'ساقی' کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لینے والے مُحققوں نے بڑی محنت اور تلاش وجستجو سے اس کی تاریخ مرتّب کی ہے۔ ڈاکٹر سیّد محمد عارف، ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز، شعیب محمد اور پروین الٰہی نے اس سلسلے میں بہت کام کیا ہے۔ ان تحقیقی جائزوں اور مطالعوں سے اردو ادب میں ساقی کے رجحان ساز کردار، ادب کے فروغ میں اس کی کوششوں اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی نشان دہی ملتی ہے۔ ساقی کا نام پہلے بھی اور آج بھی ایک ادبی لیجنڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔

'ساقی' کے اجرا کی داستان شاہد احمد، فضل حق قریشی، انصار ناصری اور صادق الخیری نے بڑے دل چسپ انداز میں بیان کی ہے۔ آگرے کا شہر۔ گرمیوں کی ایک شام۔ تاج محل کی سپیدی میں شام کی ہلکی سیاہی کا آغاز۔ جمنا کا کنارا۔ بے فکر دوستوں کی ایک ٹولی۔ طے ہُوا کہ ایک رسالہ شائع ہونا چاہیے۔ سب نے شاہد احمد کی طرف دیکھا کیونکہ رسالہ کا بار اُٹھانے کی سکت اُنہیں میں تھی۔ اُنہیں بھی کوئی تامّل

نہیں تھا۔ جیسے تلے بیٹھے تھے کہ رسالہ نکلے گا اور ضرور نکلے گا۔ آگرے سے دلّی واپس آئے۔ نام کے بارے میں مشورے ہونے لگے۔ دیوان حافظ سے فال نکالی گئی۔

جہانِ فانی و باقی فدائے شاہد و ساقی

اس سے بہتر نام اور کیا ہو سکتا تھا۔ سب نے اسے پسند کیا۔ تیاریاں ہونے لگیں۔

'ساقی' کا اجرا محض احباب کا ایک مشورہ ہی نہیں تھا بلکہ اس میں شاہد احمد کے مزاج۔ طبیعت اور ذوقِ ادب کو بھی بڑا دخل تھا۔ ان کے ماموں زاد بھائی اوسط درجے کا ایک رسالہ 'ارمغاں' شائع کر رہے تھے (بڑی حیرت کی بات ہے کہ ارمغاں میں شاہد احمد کی کوئی تحریر شائع نہیں ہوئی)۔ پھر شاہد احمد کو یہ احساس بھی تھا کہ صدیوں کے تہذیبی اور ثقافتی مرکز شاہ جہاں آباد سے ڈھنگ کا کوئی ادبی پرچہ شائع نہیں ہو رہا ہے۔ لاہور اس سلسلے میں بازی لے گیا ہے۔ دلّی کے پُرانے ادیب اور شاعر گمنامی کے گوشے میں سمٹتے جا رہے ہیں۔ ان کی یادگاریں کیسے محفوظ رہیں گی۔ دلّی کی بولی ٹھولی، طور طریقے، چٹخارے، رہن سہن اور سوچنے سمجھنے کے انداز کی نشان دہی کون کرے گا۔ ان سب کے تحفظ، فروغ اور بقا کے لیے ایک معیاری رسالے کی ضرورت تھی چنانچہ ساقی کا اِجرا وقت کی ایک اہم ضرورت تھا۔

اردو زبان میں ادبی رسالے بڑی کثرت سے شائع ہوئے ہیں۔ ہر ادیب اور شاعر ادبی رسالے کو اپنے افکارِ عالیہ کی اشاعت اور مالی منفعت کا بڑا ذریعہ سمجھتا ہے۔ بے شمار ادیبوں اور شاعروں نے بڑی حوصلہ مندی اور جوش کے ساتھ ادبی رسالے شائع کیے۔ کسی کے چند شمارے شائع ہوئے۔ بعض صرف ایک ہی اشاعت کے متحمل ہو سکے۔ بعض کی اُٹھان بہت اچھی تھی لیکن وہ مالی پریشانیوں کا شکار ہو گئے۔ دراصل ادبی رسالے کی اشاعت گھاٹے کا سودا ہے۔ ذوقِ ادب کی تسکین اور فروغ کے ساتھ ساتھ ان کا ایک کاروباری پہلو بھی ہے جو نہایت اہم ہے لیکن ادیب اور شاعر اس پہلو پر نگاہ نہیں رکھتے اور ناکام رہتے ہیں۔ شروع شروع میں پرچہ نقصان میں چلتا ہے۔ خریدار مُیسّر نہیں آتے۔ سرپرستی نہیں ہوتی۔ اشتہاروں کے حصول کی کوئی کوشش نہیں ہوتی۔ ایسے میں بھلا نہیں بیٹھے گا تو اور کیا ہوگا۔ ادھر پاس پلّے کا اندوختہ ختم اور ادھر رسالہ بھی بند۔ نجانے کتنے ادیب اور شاعر اسی شوق میں قلاش ہو گئے۔ ساقی کے سلسلے میں شاہد احمد اور ان کے احباب کو اس صورت حال کا کوئی اندازہ نہیں تھا کیونکہ باپ کا ترکہ موجود تھا۔ جائداد کے کرائے کی آمدنی تھی۔ انہوں نے بھی دوسروں کی پیروی میں ساقی کے روپ میں اپنے ادبی ذوق و شوق کا اظہار کیا۔ باقی کسی پہلو پر نظر نہیں رکھی۔

ساقی کا اجرا بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ شہر میں جا بجا پوسٹر چسپاں کیے گئے۔ اہلِ شاہ جہاں آباد کو مژدہ سنایا گیا کہ "پہلی جنوری ۳۰ء سے مے گسارانِ ادب کو اپنے جرعاتِ بوقلموں سے کیف اندوز کرنے والا دارالسلطنتِ دہلی کا علمی و ادبی جریدہ 'ساقی' جام بکف۔ مُنصہ شہود پر نمودار ہوگا۔" یکم جنوری کو ساقی

نمودار ہوا۔ جام بکف۔ ساغر بدست۔ دلّی کی رفعت کے شاہد قطب مینار کی شبیہ سے مزین دیدہ زیب سرورق۔ پس منظر میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پُر انوار کا سایہ نکھ سکھ سے درست۔ سجا سجایا۔ افکارِ عالیہ سے لبریز اثر آفریں ادبی مُرقّع۔ لوح پر اقبال کا شعر۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

میں نے بچپن میں ساقی کی لوح پر یہ شعر دیکھ کر یاد کر لیا۔ ایک دفعہ میں نے ایک بزرگ کے سامنے یہ شعر اسی طرح پڑھا تو وہ کہنے لگے۔ ''شدّو بھائی نے تحریف میں اقبال کو بھی نہیں چھوڑا۔ شعر صحیح یاد کرو۔ ساقی کی روش میں لطف کے ساتھ ستم بھی ہوتا ہے۔ صرف لطف نہیں ہوتا۔''

فہرستِ مضامین کو جرعات کا نام دیا گیا تھا۔ ابتدا مولوی نذیر احمد کی مختصر سی نثری حمد و نعت سے ہوئی تھی جس کے لیے صفحہ دو مخصوص کیا گیا تھا۔ اس کے بعد مولوی نذیر احمد کی تصویر تھی اور صفحہ تین سے شاہد احمد کا اداریہ ''نگاہِ اولین'' کے عنوان سے شامل تھا۔ یہ اداریہ آٹھ صفحات پر مشتمل تھا۔

ساقی کا اوّلین اداریہ شاہد احمد کی قوتِ تحریر کا بڑا اچھا نمونہ ہے۔ سنجیدہ، متین، پُر وقار، فکر انگیز اور عصری تقاضوں کا حامل۔ اس اداریے کے مطالعے سے یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ کسی ایسے نوجوان انشا پرداز کی تحریر ہے جس نے اس کوچے میں پہلا قدم رکھا ہے۔

شاہد احمد نے ابتدا میں اردو زبان کی ترقی کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ''اب وہ زمانہ دور نہیں جب کہ ہم اپنی زبان کو ایک علمی زبان کہہ سکیں گے'' اس کے بعد ''زبانِ دہلی'' کی سرفرازی کا تذکرہ کیا ہے، لکھنو کی لطافتِ زبان کو تسلیم کیا ہے اور اس بیانِ واقعی کے بعد رسالوں کے اجرا کو زبان کی ترقی کا بڑا اہم ذریعہ قرار دیا ہے اور شکوہ کیا ہے کہ ادبی معیار کے گر جانے سے العصر، ادیب، اور نقاد جیسے رسالے بند ہو گئے ہیں۔ دلّی میں رسالے جاری ہیں لیکن وہ بھی بدمذاقی کا شکار ہیں۔ اس بدمذاقی کو دور کرنے کے لیے ساقی کا اجرا کیا جا رہا ہے جو باہر کے پرچوں سے بیس نہیں تو انیس بھی نہ رہے۔ ''ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ساقی ایک ایسا جامعہ ہو کر ہر شخص اُس کے مطالعے سے محظوظ ہو۔''

اس سنجیدہ اور متین تمہید کے بعد پہلے شمارے کے مضامین اور مضمون نگاروں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ نثر نگاروں میں قاری سرفراز حسین، تمکین کاظمی، مرزا محمود بیگ، انصار ناصری، آغا محمد اشرف اور قاضی عباس حسین شامل تھے۔ شعرا میں جوش، گرامی، حیدر دہلوی، فراق دہلوی اور حافظ غازی پوری کے نام ملتے ہیں۔ یہ شمارہ چونسٹھ صفحات پر مشتمل تھا اور سالانہ چندہ تین روپے اور ایک شمارے کی قیمت پانچ آنے تھی۔ سالانہ چندے اور ایک شمارے کی قیمت اُس زمانے کے معیار سے بھی بہت کم تھی۔ اس ارزانی سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ساقی کی اشاعت سے شاہد احمد کا مقصد پیسہ کمانا نہیں تھا بلکہ درحقیقت

ان مقاصد کی تکمیل تھی جن کا اظہار انہوں نے نگاہِ اولیں میں کیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ساقی آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ حیثیت مستحکم ہوگئی۔ ادبی حلقوں میں نام ہوگیا۔ شاہد احمد پُرانے اور نئے ادیبوں کا ایک شان دار حلقہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ ان کی خاندانی وجاہت اور ادبی وراثت نے ساقی کو استحکام بخشنے میں بڑی مدد کی۔ پھر ان کا اپنا ذوقِ ادب اور اچھی تحریروں کی تلاش وجستجو۔ ساقی میں شائع ہونے والی ہر تحریر کا غور وفکر اور ادارتی ذمہ داری سے جائزہ۔ سبھی ساقی کی کامیابی میں معاون ثابت ہوئے۔ سب سے بڑھ کر اُن کا کُھلا ہاتھ اور اخراجات کی طرف سے بے فکری کا بھی اس کامیابی میں بڑا حصہ تھا۔ مضامین کا معاوضہ دیتے تھے سرمائے کی موجودگی نے ان کی راہ میں کوئی مشکل حائل نہیں ہونے دی۔ بڑے بھائی منذر احمد نے جو خاندانی آمد وخرچ کے نگراں تھے، دبے لفظوں میں ٹوکا بھی مگر شاہد احمد نے کہا۔ ''تمہیں شکار کا شوق ہے۔ میرا شوق رسالہ ہے۔ اخراجات میرے ترکے کی رقم میں ڈال دو۔''

ساقی بڑی شان سے شائع ہوتا رہا۔ جولائی ۳۰ء میں افسانہ نمبر شائع ہوا۔ نومبر ۳۰ء میں دلّی نمبر شائع ہوا۔ اپریل ۳۱ء میں ظریف نمبر شائع ہوا۔ جولائی میں پھر افسانہ نمبر اور اکتوبر میں دلّی نمبر۔ نمبروں کی لائن لگ گئی جنوری میں سالنامے کی روایت مستحکم ہوگئی۔ بڑی پذیرائی ہوئی۔ ساقی کے عام شمارے اور خاص نمبر دونوں ادب کا سنگھار سمجھے جانے لگے۔

ڈھائی تین سال اسی سرخوشی میں گزر گئے۔ پھر ایک دن بڑے بھائی منذر احمد نے شاہد احمد کو طلب کیا۔ یہ تو نہیں کہا کہ گھر پھونک تماشہ کب تک دیکھتے رہو گے۔ چیک بُک نکال کر دے دی اور بتایا کہ پچیس ہزار میں سے کاغذ اور پریس والے کی ادائیگی کے بعد صرف پانچ سو روپے باقی بچے ہیں۔ شاہد احمد کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ بڑے پریشان ہوئے لیکن وہ ہار ماننے والے انسان نہیں تھے۔ یہ ان کی خاندانی سرشت کے خلاف تھا۔ حوصلہ مند تھے۔ جہدِ مسلسل کے قائل تھے۔ چنانچہ انہوں نے حساب کتاب اپنے ہاتھ میں لیا سارے اُلفتے موقوف۔ لوٹنے والے ملازم رُخصت۔ لاکھ کا گھر خاک کرنے والے بزرگ سے کنارہ کشی۔ اللہ تعالیٰ نے حوصلہ مند شاہد احمد پر فضل کیا۔ رسالے اور کتابوں کی نَوٹ پلٹ میں دو ڈھائی ہزار روپے ماہوار کی آمدنی ہونے لگی روپے کی ریل پیل ہوگئی۔ ساقی اُسی شان اور دھوم دھام سے اگست ۱۹۴۷ء تک دلّی سے شائع ہوتا رہا۔ اس کا نام اردو ادب کی سربلندی کا نشان بن گیا۔

دلّی میں شاہد احمد نے ساقی کے متعدد خصوصی نمبر شائع کیے۔ خان بہادر میر ناصر علی کی وفات پر میر ناصر علی نمبر، عظیم بیگ چغتائی نمبر، جاپان نمبر، راشد الخیری نمبر اور جولائی ۳۴ء میں افسانوی ادب کا ایک نادر تجربہ، ایک ہی پلاٹ پر بارہ افسانہ نگاروں کے افسانے، پلاٹ بڑا دل چسپ تھا جو افسانہ

نگاروں کے لیے ایک چیلنج بن گیا۔ پلاٹ یہ تھا۔

''ایک شخص۔ غیر متعارف خاتون سے خط و کتابت۔ رومانی فضا اور دل بستگی۔ ایک حسینہ سے تعارف۔ محبت۔ ازدواج۔ مسرت وانبساط۔ شکر رنجیاں۔ کشیدگی۔ بیزاری۔ ایام گزشتہ کی یاد۔ سابقہ مراسلت کی تجدید۔ تحصیل سکون۔ اتفاقیہ طور پر انکشافِ حقیقت۔ مراسلہ نگار خاتون کی اصل حقیقت شریکِ حیات۔''

متعین پلاٹ پر افسانہ لکھنا۔ مقابلے کی سی کیفیت کا پیدا ہونا۔ ایک جرات مندانہ اور انوکھا تجربہ تھا۔ یہ تجربہ اُس دور میں جب افسانہ اپنے رومانوی دور سے گزر رہا تھا اور پلاٹ وغیرہ کی پابندی کا حامل تھا یہ نیا تجربہ ادب کے قارئین کو بہت پسند آیا۔ شاہد احمد کی اس جدّت کو بہت سراہا گیا اور ان کے اس انوکھے انداز کا پُر جوش خیر مقدم ہوا۔ بعد میں ان بارہ افسانوں میں سے سات افسانے ایک مجموعے کی شکل میں شائع کیے گئے۔ نام تھا۔ ''سات ستارے'' یہ مجموعہ اردو افسانے کے ارتقا کے مطالعے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ۳۴ء میں اردو افسانے کا مزاج کیا تھا۔ افسانہ نگار زندگی اور ماحول کے بارے میں کس طرح سوچ رہے تھے۔ رومان اور ازدواج کے تصادم میں زندگی کیسا تلخ روپ اختیار کر لیتی ہے۔ حقیقت پسندانہ فکر اور انداز کی راہ ہموار ہو رہی تھی۔ یہ مجموعہ اردو افسانے کے ارتقائی سفر میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاہد احمد کی یہ ادبی کاوش اردو فکشن میں ساقی کی حیثیت کو مستحکم کرنے میں بہت کامیاب ثابت ہوئی۔

ساقی کے اجرا کے وقت اردو کے ادبی رسالوں میں لاہور سے شائع ہونے والے رسالے ہمایوں، نیرنگ خیال، ادبی دُنیا اور عالم گیر مقبول تھے۔ ہمایوں میاں بشیر احمد کا صاف ستھرا پرچہ تھا۔ 'نیرنگِ خیال' حکیم یوسف حسن شائع کرتے تھے۔ اُنہیں لاہور کے ادیبوں کا خصوصی تعاون حاصل تھا۔ پطرس، تاثیر، امتیاز علی تاج اور بعض دوسرے اہل قلم نیرنگ خیال کے معاونین میں تھے۔ اس کے جہازی سائز کے خاص نمبر بھی دلکش ادبی مُرقّعے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ''ادبی دُنیا'' مولانا تاجور نجیب آبادی کا رسالہ تھا جسے بعد میں مولانا صلاح الدین احمد نے خرید لیا تھا۔ ''عالمگیر'' اوسط درجے کا رسالہ تھا۔ اس کی شہرت خاص نمبروں کی وجہ سے تھی۔ لکھنو سے علم وادب کا گنجینہ 'نگار' نیاز فتح پوری کی ادارت میں شائع ہو رہا تھا۔ ان تمام رسالوں کا انفرادی انداز تھا۔

ہمایوں نئی فکر کا حامل تھا۔ افسانوی ادب کے فروغ میں بھی اس کا کردار نمایاں ہے۔ نیرنگِ خیال لاہور کے جواں فکر ادیبوں کا ترجمان تھا۔ اس نے بھی اردو افسانے کے فروغ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ حکیم یوسف حسن پرچے پر بڑی محنت کرتے تھے اور خصوصی شماروں میں پُرانے اور نئے لکھنے والوں کی تخلیقات بڑی محنت اور سلیقے سے یک جا کرتے تھے۔ اردو کے ادبی رسالوں کی تاریخ میں نیرنگ خیال

کا نام ہمیشہ نمایاں رہے گا۔

ادبی دُنیا کو مولانا صلاح الدین نے اپنے ادبی ذوق اور ادارتی سلیقے سے بڑی شہرت دی مولانا ادیب گرادیب تھے۔ انہوں نے نئے لکھنے والوں بالخصوص افسانہ نگاروں کی تربیت پر بڑی محنت کی تھی۔ اُن کا یہ اندازِ تربیت وتنقید ساری زندگی جاری رہا۔

عالم گیر نے ہمایوں، نیرنگِ خیال اور ادبی دُنیا کی طرح نئے لکھنے والوں کی تربیت تو نہیں کی تاہم اس کا بھی ایک انداز تھا جسے قارئین پسند کرتے تھے۔

نگار علمی اور ادبی دونوں جہتوں کا حامل تھا۔ علمی مضامین، تنقیدی مضامین، بابِ استفسارات اور اس علمی پہلو کے ساتھ ساتھ افسانے، غزلیں اور نظمیں۔ نگار کے خاص نمبروں کی روایت بھی بڑی مستحکم تھی۔ مومن نمبر، مصحفی نمبر، نظیر نمبر، شعرا کا انتخابی نمبر، تنقید نمبر اردو تنقید کی روایت میں بڑے نمایاں ہیں۔ نیاز فتح پوری اپنے رسالے پر چھائے ہوئے نظر آتے تھے۔ انہوں نے لکھنے والوں کی ایک کہکشاں مرتب کر لی تھی اور بعض اوقات پورا رسالہ خود مرتب کر دیتے تھے۔

ادبی رسالوں کے اس ماحول میں ساقی کی حیثیت اور اہمیت کو منوانے کے لیے شاہد احمد کو غیر معمولی محنت کرنی پڑی۔ اُنہیں افسانے سے گہری دل چسپی تھی ان کے ادبی ذوق کا نقطہ آغاز بھی افسانہ ہی تھا۔ اس لیے انہوں نے افسانے کے فروغ اور ساقی میں اعلیٰ درجے کے افسانوں کی اشاعت کو خصوصی اہمیت دی۔ ان کا دوسرا شوق یہ تھا کہ اردو میں مغرب کے شاہ کار افسانوں اور مغربی کلاسیک کے اعلیٰ اور مستند تراجم پیش کیے جائیں تا کہ عام قاری کو یہ اندازہ ہو سکے کہ مغرب کی فکر، انداز اور ادبی رعنائی کو اہمیت کیوں دی جاتی ہے اور اس کا مطالعہ کیوں ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب شناسی کے لیے دوسری زبانوں کے ادب اور بالخصوص کلاسیک سے واقفیت ضروری ہے۔ پچھلی صدی کے نصف اوّل تک رسمی تعلیم کی ابتدا فارسی کلاسیک کے مطالعے سے ہوتی تھی۔ پھر فارسی کی جگہ انگریزی کو حاصل ہوتی گئی۔ طلبہ اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی زبان اور ادب کا مطالعہ کرتے تھے لیکن انگریزی کلاسیک کا مطالعہ صرف اعلیٰ جماعتوں ہی میں ہوتا تھا۔ یورپ کے کلاسیک، یونانی اور دیگر یورپی زبانوں کے ادبی شاہ کاروں تک رسائی مشکل سمجھی جاتی تھی۔ شاہد احمد نے ساقی کے ذریعے سے اس مطالعے کی ابتدا کی۔ بذاتِ خود ترجمے کیے اور ترجمے کے سلسلے میں اُنہیں اردو کے نامور مترجم مولوی عنایت اللہ ابن مولوی ذکاء اللہ کا تعاون حاصل ہو گیا۔ مولوی عنایت اللہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ حیدر آباد دکن میں دارالترجمہ کے ناظم ہو گئے تھے۔ ان کے زمانۂ طالب علمی میں سرسیّد نے اُن سے آرنلڈ کی ایک کتاب Preachings of Islam کا ترجمہ کروایا تھا۔ ترجمہ دیکھ کر سرسیّد بہت خوش ہوئے اور مولوی ذکاء اللہ کو خط لکھا کہ ''اب تمھیں اردو اپنے بیٹے سے سیکھنی چاہیے۔'' مولوی عنایت اللہ نے ساقی

کے لیے مغربی کلاسیک کے بڑے اعلیٰ ترجمے کیے۔ شاہد احمد فرمائش کرتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب حیدر آباد سے سبک دوش ہو چکے تھے۔ وقت ہی وقت تھا لہٰذا ساری توجہ تراجم پر مرکوز تھی۔

انگریزی اور یورپی ادب کے تراجم ساقی کا طرّہ امتیاز تھے۔ شاہد احمد اور ساقی کی یہ ادبی خدمت اردو ادب میں یادگار حیثیت رکھتی ہے۔

ساقی کے ادب میں دلّی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ دلّی صدیوں سے ہندوستان کا دارالحکومت چلا آ رہا تھا۔ سارے برصغیر میں اسے اپنی خوبصورتی، تاریخی آثار، تہذیب اور ثقافت کی بنا پر جو انفرادیت حاصل تھی وہ برصغیر کے کسی اور شہر کے حصے میں نہیں آئی۔ اہلِ دہلی کا رہن سہن۔ روز مرّہ اور محاورہ، سارے برصغیر میں مستند سمجھا جاتا تھا۔ قلعۂ مُعلّٰی کی زبان اور روایات کا شور تھا۔ شاہد احمد کو دلّی سے بڑی محبت تھی۔ ساقی کے اجرا کے مقاصد میں ایک مقصد دہلی کی ثقافت اور زبان کی بازیافت اور تحفظ بھی تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ساقی کے دلّی نمبر شائع کیے جن کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ انہوں نے دلّی سے متعلق خصوصی شماروں میں دلّی کے پُرانے ادیبوں کو ڈھونڈ نکالا اور ان سے مضامین حاصل کیے۔ ساقی کے اجرا کے وقت خواجہ ناصر نذیر فراق بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ بیمار اور نادار بھی تھے۔ شاہد احمد نے اُنہیں بڑی محبت سے لکھنے پر مجبور کیا۔ یہ وہی فراق تھے جو شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے۔ آزاد نے ان کی ایک چھوٹی سی کتاب ''سات طلاقتوں کی کہانی'' پڑھ کر اُنہیں لکھا تھا کہ ''تمھاری سات طلاقتوں کی کہانی پڑھ کر میرے پیٹ میں ہنسی کی مارے بل پڑ گئے۔ غضب خدا کا کس بلا کی گیگلی تھیں۔'' فرہنگِ آصفیہ والے سیّد احمد دہلوی ایک دن فراق سے ملنے آئے۔ کہنے لگے۔ ''بھائی صاحب! کمال کیا ہے۔ اتنے چھوٹے سے افسانے ''اختر محل'' میں اتنے دلّی کے ٹھیٹھ محاورے آپ نے بھر دیے ہیں کہ مجھ کو حیرت ہے، میں تو آپ کو سلطانِ زبانِ اردو کہتا ہوں۔'' سیّد احمد اُنہیں خطوط میں 'سلطانِ زبانِ اردو' ہی لکھا کرتے تھے۔ ساقی کے دلّی نمبر میں اسی زبان و بیان کی جھلک نظر آتی تھی۔

ساقی کے چار دلّی نمبر شائع ہوئے۔ ان چاروں کے لیے شاہد احمد کو جو پاپڑ بیلنے پڑے ہوں گے اب ہم ان کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تمام نمبر بڑے قیمتی ثقافتی اور ادبی سرمایہ ہیں۔ ان سے شاہد احمد کی وطن دوستی کے ساتھ ساتھ ثقافتی سرمائے کے تحفظ کا احساس بھی اُبھرتا ہے۔

اپنے دوسرے معاصرین کی طرح ساقی کو مُلک میں پاکیزہ ادب کے فروغ کا دعویٰ تھا لیکن اُس کی یہ کوشش ایک بنیادی مثلث کی پابند ہے۔ افسانہ، تراجم اور ماضی کی بازیافت۔ عام خیال یہی ہے اور تنقید نگاروں نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے کہ اردو کے ادبی رسائل میں ساقی۔ افسانے، تراجم اور ماضی کی بازیافت میں اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتا ہے۔

ساقی نے ابتدا ہی سے افسانوں کی اشاعت پر خصوصی توجہ کی تھی۔ دلّی کے سترہ سالہ دورِ اشاعت میں

شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر یا اہم افسانہ نگار ہو جو ساقی کی محفل میں شریک نہ ہوا ہو۔ ساقی نے پُرانے افسانہ نگاروں کو سرآنکھوں پر جگہ دی اور نئے افسانہ نگاروں کی حوصلہ افزائی، تربیت اور ادبی رہ نمائی کی۔ شاہد احمد نے ساقی کے لیے کمتر درجے کی چیز کو قبول نہیں کیا۔ صادق الخیری نے اُنہیں ساقی کے لیے ایک افسانہ بھیجا۔ انہوں نے افسانہ واپس کرتے ہوئے اُنہیں لکھا

''آپ اس سے بہتر افسانہ لکھ سکتے ہیں تو پھر میں ساقی کے لیے کمتر چیز کیوں قبول کروں۔ دوسرا افسانہ بھیجئے۔''

اس انکار میں تہدید اور تعریض نہیں۔ حوصلہ افزائی ہے کہ آپ کو بہتر سے بہتر چیز لکھنی چاہئے۔ نفسیاتِ حیوانی کے ماہر، جانوروں کی خوبو کے شناسا سیّد رفیق حسین کی افسانہ نگاری شاہد و ساقی ہی کے حسنِ توسط سے پروان چڑھی۔ شاہد احمد نے لکھا ہے کہ ایک دن ڈاک میں ایک مسودہ موصول ہوا۔ بے ڈھنگا اور غلط سلط لکھا ہوا۔ دل نے کہا۔ اسے فوراً واپس کر دینا چاہئے لیکن یہ بات ادارتی اصول کے خلاف تھی۔ مسوّدہ پڑھا تو احساس ہوا کہ ایک ناتراشیدہ ہیرا ہاتھ آ گیا ہے۔ صحیح تراش خراش ہوگی تو اس کی روشنی سے نجانے کتنے گوشے مُنوّر ہو جائیں گے۔ اس طرح رفیق حسین اردو افسانے میں اپنی طرز کے منفرد افسانہ نگار بن گئے۔

شاہد احمد کے اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساقی میں شائع ہونے والی ہر تحریر بڑے غور سے پڑھتے تھے۔ رسالے کے پروف بھی وہ خود ہی پڑھتے تھے۔ کراچی میں بھی ان کا یہی دستور رہا— موصول ہونے والے مضامین کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے۔

''ساقی کے لیے ایک مہینے میں اوسطاً ایک ہزار مضامین نظم و نثر موصول ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب کے سب قابلِ اشاعت نہیں ہوتے اور ان میں معدودے چند ساقی کے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے اُن میں بھی انتخاب کرنا پڑتا ہے۔''

اس محنت کو غیر معمولی ہی کہا جا سکتا ہے۔ شاہد احمد مضامین کے انتخاب میں اپنے حلقۂ احباب سے کوئی مدد نہیں لیتے تھے۔ یہ سارا کام وہ خود ہی کرتے تھے اور پوری ادارتی ذمہ داری سے کرتے تھے۔

سلیقہ مند مدیر اپنے مضمون نگاروں کے نفسِ مضمون کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر بھی نظر رکھتا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے ساقی کے لیے افسانہ بھیجا تو اس میں یہ فقرہ بھی تھا کہ بچہ ہونے کے بعد اس عورت کے پیٹ پر شکنیں پڑ گئیں۔ شاہد احمد نے شکنیں کا لفظ بدل دیا۔ اس کے بجائے 'چُرسیں' کا لفظ رکھ دیا۔ منٹو نے اعتراف کیا کہ شاہد احمد نے بڑی صحیح اصلاح کی ہے۔ اس کڑی انتخابی آزمائش کی وجہ سے ساقی میں شائع ہونے والے افسانے قابلِ قدر ہوتے تھے۔

اردو افسانے کے فروغ میں شاہد احمد اور ساقی کا کردار بڑی اہمیت رکھتا ہے، ساقی کی اشاعت کا آغاز

ہوا تو اردو افسانہ رومانوی کہانی کے دور سے گزر رہا تھا۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے داستان کے تین ارکان بیان کیے ہیں۔ حسن و عشق، عیاری اور رزم و بزم۔ ۱۹۳۰ء میں لکھنے والے عام اردو افسانے کے ارکانِ ثلاثہ حسن و عشق، مصائب اور مناسب انجام تھے۔ یہ صحیح ہے کہ پریم چند نے اس عام ڈگر سے ہٹ کر 'سوزِ وطن' اور 'دنیا کا سب سے انمول رتن' جیسے افسانے بھی لکھے تھے اور یلدرم نے رومانوی یلغار کی اس عام فضا سے ہٹ کر فکری بالیدگی کی کوشش بھی کی تھی مگر عام فضا یہی تھی۔ چنانچہ ساقی کے ابتدائی دور میں بالعموم اسی انداز کے افسانے ملتے ہیں لیکن جلد ہی ساقی کے افسانہ نگاروں کے ہاں زندگی کے گہرے تجربے اور نفسیاتِ انسانی کے فکر انگیز مطالعے بھی نظر آنے لگے۔

شاہد احمد نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک ساقی میں شائع ہونے والے افسانوں کا ایک انتخاب ''ریزۂ مینا'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ یہ انتخاب پچاس افسانوں پر مشتمل تھا اس انتخاب میں بزرگ ادیبوں کے قلم سے نکلی ہوئی کہانیاں بھی ہیں اور جدید انداز کے افسانے بھی۔ مولانا اسلم جیراج پوری کی کہانی ''خزانچی کی بیٹی'' بھی اس انتخاب میں نظر آتی ہے۔ میر باقر علی کی داستان بھی ہے مولانا راشد الخیری کا افسانہ 'یونس اور صادقہ' بھی ہے اور پروفیسر مرزا محمد سعید کا افسانہ 'شکست کی آواز' بھی شامل ہے۔ یہ سب اس عہد کے بزرگ تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، سلطان حیدر جوش، آلِ احمد، سیّد امتیاز علی تاج، اعظم کریوی، رافعی اجمیری، تاکارہ حیدر آبادی، حجاب امتیاز علی، پروفیسر احمد علی، عظیم بیگ چغتائی، پریم پجاری، سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، عصمت چغتائی اور سیّد رفیق حسین نئے افسانے کی آواز تھے۔ احمد علی کا افسانہ 'شکنتلا' منٹو کا افسانہ 'دیوانہ شاعر'، عصمت چغتائی کا 'نیرا'، ممتاز مفتی کا 'بیگانگی' اور رفیق حسین کا 'کفارہ' اردو افسانے کے بدلتے ہوئے رجحانات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان رجحانات کو تقویت دینے، مقبول بنانے اور قارئین میں ان کی پذیرائی کا جذبہ پیدا کرنے میں شاہد احمد اور ساقی کا کردار بہت اہم ہے۔

''ریزۂ مینا'' ساقی میں شائع ہونے والے دس برس کے افسانوں کا انتخاب ہی نہیں افسانے کے نئے رجحانات کو سمجھنے اور غور کرنے کے لیے ایک رنگا رنگ مُرقّع بھی ہے۔ دس برس میں کیسی اہم اور خوش گوار تبدیلی ہوئی۔ افسانہ رومان کی سطح سے اُٹھ کر برصغیر کے عوام کی زندگی کے عام لیکن فکر انگیز پہلوؤں کا ترجمان بھی بن گیا۔ یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہد احمد اور ساقی کی کوششوں سے اردو افسانے میں جو انقلاب آیا وہ بڑا خوش گوار اور افسانے کی صنف کو زندگی کا بھرپور ترجمان بنانے میں بہت مددگار ثابت ہوا۔ شاہد احمد کی حوصلہ افزائی سے افسانہ نگاروں کے فن نے ترقّی کی اور ان کے ادبی مشوروں سے نئے افسانہ نگاروں نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔

افسانوں کے انتخاب میں شاہد احمد کا معیار بہت بلند تھا۔ ساقی کراچی کے دور میں ایک نئے افسانہ

نگار سلطان جمیل نسیم نے اپنا افسانہ ساقی میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ شاہد احمد نے افسانہ واپس کر دیا۔ دوسرا، تیسرا، چوتھا، یہاں تک کہ سترہ افسانے واپس ہوئے اور پھر اٹھارواں افسانہ۔ 'چکّر' ساقی میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ نگار کی بڑی کڑی آزمائش تھی لیکن وہ اپنی مستقل مزاجی کی وجہ سے آزمائش میں کامیاب ہوا اور اُن کا فن بھی نکھر گیا۔

دس برس کے مختصر عرصے میں افسانے کی تکنیک میں جو تبدیلیاں ہوئیں، مغربی اثرات جس طرح نمایاں ہوئے اور افسانے نے اردو ادب میں جس کرّ و فر سے اپنی حیثیت منوالی اُس سب کے پس منظر میں شاہد احمد اور ان کے ہم عصر مولانا صلاح الدین احمد کے نام لیے جاتے ہیں۔ دونوں کی حیثیت مُسلّم ہے لیکن شاہد احمد نے ۳۰ء سے ۶۷ء تک جس طرح اردو افسانے کو پروان چڑھایا ہے وہ ان کی اولیت کا ثبوت ہے۔

شاہد احمد نے افسانے کے فروغ اور افسانہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے ادبی انعام کی طرح بھی ڈالی۔ ۱۹۴۰ء میں یہ اعلان ہوا کہ افسانہ نمبر میں شائع ہونے والے بہترین افسانے پر سو روپے انعام دیا جائے گا۔ ۱۹۴۰ء میں جب سونا تیس روپے تولہ تھا سو روپے کی رقم بڑی رقم تھی۔ پھر یہ طے ہوا کہ یہ انعام دس مساوی حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ بعض افسانہ نگاروں نے انعام سے دست برداری ظاہر کی۔ بعض نے اسے قبول کیا۔ قبول کرنے والوں میں کرشن چندر، شاہد لطیف، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی ظفر قریشی، اشرف صبوحی اور ساون مل ترکھا شامل تھے۔ ان دس افسانہ نگاروں کو انعام دے کر ساقی نے ایک بڑی خوش آیند روایت کا آغاز کیا۔ ادیب کسی انعام کے بھوکے نہیں ہوتے۔ ستائش اور صلے کی پروا بھی نہیں کرتے۔ ان کا سب سے بڑا انعام خود اُن کی ذہنی اور روحانی تسکین ہے۔ لیکن اگر کوئی انعام ہاتھ آ جائے تو اسے اپنے لیے باعثِ اعزاز جانتے ہیں۔

آج ہم حیرت سے اس بات پر غور کرتے ہیں کہ کرشن، بیدی، منٹو، اشک، عصمت اور قاسمی جیسے نامور فن کاروں نے اتنے معمولی انعام کیسے قبول کر لیے۔ روپے کی قدر کے تیز رفتار اضافے کے پیش نظر عین ممکن ہے کہ ہماری آئندہ نسل ہمارے پوتے اور نواسے اس بات پر ناک بھوں چڑھائیں کہ عجیب لوگ تھے، پچاس ہزار کا معمولی انعام قبول کر لیتے تھے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ اصل چیز اعزاز ہے۔ دلّی میں بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ مفتی صدرالدین آزردہ، مفتیٔ عدالت تھے۔ انگریزی حکومت سے بہت معقول تنخواہ ملتی تھی۔ بڑا کرّ و فر تھا اور غالباً پانچ دس روپے کا وظیفہ دربار شاہی سے بھی مُقرّر تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کسی منشی کی غفلت سے مفتی صاحب کا وظیفہ رُک گیا۔ انہوں نے فوراً بارگاہ شاہی میں معروضہ پیش کیا اور وہ وظیفہ بحال ہوا۔ رقم کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ مسئلہ اعزاز کا تھا۔ اعزاز بحال رہنا چاہیے۔

اگر کوئی صاحب نظر ان انعام پانے والے افسانوں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ مرتب کر دے تو یہ ایک بڑا اچھا علمی کام ہوگا۔ ۴۰ء میں اردو افسانہ کس منزل سے گزر رہا تھا، افسانے کے رجحانات کیا تھے،

افسانے کی تکنیک میں کیا تبدیلیاں ہوئی تھیں اور انعام پانے والے اپنے افسانوں میں اپنی انفرادیت کو نمایاں کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے تھے اور اس ساری ادبی اور علمی تگ ودو میں شاہد احمد اور ساقی کا کیا حصّہ تھا وغیرہ وغیرہ۔

انعام پانے والوں میں ایک نام 'ساون مل ترکھا' کا بھی تھا۔ ساقی میں ان کے دو افسانے شائع ہوئے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے لکھنا ترک کر دیا یا کسی اور طرف متوجہ ہو گئے۔ بہر حال یہ شاہد احمد اور ساقی کی ایک اعلیٰ دریافت تھے۔ ادبی تحقیق ان کی بازیافت کی بھی منتظر ہے اور ان کے علاوہ بھی کچھ ایسے ہی افسانہ نگار ہوں گے۔

افسانے کے فروغ میں شاہد احمد کی یہ کوشش بھی بہت اہم ہے کہ انہوں نے مغربی ادب کے شاہ کاروں کو اردو میں منتقل کرنے کا مستقل بندوبست کیا۔ اس سلسلے انہوں نے مولوی عنایت اللہ کی خدمات سے جو استفادہ کیا اس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ انہوں نے خود بھی ترجمے کیے دوسروں کو بھی اس طرف مائل کیا۔ ترجمے کا کام وہ زندگی بھر کرتے رہے۔ مولوی عنایت اللہ حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ سے سبک دوش ہو چکے تھے۔ دہرہ دون کے پُر فضا مقام کو قیام کے لیے منتخب کیا تھا۔ اکیلے رہتے تھے۔ شادی وادی کا چکّر سرے سے پالا ہی نہیں تھا۔ فرصت بہت تھی۔ شاہد احمد نے اُنہیں مغربی کلاسیک کے ترجمے پر لگا دیا۔ شیکسپیر کے ترجمے کیے۔ دانتے کے 'انفرنو' کا ترجمہ کیا۔ فلابیر کی 'سلامبو' اور بعض دوسری کتابوں کا ترجمہ کیا۔ کلاسیک کے علاوہ انہوں نے شاہد احمد کی فرمائش پر رائیڈر ہیگرڈ کے مقبول ناول ''مورننگ اسٹار'' کا ترجمہ ''نجم السحر'' کے عنوان سے کیا۔ اس ناول کے بعض اجزا ساقی میں شائع بھی ہوئے تھے۔ مورننگ اسٹار'' کا سیدھا سادا اردو ترجمہ صبح کا ستارہ ہوتا لیکن نجم السحر مولوی صاحب کی ادبی عظمت کا نشان ہے۔ یہ ساری کوشش اردو فکشن کے قاری کے ذہن کو وسعت دینے کی کوشش بھی تھی اور افسانہ نگاروں کو مغربی فکشن کے کمالات سے آگاہ کرنا بھی تھا۔ شاہد احمد نے بذاتِ خود مغربی فکشن کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ اس مطالعے سے ان کے تخلیقی سلیقے اور ہنرمندی میں اضافہ ہوا۔ انہوں نے ساقی کے دہلوی دور میں مغربی فکشن کے بعض شاہ کاروں کو خود بھی اردو میں منتقل کیا تھا۔ ان میں پھانسی، نرگس جمال، پروین وثریا اور فاؤسٹ کا شمار اردو فکشن میں مستند تراجم کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ مارس میٹرلنک شاہد احمد کا پسندیدہ مصنف تھا اس لیے انہوں نے اس کی دو کتابوں کو نرگسِ جمال اور پروین وثریا کے نام سے اردو میں منتقل کیا تھا۔ اگر غور کیا جائے تو شاہد احمد اور ساقی اردو فکشن میں ترجمے کی روایت کے بہترین امین ہیں۔

شاہد احمد نے ساقی میں منظوم افسانوں کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا تھا۔ ساقی کے افسانہ نمبروں میں آغا شاعر کا منظوم افسانہ۔ ''پوشیدہ''۔ جوش ملیح آبادی کا ''سونے کی تلوار'' مجاز کا افسانہ ''نورا''

جاں نثار اختر کا ''گرلس کالج کی لاری'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مجاز کی نظم ''نورا'' میں ایک اچھے افسانے کی خصوصیات ملتی ہیں۔ آخری اشعار کا تاثر ایک کامیاب افسانے کے اختتام کا ہے۔

نہیں جانتی ہے مرا نام تک وہ
مگر بھیج دیتی ہے پیغام تک وہ
یہ آتے ہی رہتے ہیں پیغام اکثر
کہ کس روز آؤ گے بیمار بن کر

منظوم افسانے شائع کرنے کی یہ کوشش صنفِ افسانہ میں تنوع پیدا کرنے کا ایک اچھا ذریعہ تھی۔ اگرچہ شاعروں نے اس طرف پوری توجہ نہیں کی تاہم جو چند نظمیں تخلیق ہوئیں وہ شاہد احمد کی خدماتِ ادب کے اعتبار سے اہم ہیں۔

ساقی کے دہلوی دور میں کُل تیرہ افسانہ نمبر شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ ۳۸ء اور ۳۹ء میں افسانوں اور ڈراموں پر مشتمل دو خصوصی شمارے بھی شائع ہوئے تھے۔ ان سب کو سامنے رکھا جائے تو اردو افسانے کا 'ہمالیہ' نظر میں اُبھرتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ شاہد احمد نے ایسا یادگار تاریخی کارنامہ کیسے انجام دیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے احباب فضلِ حق قریشی، انصار ناصری، صادق الخیری اور بعض دوسرے ان کی معاونت کرتے تھے لیکن معاونت ہمہ گیر نہیں تھی۔ ساری ذمہ داری شاہد احمد کی تھی اور سارا بار بھی اُنہیں کو اُٹھانا پڑتا تھا۔ ادیبوں اور شاعروں سے خط و کتابت بھی وہی کرتے تھے اور ابتدائی تین برس کے بعد سارا حساب کتاب اور اشاعتی نگرانی بھی وہی کرتے تھے۔ شاید ہی کسی دوسرے ادبی رسالے کے مدیر نے تنِ تنہا اتنا بار اُٹھایا ہو۔ انہوں نے اس بار کو محبت اور شوق کا سودا سمجھ کر خوشی سے اُٹھایا۔

ایک نظر ساقی کے افسانہ نگاروں اور ان کی تخلیقات پر بھی ضروری ہے۔ ساقی کا دہلوی دور کم و بیش سترہ برس پر مشتمل ہے۔ جنوری ۳۰ء کو پہلا شمارہ شائع ہوا تھا۔ جولائی اگست ۴۷ء کو دلّی سے آخری شمارہ شائع ہوا۔ درمیان میں جنگ عظیم دوم کی وجہ سے کاغذ کی نایابی اشاعت میں آڑے آئی اور تقریباً دس مہینے ساقی شائع نہیں ہوا۔ تاہم اس دور کو سترہ سالہ دور ہی کہا جایے گا۔

سترہ سال کے اس دور میں اردو کا شاید ہی کوئی افسانہ نگار ایسا ہو جس کے افسانے ساقی میں شائع نہ ہوئے ہوں۔ ناموں کی فہرست طویل ہے مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند سے لے کر قرۃ العین حیدر تک ساقی کے اس دور میں اردو کے سبھی قابلِ ذکر افسانہ نگار شامل ہیں۔ ان میں داستان گو، ماضی کے نوحہ خوان مصوّر، بولی ٹھولی کے ماہر کہانی سُنانے والے اور عصری تقاضوں، زندگی کے گہرے شعور، نفسیاتی اور جنسی نزاکتوں کے ترجمان وہ نوجوان بھی ہیں جو آج اردو افسانے کے ستون سمجھے جاتے ہیں۔

شاہد احمد نے ان میں سے بہت سے افسانہ نگاروں کو مختلف طریقوں سے لکھنے کی راہ پر لگایا۔

اختر حسین رائے پوری نے افسانے لکھنے میں ہچر مچر کی تو اُنہیں ایک کوٹھڑی میں بند کیا گیا۔ اس بندش کے بعد وہ افسانہ لیے ہوئے باہر نکلے۔ اس بے تکلفی اور درازدستی نے اردو میں ایک اعلیٰ درجے کے افسانے کا اضافہ کردیا۔ عظیم بیگ چغتائی سے بھی شاہد احمد نے زور دے دے کر افسانے لکھوائے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ جوہرِ قابل کی قدر کرتے تھے اور اُسے پروان چڑھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ وہ اپنی اس روش پر ساری زندگی قائم رہے اور اردو ادب کو نئے نئے افسانہ نگاروں سے روشناس کراتے رہے۔

جس طرح ساقی کے افسانہ نگاروں کی فہرست بہت طویل ہے، اسی طرح ان افسانہ نگاروں کے شہ کاروں کی فہرست بھی طویل ہے۔ منٹو، عصمت، بیدی، اشک، کرشن چندر، حجاب امتیاز علی، محمد حسن عسکری، غلام عباس، ممتاز مفتی، ممتاز شیریں، عظیم بیگ چغتائی اور بہت سے دوسرے افسانہ نگاروں کے مشہور افسانے 'ساقی' میں شائع ہوئے اور اردو کے مشہور افسانوں میں شمار کیے گئے۔

شاہد احمد کو افسانے کے فروغ اور اچھے افسانوں کو اپنے قاری تک پہنچانے کا اتنا شوق تھا کہ وہ تازہ سے تازہ افسانے حاصل کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو دلّی نے ۱۹۳۶ء میں اردو افسانے نشر کرنے کا التزام کیا تھا۔ شاہد احمد نے ان افسانوں کے مسودے ریڈیو سے حاصل کیے اور اُنہیں 'ساقی' میں شائع کردیا۔ اُس زمانے میں ریڈیو سے کوئی مسودہ حاصل کرنا اور اشاعت کی اجازت لینا تقریباً ناممکن تھا۔ محکمانہ اجازت بڑی دقّت سے ملتی تھی۔ اس کے لیے تگ ودو کرنی پڑتی تھی لیکن شاہد احمد نے تازہ تبازہ نوبنو کی خاطر یہ زحمت بھی گوارا کرلی۔ اسے بھی اُن کی ادبی خدمات کا ایک اہم حصہ سمجھنا چاہیے۔

کسی ادبی صنف کو سمجھنا اور اُس کے رجحانات سے آگاہی حاصل کیے بغیر اُس صنف کے شہ کاروں سے لطف اندوز ہونا اور اُن کی تحسین کرنا ممکن نہیں۔ اردو افسانہ بیسویں صدی کے اوائل ہی میں معروف ہو چکا تھا لیکن صنف ادب کی حیثیت سے اس کے رنگا رنگ پہلو بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں نمایاں ہوئے۔ افسانہ نگار افسانے لکھ رہے تھے لیکن صنف افسانہ کے بارے میں تنقید نہ ہونے کے برابر تھی۔ ادبی تنقید شاعری کے قبضے میں تھی، آج بھی ہماری ادبی تنقید کا بڑا حصہ شاعری سے تعلق رکھتا ہے۔

شاہد احمد نے اردو تنقید کی اس کمی کو محسوس کیا۔ ان کو اندازہ ہوگیا کہ افسانے کے فن پر گفتگو نہیں ہوگی اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا ادبی اور فنی جایزہ نہیں لیا جائے گا تو افسانے کے فن کو فروغ کیسے حاصل ہوگا۔ انہوں نے ساقی کے ایک اداریے میں افسانے اور افسانہ نگار کے بارے میں بعض بنیادی باتیں بیان کی ہیں۔ ان کے بقول

''افسانہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ جو کچھ لکھے دل چسپ ہو۔ سب اس پر متفق ہیں کہ فنی حیثیت

سے مختصر افسانہ کم وبیش پانچ ہزار الفاظ پر مشتمل ہونا چاہئے۔ یہ ایک دل چسپ مرقع ہے۔ چند کرداروں کے ایسے واقعات کا جو منتہا کو پہنچتے ہیں۔ واقعات و خیالات میں جامعیت ہونی چاہئے اور یہ ایسے گندھے ہوئے ہونے چاہئیں کہ پڑھنے والے کا خیال اُن میں جذب ہو جائے۔''

شاہد احمد کی بیان کردہ اس تعریف میں امریکی افسانہ نگار ایڈگر ایلن پو کے خیال کی گونج واضح ہے جو اُس نے مختصر افسانے کے بارے میں ظاہر کیا ہے۔ شاہد احمد نے افسانے کی تعریف متعین کرنے کے بعد افسانے کی تنقید کو بھی نظر میں رکھا اور پروفیسر وقار عظیم کو اس جانب مائل کیا اور اس طرح مائل کیا کہ وقار عظیم اردو افسانے کے اہم ناقد قرار پائے۔ ساقی کے دہلوی دور میں عظیم بیگ چغتائی اور ل۔ احمد نے بھی افسانے کے فن پر لکھنا شروع کیا تھا لیکن یہ کوشش کتاب کی شکل اختیار نہ کر سکی۔ بہر حال اردو افسانے کی تنقید کو پروان چڑھانے اور اسے باقاعدہ فن بنانے میں شاہد احمد کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اردو افسانے کے فروغ اور افسانہ نمبروں کی کثرت کے ساتھ ساتھ ساقی نے ادب کے دوسرے گوشوں کو بھی نمایاں کیا۔ شاہد احمد دلّی والے تھے۔ دلّی سے اُنہیں بے پناہ محبت تھی اور اپنی اس محبت کا اظہار انھوں نے ساقی کے 'دہلی نمبروں' میں کیا ہے۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ ساقی کی اشاعت کا ایک مقصد دہلوی ثقافت۔ تہذیب اور شاہ جہانی آن بان کا احیاء بھی تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے شاہد احمد نے ساقی کے چار دلّی نمبر شائع کیے۔ پہلا نمبر نومبر ۱۹۳۰ء۔ دوسرا اکتوبر ۱۹۳۱ء۔ تیسرا اکتوبر ۱۹۳۲ء اور چوتھا اکتوبر ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ پہلے نمبر کے مضمون نگاروں میں۔ علامہ راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، میر ناصر خواجہ ناصر نذیر فراق، مرزا فرحت اللہ بیگ اور اشرف صبوحی جیسے مستند اہل دہلی کے نام ملتے ہیں۔ شاعروں میں مائل دہلوی۔ بیخود دہلوی۔ ساحر دہلوی۔ برق دہلوی جیسے اُستادانِ فن کے ناموں کے ساتھ ساتھ اختر انصاری دہلوی اور ہاشم جان کیف دہلوی جیسے نوجوانوں کے نام بھی شامل ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کی دلکش تخلیق ''جب ساقی کے ہاتھ میں جام تھا۔'' اسی دلّی نمبر کی زینت تھی۔ شاہد احمد کا دعویٰ بھی یہی تھا کہ دلّی نمبر کے تمام لکھنے والے دلّی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ اس نمبر میں دلّی کے متعدد اہل قلم کی تخلیقات یکجا کی گئی تھیں تاہم اسے دلّی کی عظمتِ رفتہ کا مُرقّع مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے۔ شاہد احمد نے اپنی سی بہت کی لیکن یہ نمبر ساقی کے افسانہ نمبروں کے تنوّع اور اثر آفرینی کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اس کے مقابلے میں ۱۹۳۱ء میں شائع ہونے والا دوسرا دلّی نمبر زیادہ وقیع ٹھہرا۔ اس میں اہل دہلی کا حلقہ بھی زیادہ وسیع ہے اور مضامین میں بھی تنوّع بھی ہے۔ اس نمبر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کا ایک افسانہ ''عشق کی گولیاں'' ناتمام صورت میں شائع کیا گیا اور اس دعوت کے ساتھ کہ جس کا جی چاہے اسے مکمل کرے۔ بعد میں سلطان حیدر جوش نے اسے مکمل کیا۔ ممتاز مصنف اور شاعر عظمت اللہ خان مرحوم کی ایک نظم اور ایک نثر پارہ بھی اس نمبر میں

شامل تھے۔

چوتھے دلّی نمبر کے لکھنے والوں کا حلقہ بھی تقریباً وہی ہے جو گزشتہ نمبروں کا تھا۔ شاہد احمد نے ہمت کر کے یہ چار نمبر شائع تو کر دیے لیکن ''دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب'' ان خصوصی اشاعتوں میں میرے خیال میں ایک زندہ اور جیتی جاگتی قوت بن کر اُبھر نہیں سکا۔ میر تقی میرؔ نے صرف ایک شعر میں

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مُصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

دلّی کی روح کو مُسخّر کر لیا تھا۔ حالیؔ نے یہ کام نوحہ گری کے انداز میں کیا۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنایا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

شاہد احمد نے بھی بڑی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ دلّی کی بازیافت ان کے ہاں ''دلّی کی بپتا'' اور ''اُجڑا دیار'' میں ہوئی ہے اور اس حقیقت پسندانہ انداز میں ہوئی ہے کہ نجانے کیا کیا کچھ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

شاہد احمد نے افسانہ نمبروں اور دلّی نمبروں کے علاوہ بعض دوسرے ادبی رسالوں کی طرح سالنامے کی روایت کی پاسداری بھی کی۔ ساقی کا سالنامہ جنوری میں شائع ہوتا تھا۔ قارئین اس خصوصی اشاعت کے منتظر رہتے تھے کیونکہ اس کی حیثیت ایک دلکش ارمغاں کی تھی۔ معروف اہلِ قلم، دل کے تاروں کو چھو لینے والی تحریریں۔ اردو ادب کی تاریخ میں افسانہ نمبروں کی طرح ساقی کے سالناموں کا بھی خصوصی مرتبہ ہے۔ ساقی کو اس مرتبے تک پہنچانے میں شاہد احمد کے ادارتی سلیقے کا بڑا دخل ہے۔

بعض خصوصی اشاعتیں شخصیتوں سے متعلق تھیں۔ خان بہادر میر ناصر علی کے انتقال پر ان کی یاد میں 'ناصر نمبر' شائع کیا گیا۔ میر ناصر علی بڑے پائے کے نثر نگار اور مدیر تھے۔ ان کا رسالہ ''صلائے عام'' اپنے عہد کا بڑا مقبول ادبی رسالہ تھا لیکن میر صاحب کے بارے میں کوئی بہت اچھا تعارفی، تنقیدی اور تحقیقی کام نہیں ہوا۔ اس وجہ سے ان کی شہرت آہستہ آہستہ ماند پڑ گئی۔ لے دے کے ساقی کا ناصر نمبر ہے۔ یا ان کے پوتے انصار ناصری کا صلائے عام کا انتخاب ہے۔ شاہد احمد نے میر صاحب کی یادوں کو محفوظ کرنے کی جو کوشش کی وہ ان کا اہم کارنامہ ہے۔ ایک خصوصی شمارہ عظیم بیگ چغتائی کی وفات پر شائع ہوا تھا۔ اس شمارے میں اداریے اور فضلِ حق قریشی کے ایک مضمون ''چغتائی کی حیاتِ ادبی پر ایک سرسری نظر'' کے علاوہ جو کچھ بھی تھا وہ بقلمِ چغتائی تھا۔ یہ نمبر ساقی کی جانب سے اپنے ایک اہم قلمی معاون کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا بھرپور اظہار تھا۔ شاہد احمد کو چغتائی سے غیر معمولی اُنسیت تھی۔ انھوں نے چغتائی کا خاکہ بھی بڑے خلوص اور محبت سے لکھا ہے۔ اگرچہ چغتائی کے افسانوں کے کئی مجموعے

شائع ہو چکے ہیں۔ تاہم یہ نمبر آج بھی ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ستمبر ۶۳ء میں علامہ راشد الخیری نمبر بھی شائع ہوا تھا۔

شاہد احمد کے تذکرے میں پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ اُنہیں جاپان سے دل چسپی تھی۔ اس دل چسپی میں خود اُن کی ذاتی پسند شامل تھی۔ تھوڑی سی دل چسپی پروفیسر نورالحسن برلاس کی وجہ سے بھی پیدا ہوئی تھی۔ اس دل چسپی کی بنا پر انہوں نے اُبھرتے ہوئے سورج کی سرزمین جاپان کے بارے میں ساقی کا 'جاپان' نمبر شائع کیا۔ جاپان نمبر میں پروفیسر نورالحسن برلاس کے معلوماتی مضامین تھے۔ بعض جاپانی پروفیسروں کے مضامین تھے۔ جاپان میں آباد بعض ہندوستانیوں کے مضامین تھے اور بعض مقامی اہل قلم کے مضامین بھی شامل تھے۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک بڑی کامیاب کوشش تھی اور یہ نمبر ایک ایسے ملک کی تہذیب و ثقافت کو سمجھنے سمجھانے کا ذریعہ تھا جس سے اردو والے بہت کم واقف تھے۔ سفرنامے کم لکھے جا رہے تھے۔ جاپان نمبر میں شاہد احمد نے اردو ادب کو ایک نئے اُفق سے آشنا کیا۔

ان نمبروں کے علاوہ شاہد احمد نے ساقی کے آٹھ ظرافت نمبر اور طنز و مزاح نمبر بھی شائع کیے اور اردو ادب میں طرحِ نو کی بنیاد رکھی۔ ظرافت اور طنز و مزاح کو عام ادبی معیار سے کمتر درجے کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ بعض مزاح نگاروں نے اپنی مزاحیہ تحریروں سے اس رجحان کی نفی کی تھی۔ اردو ادب کے ثقہ اہلِ قلم اور قاری مزاح کے نام سے مُنہ بناتے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی کی پذیرائی میں ساقی کے ظریف نمبروں کا بڑا حصہ ہے۔ شاہد احمد نے ظرافت نمبروں کے سلسلے میں محنت تو بہت کی لیکن ظرافت نگاری کے میدان میں نئے آنے والوں کی تعداد اور کارنامے دونوں محدود رہے۔ ان نمبروں میں پُرانے مزاح نگاروں کے دوش بدوش ایسے نئے مزاح نگار نظر نہیں آتے جنہوں نے آگے چل کر اپنے لیے جگہ بنالی ہو۔ بہرحال شاہد احمد کا یہ کارنامہ بھی بہت اہم ہے کہ انہوں نے طنز و مزاح کی اہمیت اور معنویت دونوں کو اُجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی اور ایک اچھی روایت قائم کر دی۔

یہ تو دہلوی دور کے خاص نمبروں اور شاہد احمد کی ادارتی جدتوں کا بیان تھا۔ یہ بھی دیکھ لینا ضروری ہے کہ افسانہ نمبروں اور خاص نمبروں کے علاوہ ساقی میں ہوتا کیا تھا۔ مضمون نگار کون تھے اور وہ کیا لکھ رہے تھے۔

افسانہ نمبروں کے حوالے سے افسانے کی تنقید کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ ساقی نے عام ادبی تنقید کو فروغ دینے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ تنقید نگاروں کے ناموں پر نظر ڈالنے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ مرزا محمد سعید، پروفیسر فراق گورکھپوری، اعجاز حسین، احتشام حسین، اختر اورینوی، محمد حسن عسکری، پروفیسر محفوظ الحق، وقار عظیم، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ یہ سب اردو تنقید کے معتبر نام ہیں۔ فراق گورکھپوری ساقی میں بہت دن ایک ادبی کالم 'باتیں' کے عنوان

سے لکھتے رہے۔ محمد حسن عسکری کی 'جھلکیاں' اردو تنقید کا پیش بہا سرمایہ ہیں۔ انہیں ساقی کا امتیازی وصف سمجھنا چاہیے۔ میراجی بھی ''باتیں'' کے عنوان سے ایک ادبی کالم لکھتے تھے۔ شاہد احمد نے افسانے اور طنز و مزاح کی طرح اردو میں ادبی تنقید کو پروان چڑھایا ہے۔ یہ بھی ان کا اہم کارنامہ ہے۔

ساقی کے مضمون نگاروں میں بھی بڑے نام ملتے ہیں۔ شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن، خان بہادر میر ناصر علی، خواجہ حسن نظامی، خواجہ ناصر نذیر فراق، سیّد حسن برنی، عبدالباری آسی، نصیرالدین ہاشمی، پروفیسر نعیم الرحمٰن، منصور احمد اور میاں بشیر احمد جیسے اہل قلم کے مضامین ساقی میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ شاہد احمد نے صرف افسانے ہی پر توجہ نہیں کی بلکہ ساقی کو ایک ہمہ رنگ، ہمہ جہت ادبی اور ثقافتی مرقع بنانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب بھی ہوئے۔

بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاہد احمد کو شعر و سخن سے دل چسپی نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے ساقی کے شعری حصے پر مناسب توجہ نہیں کی۔ اس ضمن میں دو باتیں کہنا چاہوں گی۔ ایک تو یہ کہ شاہد احمد کی نثر میں فارسی اردو کے اچھے اشعار ملتے ہیں جن سے ان کے ذوقِ سخن کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس غلط فہمی کی دوسری شق کے حوالے سے یہ مدِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ ساقی نے اپنی ابتدا سے انتہا تک ملک کے تمام مشہور و معروف سخن وروں کے کلام سے بزمِ سخن سجائی ہے۔ اس بزمِ سخن میں بوڑھے، جوان، رنگ قدیم کے ماہر رنگ جدید کے پیرو، ترقی پسند اور جدّت پسند سبھی شامل ہیں۔ پختہ کار اساتذہ میں بیخود، سائل، ساحر، ثاقب لکھنوی اور آرزو لکھنوی۔ منفرد انداز اختیار کرنے والوں میں فانی، جگر، یگانہ اور فراق، ساقی کے بیشتر شماروں میں نظر آتے ہیں۔ نظم نگاروں میں جوش ملیح آبادی، مجاز، میراجی راشد، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، انجم رومانی، منیب الرحمٰن، عبدالمتین عارف اختر الایمان، فارغ بخاری، علی سردار جعفری، سلام مچھلی شہری۔ سبھی کا کلام پڑھنے کو ملتا ہے۔ مجاز کی مشہور نظم 'آوارہ' اور 'نرس کی چارہ گری' جاں نثار اختر کی 'گرلس کالج کی لاری' ساقی ہی میں شائع ہوئی تھیں۔ ساقی معاصر نوجوان شعرا کی پذیرائی کرتا تھا۔ شاہد احمد انہیں اہتمام سے چھاپتے تھے۔ ساقی کے شعرا کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ شاہد احمد نے اس وسیع حلقے سے ساقی کی شہرت اور عظمت میں بجا طور پر اضافہ کیا ہے۔ ساقی کا شعری معیار ہمیشہ بلند رہا۔ اس میں عام سطح کی کوئی شعری تخلیق کبھی شائع نہیں ہوئی۔

ساقی کے مندرجات کے اس سرسری جائزے اور شاہد احمد کی لگن کی نشان دہی کے بعد یہ بھی ضروری ہوجاتا ہے کہ شاہد احمد، ساقی اور اُن کے معاصرین کے ادبی معرکوں پر بھی نظر ڈالی جائے۔ یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ خانوادہ نذیر احمد کے افراد میں انانیت اور اکڑ تھی۔ سیدھوں کے ساتھ سیدھے، ٹیڑھوں کے ساتھ ٹیڑھے اور ذاتی و شخصی اعتماد کا مظہر۔ یہ ٹیڑھ مولوی نذیر احمد میں بھی تھی۔ بشیر الدین احمد میں بھی تھی۔ منذر احمد، مُبشّر احمد، شاہد احمد اور سراج الدین احمد میں بھی تھی اور مُسلم احمد میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ سب

کسی کی ترچھی نظر کے روادار نہیں تھے۔ اپنے دفاع میں سخت اور اٹل تھے۔ اس روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہد احمد اور ساقی کو مختلف اوقات میں قلمی جنگ لڑنی پڑی۔ ان جنگوں سے ادبی محاذ پر بڑی گہما گہمی رہی۔

شاہد احمد اور ساقی کا پہلا ادبی معرکہ اہلِ دہلی اور بیرونِ دہلی کے لکھنے والوں کا ایک ادبی چونچلا تھا۔ ہوا یہ کہ عشرت رحمانی مستقل طور پر رام پور سے دلّی آ گئے۔ رام پور میں وہ ایک رسالے 'نیرنگ' کی اشاعت میں شریک تھے۔ دلّی آ کر انہوں نے نیرنگ یہاں سے شائع کرنا شروع کیا۔ ان کے حلقے میں اکبر حیدری انبالوی اور بعض دوسرے غیر معروف لکھنے والے شامل تھے۔ عشرت رحمانی اور اکبر حیدری سے شاہد احمد کے خوش گوار ذاتی تعلقات بھی تھے۔ ساری زندگی رہے لیکن نیرنگ نے 'ساقی' کے نام اور فراق دہلوی کی شخصیت کو نشانہ بنایا جس کا شاہد احمد کی طرف سے مناسب جواب دیا گیا۔ سوال جواب ہوتے رہے۔ چند ماہ بحث چلی پھر اس کے بعد ساقی نے انکشاف کیا کہ یہ معرکہ مہدی بھوپالی اور سہا مجددی نے کسی ذاتی عناد کی وجہ سے شروع کیا ہے۔ اس انکشاف کے بعد خواجہ حسن نظامی اور دلّی کے چند بزرگ ادیبوں نے شاہد احمد ان کے احباب اور اکبر حیدری اور عشرت رحمانی کو کھانے پر مدعو کیا۔ بزرگوں کی موجودگی میں صلح صفائی ہوگئی اور جنگ ختم ہوگئی۔

یہ ادبی چھیڑ چھاڑ اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ شاہد احمد نے نیرنگ کا تُرکی بہ تُرکی جواب دیا اور سخت روّیہ اختیار کیا۔ یہ ان کا خاندانی مزاج تھا لیکن خاندانی مزاج کا یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ چھیڑ چھاڑ کے خاتمے کے بعد عشرت رحمانی اور اکبر حیدری سے شاہد احمد کے خوش گوار تعلقات برقرار رہے۔ شاہد احمد نے اس چھیڑ چھاڑ کو خوش دلی سے فراموش کر دیا۔

یہ ادبی معرکہ چھیڑ چھاڑ تک محدود تھا لیکن دوسرا ادبی معرکہ زیادہ شدید اور اپنے اثرات کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ کا حصّہ بن گیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب امتیاز علی تاج کا ڈرامہ 'انارکلی' شائع ہوا تو شاہد احمد نے اپنے احباب کے تعاون سے اس پر ایک تند و تیز تنقید دسمبر ۳۲ء کے ساقی میں شائع کی۔ تنقید لکھنے والے کو "مخلص" کا نام دیا گیا۔ یہاں یہ بات بیان کرنی ضروری ہے کہ امتیاز علی تاج اور اُن کے احباب سے شاہد احمد کے خوش گوار ذاتی اور خاندانی تعلقات تھے۔ شاہد احمد کے والد بشیر الدین احمد اور تاج کے والد مولوی ممتاز علی میں دوستی تھی۔ شاہد احمد جب ایف۔ ایس۔ سی کرنے لاہور گئے تھے تو بشیر الدین احمد نے اُنہیں ہدایت کی تھی کہ مہینے میں کم از کم ایک بار مولوی ممتاز علی کے یہاں ضرور جایا کرو۔ اس آمد و رفت کی وجہ سے شاہد احمد اور تاج میں تعلقات کا ہونا قدرتی امر تھا لیکن شاہد احمد نے انارکلی کی تند و تیز تنقید میں ان تعلقات کا کوئی پاس نہیں کیا اور آزادانہ رائے کی اشاعت کی۔ ساقی کی تنقید کا لب لباب یہ تھا کہ ڈرامہ نگار نے تاریخی حقائق کو مسخ کیا ہے۔ ایک بے بنیاد فرضی داستان کو حقیقت کا رنگ دیا گیا ہے اور زبان و بیان میں غلطیاں بھی ملتی ہیں۔

ساقی کی اس تنقید نے ادبی بحث کا دروازہ کھول دیا۔ لاہور کے رسالے 'نیرنگِ خیال' میں تاج کے احباب پطرس، تاثیر اور سالک وغیرہ نے اس تنقید کا سخت جواب دیا۔ بحث چل نکلی۔ ساقی کی طرف سے ان لوگوں پر ''شلوارانِ ادب'' کی پھبتی کسی گئی لیکن جب بحث میں ذاتیات کا عنصر شامل ہونے لگا تو پھر یہ ساری بحث ختم کردی گئی۔ ذاتی تعلقات نہ پہلے متاثر ہوئے تھے نہ بعد میں متاثر ہوئے۔ میل مروّت، قلمی تعاون سب کچھ بدستور جاری رہا۔

یہ ادبی معرکہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کی وجہ سے اہلِ زبان نے سنجیدگی سے ادبی تنقید لکھنے کا آغاز کیا اور ایک ادبی شہ کار کا پوری سنجیدگی سے مطالعہ کیا۔ سخت اور تیز فقرے تنقید کی سنجیدگی پر اثر انداز نہیں ہوئے۔ شاہد احمد اور ان کے احباب نے زبان اور ادب دونوں کی نزاکتوں پر غور کیا اور اہلِ زبان کی رسمی کاوشوں سے بلند ہو کر ایک نیا تنقیدی معیار متعین کرنے کی کوشش کی۔

تاج کی حمایت میں لکھنے والوں میں تاثیر اور پطرس تھے۔ دونوں انگریزی ادب کے منتہی اور شہرۂ آفاق اُستاد اور ڈرامے کی صنف کے ماہر تھے۔ ان کے جوابوں سے انارکلی کی ادبی عظمت کے مختلف پہلو نمایاں ہوئے۔ شاہد احمد اور ان کے احباب نے انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ ضرور کیا تھا لیکن اس مطالعے کو تخلیقی انداز حاصل نہیں تھا۔ تاثیر اور پطرس کے جوابوں سے اُنہیں اس تخلیقی انداز کا پتہ چلا۔ اُدھر تاثیر، پطرس اور سالک کو زبان و بیان کے سلسلے میں ہونے والے اعتراضات کے جوابوں کے لیے زبان کا گہرا مطالعہ کرنا پڑا۔ فائدہ دونوں گروہوں کو ہوا۔ قارئین نے بھی اس گرما گرم بحث مباحثے سے بڑا لطف لیا۔ دونوں رسالوں کی اشاعت بڑھ گئی اور وقتی طور پر بڑی گہما گہمی رہی۔ اردو ادب میں پھلجھڑیاں چھوٹتی رہیں۔ ساقی اور نیرنگ خیال کے قارئین مزے لیتے رہے۔ یہ ساری تفصیل بڑی دل چسپ اور معلومات افزا ہے لیکن وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں۔ کچھ یوں ہے کہ

''نیرنگ خیال۔ لاہور'' کی لوح پر یہ اعلان شائع ہوتا تھا ''ایجاد ہمارا حصّہ ہے اور تقلید دوسروں کا'' یہ گویا ایک طرح کے چیلنج اور ہیکڑی کا اظہار تھا کہ نئی راہ ہم نکالتے ہیں۔ دوسرے محض ہمارے نقّال ہیں۔'' شاہد احمد اور ساقی دونوں پر یہ بڑبولا پن گراں گزرا ہوگا۔ نیرنگِ خیال کے مدیر حکیم یوسف حسن نے تمبر اکتوبر ۳۲ء میں نیرنگِ خیال کا اقبال نمبر شائع کیا تو اس میں ایک دوسرا اعلان یہ تھا۔

''ہمارے صفحہ اول کا یہ اعلان کہ ایجاد ہمارا حصّہ ہے اور تقلید دوسروں کا، محض اس لیے روک دیا گیا ہے کہ اس سے ہمارے بعض معاصرین کے قلب پر ٹھیس لگتی تھی۔ ہمارا مسلک صلحِ کُل ہے اور ہم اپنے معاصرین کا احترام کرنا اور ان کی علمی ادبی سرگرمیوں کی قدر کرنا اپنا فرضِ اوّلین سمجھتے ہیں لیکن اگر آج زیرِ مطالعہ نیرنگِ خیال۔ اقبال نمبر اس حقیقت کو دہرائے تو اُسے معذور سمجھنا چاہیے۔''

اپنی بڑائی جتانے کا یہ انداز دوسروں کے لیے تازیانۂ عبرت معلوم ہوتا ہے۔ حکیم یوسف حسن نے اسی

پر بس نہیں کیا بلکہ نیرنگِ خیال اقبال نمبر کے ایک مضمون نگار ''اے۔ ادیب آبادی'' نے اپنے مضمون میں مخلصانہ مشورے کے روپ میں یہ چوٹ بھی کی کہ ''تمام ملکی اور ملّی اخبارات اور رسالے اگر ذاتیات سے دور رہ کر اور معاصرانہ چشمک اور حسد کے اثرات سے محفوظ ہو کر اس کام کو (اقبال کے پیام کو عام کرنے) خدا کا نام لے کر شروع کر دیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اخبار اور رسالے جہاں ہر سال سالنامے اور دیگر کسی قسم کے نمبر نکالتے رہتے ہیں۔ اگر گاہے گاہے اس پروپیگنڈے کے لیے بھی خاص نمبر نکالنے شروع کر دیں تو ملک اور قوم کی بہترین خدمت کر سکتے ہیں۔ نیرنگِ خیال والوں نے اس مسلک پر پہلا قدم اُٹھا کر گویا اپنے تمام معاصرین کو زبانِ حال سے کہہ دیا ہے کہ ایجاد ہمارا کام تھا۔ اب تقلید آپ کا کام ہے۔''

اخبار اور رسالوں کا ہر سال سالنامے اور دیگر کسی قسم کے نمبر نکالتے رہنے کا اشارہ واضح طور پر ساقی کی طرف تھا جو اس وقت تک افسانہ نمبر (جولائی ۳۰ء)۔ دلّی نمبر (نومبر ۳۰ء)۔ (جنوری ۳۱ء) ظریف نمبر (اپریل ۳۱ء) اور افسانہ نمبر (جولائی ۳۱ء) شائع کر چکا تھا اکتوبر ۳۱ء ظریف نمبر کی اشاعت کا اعلان بھی ہو چکا تھا۔ یہ فقرہ جلتی پر تیل کا کام کر گیا۔ آگ کو مزید بھڑکانے کے لیے اس مضمون کے نیچے ایڈیٹر کا یہ نوٹ بھی تھا۔

''ہم نے نیرنگِ خیال کے صفحۂ اوّل سے یہ فقرہ محض اس لیے کاٹ دیا ہے کہ ہمارے بعض معاصرین کو اس سے رنج پہنچتا تھا۔ نیرنگِ خیال کا مسلک صلحِ کُل ہے۔ اس لیے ہمیں اس فقرے کے کاٹ دینے سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ہمارا فرض صرف خدمتِ خلق ہے۔ خدا کے فضل سے جو کچھ ہم سے ہو سکتا ہے اس سے دریغ نہیں کرتے۔''

نیرنگِ خیال کی اسی ہیکڑی سے شاہد احمد برہم ہوئے اور دسمبر ۳۲ء کے ساقی میں انارکلی پر بہت سخت تنقید کی گئی۔ کتاب کی اشاعت سے پہلے انارکلی کے دو منظر نیرنگِ خیال میں شائع ہوئے تھے۔ نیرنگِ خیال سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے اتنا کافی تھا۔ اچھا اور زوردار مچیٹا رہا۔ دراصل یہ دو مست ہاتھیوں کی ٹکر تھی جس میں بیچارے تاج مفتِ خدا میں پس گئے۔ ویسے شاہد احمد کے تعلقات تاج سے بہت خوش گوار رہے۔ بیگم حجاب امتیاز علی ساقی دہلی اور ساقی کراچی کے مستقل لکھنے والوں میں تھیں مستقل لکھتی رہیں۔ حکیم یوسف حسن سے بھی تعلقات استوار ہو گئے۔

شاہد احمد کے ایک اور ادبی معرکے کا تذکرہ ان کے سوانح کے ذیل میں ہو چکا ہے۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رسالے 'معارف' نے جو علمی، تحقیقی اور سنجیدہ مباحث کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے صادق الخیری کے افسانے ''دیور'' کو غیر اخلاقی قرار دیا اور سیّد سلیمان ندوی نے اس کی مذمّت کی۔ شاہد احمد کو سیّد صاحب کی اس مذمّت سے تاؤ آ گیا اور انہوں نے سیّد صاحب کے بارے میں بڑا سخت لہجہ اختیار

کیا اور یہ لکھا کہ ادب کا مطالعہ ادب کی حیثیت سے ہونا چاہیے۔ شاہد احمد کا جواب تیز اور تلخ تھا۔ سید صاحب کی عظمت اور بزرگی کے خلاف تھا لیکن شاہد احمد اپنی خاندانی اکڑ کو کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ وہ ایک تھپڑ کے جواب میں دو تھپڑ رسید کرنے کے قائل تھے۔

۱۹۴۴ء میں ایک بدمزگی کنھیالال کپور سے بھی ہوئی تھی۔ کپور نے اپنے ایک مزاحیہ مضمون میں جس کا عنوان ''اہل زبان'' تھا اہل زبان پر ناروا حملے کیے تھے اور محمد حسین آزاد اور مولوی ممتاز علی کا غیر شائستہ الفاظ میں تذکرہ کیا تھا۔ اس بدمزگی پر ناراض ہونے میں لاہور کے ادیب بھی شاہد احمد کے ساتھ شامل تھے اور خود ماہ نامہ 'ادب لطیف' کے مدیر احمد ندیم قاسمی نے اس مضمون کی اشاعت کو غلطی تسلیم کیا۔ چنانچہ یہ معاملہ بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔

آل انڈیا ریڈیو حکومت ہند کا ایک بڑا طاقت ور ادارہ تھا۔ ادیبوں، فن کاروں اور موسیقاروں کی سرپرستی کرتا تھا لیکن بعض معاصر رسائل کی طرح شاہد احمد نے بھی یہ محسوس کیا کہ آل انڈیا ریڈیو میں سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہی مثل تھی ''خوان بڑا خوان پوش بڑا۔ کھول کے دیکھا تو آدھا ہی بڑا۔'' نہ ادیبوں کی پرسش۔ نہ فن کاروں کی قدر و منزلت۔ بڑے اچھے اچھے۔ ہونہار اور باصلاحیت نوجوان ریڈیو میں جمع ہوئے اور دونوں ہاتھوں سے دستار سنبھالے رُخصت ہو گئے۔ رخصت ہونے والوں میں ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر مسعود حسین، منٹو، کرشن چندر، اشک، آغا محمد اشرف، مجاز اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری جیسے لوگ شامل تھے۔ ریڈیو کے سربراہ فیلڈن نامی ایک انگریز تھے جنھیں برصغیر کی ثقافت اور فنون سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ احمد شاہ بخاری پطرس اوّل اوّل ان کے نائب تھے۔ ان کے جانے کے بعد ان کی جگہ سربراہ ہو گئے تھے۔ بخاری صاحب اُستاد ہونے کے باوجود مدغ، ہر اعتبار سے محض ایک افسر تھے۔ ان کی سربراہی میں ریڈیو انتظامیہ نے فن کاروں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ مسلمانوں کو یہ شکوہ تھا کہ ان کے حقوق پامال کیے جا رہے ہیں۔ پروگراموں میں ان کی تہذیب و ثقافت کی عکاسی نہیں ہوتی اور آل انڈیا ریڈیو میں ہندی کو اردو پر فوقیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ عملے میں مسلمانوں کا تناسب بہت کم ہے۔ فن کاروں اور بالخصوص اُن شعرا کا جن کا کلام گایا جاتا ہے معاوضہ بہت قلیل ہے۔ شکایات کی ایک پوری فہرست تھی جس میں غیروں سے زیادہ اپنے ملوّث تھے۔

آل انڈیا ریڈیو سے شاہد احمد کا تعلق دُہرا تھا۔ ادیب کی حیثیت سے وہ ادبی پروگراموں میں حصّہ لیتے تھے اور موسیقار کی حیثیت سے موسیقی کے پروگراموں میں شریک ہوتے تھے۔ ریڈیو میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ ایک طرح سے ریڈیو کو مقبول بنانے میں ان کا بھی حصّہ تھا لیکن وہ ناانصافی کو برداشت نہیں کر سکے اور ساقی میں خود اپنے نام اور ابنِ آدم کے نام سے ریڈیو کا کچا چٹھا قلم بند کرتے رہے۔ یہ چومکھی لڑائی تھی۔ ریڈیو انتظامیہ۔ ریڈیو کے سربراہ۔ ہندی والوں کی یورش اور ان کی جانب سے ریڈیو

کی زبان پر اعتراضوں کی بوچھاڑ۔ فن کاروں کی بے وقعتی۔ شاہد احمد نے ہر جہت کا جائزہ لیا۔ ریڈیو انتظامیہ اور اس کے سربراہ کی مطلق العنانی کے خلاف آواز بلند کی۔ ہندی والوں کو منہ توڑ جواب دیا۔ ریڈیو کی زبان کے بارے میں ان کے خیالات کی تردید کی اور فن کاروں کی بے وقعتی کو اچھی طرح الم نشرح کیا۔ یہ چومکھی جاری تھی کہ ہندوستان میں عبوری حکومت قائم ہوگئی۔ ولبھ بھائی پٹیل داخلہ کے ساتھ ساتھ اطلاعات کے وزیر بھی ہوگئے۔ بخاری صاحب واپس گورنمنٹ کالج بھیج دیے گئے اور آل انڈیا ریڈیو کا حلیہ بگڑ گیا۔ شاہد احمد ریڈیو کے خلاف اصولوں کی جنگ لڑ رہے تھے۔ انہوں نے بخاری صاحب کی رخصت کو ریڈیو کے لیے نقصان دہ قرار دیا اور ان کی خدمات کو سراہا۔ یہ اصول اور انصاف کی بات تھی۔ ان کے اس اقدام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذاتیات سے بلند تھے۔ لڑتے تھے تو کسی مقصد کے لیے۔ بلاوجہ کسی کے گریبان میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ جو حق ہے اس کی تعریف۔ جو خراب ہے اُس کی مذمّت۔ ساری زندگی ان کا یہی طریقہ رہا۔ ساقی میں بھی یہی انداز شروع سے آخر تک جاری و ساری رہا۔

بحث مباحثے کے بعض اور موقعے بھی آئے لیکن شاہد احمد کی انانیت اور حق بات کہنے کی روش نے انہیں آسانی سے نمٹا دیا۔ بات یہ ہے کہ ادب اور زندگی دونوں میں چھیڑ چھاڑ کے بغیر کوئی لُطف نہیں آتا۔ شاہد احمد اور ساقی دونوں کی طرف سے یہ چھیڑ چھاڑ تاریخِ ادب کا حصّہ بن گئی۔

ساقی کے دہلوی دور کی چھیڑ چھاڑ کا ایک واقعہ ایسا بھی ہے جس کا چرچا مدتوں رہا۔ ہوا یہ کہ ساقی کے نومبر ۳۴ء کے شمارے میں ایک ترجمہ شائع ہوا۔ لکھنے والی کا نام تھا۔ طاہرہ دیوی شیرازی۔ پھر اس کے بعد طاہرہ دیوی کے افسانے ساقی میں ۱۹۵۰ء تک مسلسل شائع ہوتے رہے اور ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''سحرِ بنگال'' کے عنوان سے ساقی بک ڈپو نے شائع کیا۔ اوّل تو طاہرہ دیوی شیرازی کا نام ہی چوں چوں کا مُرّبا ہے۔ طاہرہ بھی ہیں۔ دیوی بھی ہیں۔ شیرازی بھی ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایسا چرچا ہُوا کہ بڑے بڑے لہلوٹ ہوگئے۔ نیاز فتح پوری اور نصیرالدین ہاشمی کے نام اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔ روایت یہ بھی ہے کہ نیاز فتح پوری نے طاہرہ سے ملنے کے لیے کلکتے کا سفر کیا جہاں سے ان کے خطوط آیا کرتے تھے مگر وہ پتہ محض ڈاک کی ایک سہولت ثابت ہوا۔ ملاقات کی آرزو پوری نہ ہوسکی۔

شاہد احمد کے ہمدمِ دیرینہ فضلِ حق قریشی کا بیان ہے کہ طاہرہ دیوی شیرازی ان کی اختراع تھیں لیکن حالات و واقعات کے جائزے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ایک ساجھے کی ہنڈیا تھی جو چوراہے پر نہ پھوٹنے کے باوجود اپنا رنگ جما گئی۔ طاہرہ دیوی شیرازی کی تخلیق میں فضلِ حق قریشی، شاہد احمد اور ان کے سارے احباب شریک تھے۔ سب مل کر یہ کام انجام دیتے تھے۔ میں نے اشرف صبوحی کی زبانی یہ بھی سُنا ہے کہ شاہد احمد اور ان کے احباب نے فضلِ حق قریشی کے ساتھ بھی یہی داؤں کیا تھا۔ اُنہیں کسی خاتون کی طرف سے محبت نامے بھیجے جاتے تھے لیکن ان کے اضطراب اور ذہنی کشمکش کو دیکھتے ہوئے

اشرف صبوحی نے یہ راز فاش کر دیا اور فضلِ حق قریشی بال بال بچ گئے۔

یہ شرارت کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں تھی۔ نیاز فتح پوری اور اُن کے احباب نے جو 'یارانِ بخد' کے نام سے مشہور تھے اپنے ہی ایک رُکن دلگیر شاہ اکبر آبادی کے ساتھ یہی کھیل کھیلا تھا اور 'قمر زمانی بیگم' کے نام سے خطوط لکھ کر اُنہیں نکّو بنایا تھا۔ لیکن طاہرہ دیوی شیرازی کا افسانوی مجموعہ فضلِ حق قریشی کے دعوے کے باوجود اب بھی تحقیق طلب ہے۔

طاہرہ دیوی شیرازی کے افسانے ان کے افسانوی مجموعے، ان کی شخصیت کے گرد اگرد ایک پُر اسرار رومانی ہالا، شاہد احمد کی چنچل ادبی شخصیت کی ایسی جھلک ہے جسے ان کے نقادوں نے نظر انداز کیا۔ یہ جھلک بھی اپنی رنگا رنگی اور جاذبیت کی وجہ سے قابلِ قدر ہے۔

شاہد احمد نے ساقی کے اجرا کے ساتھ ساتھ فروغِ ادب کے لیے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔ یہ اُن کا خاندانی کام تھا۔ مولوی نذیر احمد نے اپنی بعض کتابیں خود شائع کی تھیں۔ بشیر الدین احمد نے بھی اپنی بیشتر کتابیں خود ہی شائع کی تھیں۔ ان میں واقعاتِ دارالحکومت دہلی، واقعاتِ مملکت بیجاپور، تاریخِ وجے نگر اور فرامینِ سلاطینِ دہلی جیسی ضخیم کتابیں بھی تھیں۔ ان کی فروخت کا باقاعدہ انتظام تھا اور کھاری باؤلی کے مردانے مکان میں جہاں ساقی کا دفتر تھا ان کتابوں کا کاروبار بھی ہوتا تھا۔

ابتدا میں تو شاہد احمد نے کتابوں کی اشاعت پر کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی لیکن جب اُن کا سرمایہ ختم ہو گیا تو انہوں نے سنجیدگی سے کتابوں کی اشاعت پر دھیان دیا لیکن انہوں نے صرف مالی منفعت کو مقصد نہیں بنایا بلکہ کتابوں کی اشاعت میں بھی فروغِ ادب۔ مصنفوں کی دلداری اور اعلیٰ ادبی معیار کو ہمیشہ مدّ نظر رکھا۔ مصنفوں سے معاملہ کرنے میں وہ صاف، کھرے اور بروقت ادائیگی کرنے والے ناشر تھے۔ انھوں نے کرشن چندر کو شکست نامی ناول لکھنے کے لیے ہزار روپے پیشگی ادا کر دیے تھے۔ اُن کا کوئی مصنف ان سے کبھی ناخوش نہیں ہوا۔ کیونکہ کاروباری اور تجارتی معاملات میں وہ نرم مزاج اور فیّاض تھے۔ میراجی نے اپنا مجموعہ اشاعت کے لیے اُنہیں پیش کیا تو انہوں نے پان سو روپے کی پیش کش کی۔ میراجی نے اسے منظور کر لیا مگر یہ خواہش کی کہ معاوضہ پان سو کے بجائے پانچ سو پچپن روپے پانچ آنے پانچ پائی کر دیا جایے۔ شاہد احمد نے ان کی بات کو بے چون وچرا مان لیا۔ اس کے بعد چار سو چوالیس۔ تین سو تینتیس۔ دو سو بائیس اور ایک سو گیارہ روپے پر انہوں نے میراجی کے مسوّدے خریدے جو دلّی کے فسادات میں ضائع ہو گئے۔ شاہد احمد نے پُرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ خواجہ ناصر نذیر فراق کی کتابیں شائع کیں۔ کرشن چندر، منٹو، عصمت، رفیق حسین اور عظیم بیگ چغتائی کے افسانوی مجموعے، مولوی عنایت اللہ کے تراجم، اختر الایمان کا شعری مجموعہ اور بہزاد لکھنوی کے چار مجموعے شائع کیے۔ کہنے والے کہتے تھے کہ

اختری بائی فیض آبادی نے بہزاد کی غزلیں گا کر اُنہیں شہرت بخشی اور شاہداحمد نے ان کے مجموعے چھاپ کر اُنہیں مشہور کر دیا۔ شاہداحمد اور ساقی بک ڈپو کا نام آج بھی معیاری ادبی کتابوں کا نشان سمجھا جاتا ہے۔

ساقی بک ڈپو کی شائع کردہ دو کتابیں ''دھواں'' اور ''چوٹیں'' حکومت پنجاب کی نگاہ میں فحش سمجھی گئیں اور ان کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی گئی۔ ''دھواں'' سعادت حسن منٹو کا افسانوی مجموعہ تھا۔ ''چوٹیں'' کی مصنف عصمت چغتائی تھیں۔ ان مجموعوں کی اشاعت سے پہلے ترقی پسند ادیبوں کا ایک افسانوی مجموعہ ''انگارے'' فحش قرار پا کر ضبط کیا جا چکا تھا۔ ادب میں میں فحاشی کا مسئلہ شاید اُس عہد میں بڑا گھنبیر مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ داستانوں اور شاعری میں کُھل کھیلنے کی پوری آزادی تھی لیکن نفسیاتِ انسانی کے گہرے مطالع میں جنسی شعور کی ترجمانی اور ذہنی انتشار کا اظہار افسانے میں غیر شائستہ اور معیوب قرار پایا۔ فحش کیا ہے اور فحش کیا نہیں ہے اس پر خوب خوب بحثیں ہو چکی ہیں اور شاید آئندہ بھی ہوتی رہیں مگر اُس زمانے میں ان بحثوں میں تیزم تازی بہت تھی۔ اس حد تک کہ کچہری عدالت کی نوبت آ گئی تھی۔ ''دھواں'' اور ''چوٹیں'' پر فحاشی کے جو مقدمے چلے اُن کی روداد خود شاہداحمد نے بیان کی ہے ان کا یہ بیان بنا بنایا ڈرامہ ہے جس کے مکالمے بڑے چُست اور برجستہ ہیں۔ شاہداحمد کی نثر میں اس طرح کی ڈرامائی صورت حال اکثر جگہ ملتی ہے۔ تو ڈرامہ یوں ہے۔

''منٹو کی کتاب 'دھواں' اور عصمت کی کتاب 'چوٹیں' میں نے شائع کی تھی۔ مجھے پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ پنجاب کی سی۔ آئی۔ ڈی چھاپا مارنے والی ہے۔ میں نے یہ کتابیں اپنے کتب خانے سے ہٹا دیں۔

ایک دن ایک سب انسپکٹر دلّی پولیس کے چند سپاہی ساتھ لے کر آ دھمکے۔ مجھے وارنٹ دکھلایا اور کہا کہ میں نے آپ کو گرفتار کر لیا ہے۔

میں نے کہا،

تو پھر،

بولے۔ پانچ ہزار کی شخصی ضمانت دیجئے۔

میرے پاس میرے رشتے کے بھائی علامہ مُضحک بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ضمانت کا کاغذ لکھ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے دفتر کی تلاشی لی۔ وہاں کیا رکھا تھا۔ بے نیل و مرام چلے گئے۔ ان کے دو مہینے بعد ایک دن جو میں اپنے دفتر آیا تو دیکھا کہ ایک سردار جی تلاشی لے رہے ہیں اور دو باوردی پولیس والے چوکیداری کر رہے ہیں۔

میں اپنے کمرے میں جا کر اپنے کام میں لگ گیا۔ سردار جی تلاشی لینے کے بعد خالی ہاتھ میرے پاس آئے — بولے۔

آپ ہی شاہد احمد ہیں۔
میں نے کہا
جی ہاں۔
پوچھا دھواں اور چوٹیں کہاں رکھی ہیں۔
میں نے کہا۔ ہٹا دی ہیں۔
بہت متعجب ہو کر بولے
ہٹا دی ہیں؟
جی ہاں۔
کیوں؟
کیونکہ آپ آنے والے تھے
آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟
اپنی سی۔ آئی۔ ڈی سے۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر ڈھیلے پڑ گئے۔
بھئی ہمیں تو ایک ایک کتاب پڑھنے کے لیے دے دیجئے۔
کتابیں دینے والے شکار پور میں رہتے ہیں۔
پھر بڑے زور سے ہنسے۔ بالکل ہی کھل گئے۔
آپ تو بڑے ہوشیار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھ سے پہلے بھی ایک سب انسپکٹر آپ کی تلاشی لے کر خالی ہاتھ چلا گیا۔ مجھے کچھ تو دیجئے۔
میں نے کہا
میں آپ کو صرف بیان دے سکتا ہوں
بیچارا بہت زِچ ہوا۔ ضمانت اور بیان لے کر چلا گیا۔ دو مہینے کے بعد ہم سب کے نام لاہور کی عدالت سے سمن آ گئے۔ میں، میرا منشی اور کاتب سب ملزم ٹھہرائے گئے بعد میں معلوم ہوا کہ پریس کے مالک اور چند کتب فروش بھی پھانس لیے گئے ہیں۔ دس بارہ ملزموں کی پوری برات تاریخ پر لاہور پہنچی۔ عدالت نے اگلی تاریخ دے دی۔ اس طرح ہم سب کو کئی پھیرے کرائے گئے۔ ایک پیشی پر منٹو اور عصمت بھی بمبئی سے آ گئے۔ کافی فیس دے کر ہم سب نے ایک ہندو ایڈووکیٹ کو اپنا وکیل بنایا۔ بیان ہوئے جرح ہوئی۔ سارے ادیب تو ہمارے صفائی کے گواہ تھے۔ پولیس نے دو گمنام اخبار نویسوں کو گواہی میں پیش کیا وہ بچارے ٹھیک سے اردو بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ وکیل نے اُنہیں ایک مضحکہ بنا دیا۔ رائے بہادر صاحب جو کُرسی عدالت پر بیٹھے تھے مسکراتے رہے مگر اُنہیں حکومت نے ہدایت کر دی تھی کہ سب پر جرمانہ ضرور کیا جائے چنانچہ منٹو اور عصمت پر دو سو روپے جرمانہ اور باقی سب پر بیس بیس روپے جرمانہ ہوا۔

میں نے سات سو روپے وکیل کو دے کر ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ جج انگریز تھا۔ اُس کے سامنے کالی شلوار، دھواں اور لحاف کا انگریزی ترجمہ پیش ہوا تو اُس نے فیصلہ لکھا کہ ان افسانوں میں کچھ بھی فحش نہیں ہے۔

میں نے ان کتابوں کے نئے ایڈیشن فوراً چھاپ دیے۔ وکیل نے کہا آپ سب کے جرمانے واپس ہو سکتے ہیں۔ میں درخواست دے دوں میں نے کہا، آپ جُرمانے واپس لے لیجئے۔ ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ تقریباً ڈھائی ہزار روپیہ میرا ان پیشیوں میں ضائع ہوا مگر میں خوش تھا کہ چودھری صاحب کو مُنہ کی کھانی پڑی۔ منٹو پر انہوں نے اور بھی کئی مقدمے چلائے مگر شاید ایک ہی جرمانہ قائم رہا۔ باقی سارے مقدمے اپیلوں میں خارج ہو گئے۔''

کراچی میں بھی حکومت کی پریس برانچ نے شاہد احمد کو تنگ کیا تھا۔ میں نے پریس برانچ کی اس کوشش کا سارا افسانہ متعدد بار سُنا ہے۔ لہٰذا میں اسے یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔ ساقی کی ایک افسانہ نگار تھیں۔ شمسہ صدیقی۔ بیچاری بھری جوانی میں اللہ کو پیاری ہو گئیں تھیں۔ شمسہ ساقی میں افسانے بھی لکھتی تھیں اور ریڈیو میں ہلکے پھلکے گانوں کا پروگرام بھی کرتی تھیں۔ شمسہ مرحومہ کے افسانے کسی قدر تیز ہوتے تھے۔ بیباکی سے لکھتی تھیں۔ ''بے پیندی کا بدھنا۔ چکنا گھڑا۔ کتیاں۔'' وغیرہ شوخ افسانے ضرور تھے لیکن ناگوار اور تلخ نہیں تھے۔ جب ان کا کوئی افسانہ ساقی میں شائع ہوتا تو کچھ دن بعد وجد چغتائی جوان دنوں رسالہ ''ترنگ'' نکالتے تھے۔ نام بدل کر اس افسانے کو ترنگ میں بھی شائع کر دیتے تھے۔

اُس زمانے میں نظامت کراچی کی پریس برانچ بعض ادبی رسالوں کے خلاف عریانی اور فحاشی کے مقدمے قائم کر چکی تھی۔ ساقی میں شائع ہونے والے شمسہ صدیقی کے افسانے بھی اس زد میں آئے اور پریس برانچ نے مدیر ساقی کے نام بھی نوٹس جاری کیا۔ شاہد احمد کو یہ بات انتہائی ناگوار گزری کہ پریس برانچ ادبی محتسب کے فرائض بھی انجام دینے لگے چنانچہ انہوں نے فوراً انجمن ادبی رسائل کی جانب سے ایک قرارداد اس ادبی احتساب کی مذمت میں منظور کرائی۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ انجمن عریانی اور فحاشی کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے..... اخباروں اور رسالوں کے سلسلے میں ایک ایڈوایزری کمیٹی قائم کی جائے جس کے مشورے سے رسائل کے خلاف کوئی قدم اُٹھایا جائے۔ اس قرارداد کی منظوری کے بعد پریس برانچ نے خاموشی اختیار کر لی اور معاملہ ختم ہو گیا۔ شاہد احمد نا روا احتساب کا مقدمہ ایک بار پھر جیت گئے۔

شاہد احمد کے اس جملے سے کہ ''مگر میں خوش تھا کہ چودھری صاحب کو مُنہ کی کھانی پڑی'' شاہد احمد کی خود اعتمادی۔ انانیت اور خاندانی مزاج کی پوری جھلک عیاں ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد چودھری صاحب نے اُنہیں دس مہینے جھنکوایا اور لاہور سے ساقی کے اجرا کا ڈیکلریشن نہیں دیا مگر جسے خدا رکھے اُسے کون چکھے۔ ساقی کا فیض کراچی سے جاری ہو کر لاہور پہنچ گیا۔ دلّی میں دو رسالے 'شاہ جہاں'

اور 'کامران' بھی شاہد احمد کی سرپرستی میں شائع ہوتے تھے۔ شاہ جہاں پر خمار دہلوی کا نام آتا تھا۔ یہ ترقی پسند تحریک کا آرگن تھا۔ کامران فلمی رسالہ تھا۔ دونوں کے نام ہی نام رہ گئے ہیں۔

''ساقی''(دور کراچی)

جولائی اگست ۴۷ء کا مشترک شمارہ ساقی کے دہلوی دور کا آخری شمارہ تھا۔ اگلا شمارہ ستمبر ۴۸ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس ایک برس کے عرصے میں شاہد احمد پر جو بیتی اُس کا کچھ بیان ان کی کتاب ''دلّی کی بپتا'' میں ملتا ہے۔ باقی کی روداد یہ ہے کہ دس مہینے کی دوڑ بھاگ کے بعد بھی اُنہیں لاہور سے ساقی کا ڈیکلریشن نہیں ملا۔ اور اُنہیں لاہور کی سکونت ترک کرنی پڑی۔ کراچی آ گئے۔ بے سروسامان تھے۔ سرمایہ نہیں تھا مگر عزم اور حوصلہ تھا۔ ڈیکلریشن آسانی سے مل گیا۔ انہوں نے اللہ کا نام لے کر ستمبر ۴۸ء سے ساقی کی اشاعت کا سلسلہ ازسرِنو شروع کر دیا۔

قیامِ پاکستان کے وقت کراچی میں ادب اور ادبی رسائل کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ لاہور ادب اور ادبی رسائل کا مرکز تھا اور لاہور کی ادبی روایت کی دھوم سارے برصغیر میں تھی۔ قیامِ پاکستان کے وقت لاہور سے جو ادبی رسالے شائع ہو رہے تھے اُن میں ادبی روایت کا امین ''ہمایوں'' تھا۔ ''نیرنگِ خیال'' قیام پاکستان سے پہلے ہی اپنی بہار کھو چکا تھا۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد اس کا حال اور بھی پتلا ہو گیا تھا۔ 'ادبِ لطیف' جاندار رسالہ تھا۔ اسے احمد ندیم قاسمی نے اعتبار عطا کیا تھا۔ مرزا ادیب بھی اس بھرم کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ مولانا حامد علی خان کا رسالہ 'الحمرا' کچھ دن چلا پھر اپنی متانت اور سنجیدگی کی وجہ سے بند ہو گیا۔ مولانا صلاح الدین ''ادبی دُنیا'' کی آبیاری خونِ جگر سے کرتے رہے۔ بڑی محنت کی اور بہت کامیاب رہے۔ عالم گیر دوسرے ادبی رسالوں کی طرح پاکستان بننے کے بعد بیٹھ گیا۔ محمد طفیل نے نقوش نکالا۔ احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، وقار عظیم اور پھر محمد طفیل خود اسے سنوارتے رہے۔ یہ پاکستان کا رجحان ساز ادبی رسالہ بن گیا اور اردو رسائل کی تاریخ میں یادگار حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کے خصوصی شماروں کی دھوم آج تک ہے۔ ساقی کا مقابلہ کسی سے نہیں تھا۔ مقابلے کا دور گزر چکا تھا۔ سارے ادبی رسالے اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے تھے۔ کون کس سے مقابلہ کرتا۔ حکومتِ پاکستان کے ادارۂ مطبوعات کی جانب سے ایک ادبی رسالہ ''ماہِ نو'' جاری ہوا۔ ماہِ نو عمدہ ادبی روایت کا حامل تھا لیکن سرخ فیتہ اسے نگل گیا۔

ساقی کراچی سے شائع ہوا تو اُس وقت کوئی قابلِ ذکر یا ناقابلِ ذکر ادبی ماہ نامہ موجود نہیں تھا۔ ساقی کراچی کے ادبی اُفق پر اپنی روایت اور دیرینہ عظمت کے ساتھ طلوع ہوا شاہد احمد نے ''نگاہِ اوّلیں''

میں دُکھ اور حوصلے کے ملے جلے جذبات کے ساتھ لکھا۔

''الحمدللہ کہ ساقی کی صورت دوبارہ دکھائی دی۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

پورے ایک سال کے بعد ساقی کے چھپنے کا موقعہ آیا۔ اس تمام عرصے میں ساقی جاری کرنے کی کوشش کی گئی لیکن نامساعد واقعات نے ہمیشہ مایوس کیا۔ دلّی کے چھٹنے اور گھر بار کے لٹنے نے دل و دماغ ماؤف کر دیا تھا لیکن وقت کے ساتھ تعطّل و جمود رفع ہوا۔ اپنی بربادی پر صبر آ گیا۔ ہمتِ مردانہ نے دور سے آواز دی۔

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

اور جراتِ رندانہ نے بیدار ہو کر ایک بار پھر دُنیائے عمل میں لا کھڑا کیا۔ چاروں طرف تباہی و بربادی کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا لیکن امید کی ننھی سی کرن جگمگا رہی تھی اور سرگرمِ عمل ہونے کا اشارہ کر رہی تھی۔ گزشتہ زندگی ایک حسین خواب بن چکی تھی۔ اب نہ جائداد تھی نہ کاروبار تھا۔ آمدنی کے سارے ذرائع مسدود ہو چکے تھے۔ احباب مدد فرمانا چاہتے تھے لیکن مجھے تو دولتِ پاکستان سے اپنی روزی آپ پیدا کرنی تھی۔ جس نے ہزاروں جھمیلوں میں سے نکال کر مجھے لاہور پہنچایا تھا وہی آئندہ بھی میرا کفیل ہوگا اور بفضلہٖ مجھے ہر طرح کی آسائش مل گئی۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ مل گیا۔ پاکستان مل گیا تو سب مل گیا۔ نفسانفسی کے عالم میں کسی سے بے مروتی کی شکایت بے جا ہے۔ تاہم ان دوستوں کی محبت ساری عمر یاد رہے گی جنھوں نے ڈھارس بندھائی۔ ان میں سب سے پیش ایم اسلم ہیں۔ جن کے خلوص نے میرے سارے غم دھو دیے۔ میں نے لاہور کو اپنا وطنِ ثانی بنایا تھا لیکن چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر مجھے کراچی منتقل ہونا پڑا اور یہیں سے ساقی جاری ہو رہا ہے۔ لاہور سے میرا تعلق منقطع نہیں ہوا۔ بلکہ میرا بیشتر وقت لاہور ہی میں گزرتا ہے۔ لاہور سے کوئی کیسے جدا ہو سکتا ہے۔ میرے معاون عسکری صاحب بھی لاہور ہی میں ہیں اور ساقی مرتب کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ اگر ان کی اعانت مجھے حاصل نہ ہوتی تو ساقی اب بھی چھپنے نہیں پاتا۔ یہ پہلا پرچہ عجلت میں تیار کیا گیا ہے تاہم اپنے سابقہ معیار سے ساقط نہیں سمجھا جا سکتا۔ آئندہ شمارے بہتر سے بہتر ہی ہوتے جائیں گے۔''

اس بیان میں اتنا اضافہ ضروری ہے کہ معاون مدیر کی طرح ساقی کے کاتب ''انوار'' بھی اُن دنوں لاہور ہی میں مقیم تھے کیونکہ اُنہیں کراچی میں کوئی مکان میسّر نہیں آ سکا تھا۔ بعد میں وہ لاہور سے کراچی آ گئے تھے۔

شاہد احمد کے اس اداریے میں سبھی کچھ ہے۔ رنج و غم بھی، طمانیت بھی اور حوصلہ بھی۔ اُن کا یہ کہنا کہ ''پاکستان مل گیا تو سب مل گیا۔'' بڑا بصیرت افروز اور پاکستان کی محبت میں ڈوبا ہوا اظہار ہے۔ یہ پاکستانی ادب کے معمار کی حوصلہ مندی، جرات اور استقلال کا مظہر اور ادب کو بلند سے بلند تر مقام پر

پہنچانے کا عزم ہے۔ شاہد احمد نے اپنی مشکلات کا تذکرہ کیا ہے تاہم کسی مایوسی کا اظہار نہیں کیا۔ نہ اپنی بربادی کا ماتم کیا ہے۔ ساقی اردو کا واحد ادبی رسالہ تھا جس نے کھلم کھلا پاکستان کی حمایت کی تھی۔ شاہد احمد کو اس حمایت پر فخر تھا۔ ذاتی پریشانیوں اور نقصان نے اُنہیں بددل نہیں کیا۔ ساقی کے اس نئے دور کے آغاز ہی میں وہ پرامید اور پُراعتماد نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی شخصیت اور مزاج کا خاصہ تھا۔ پاکستان سے محبت۔ پاکستان کے لیے سب کچھ۔ پاکستان کے لیے ساری کوشش۔ تن من دھن سے اور پاکستان میں اردو ادب کا فروغ جی جان سے۔ ساقی کے پہلے شمارے سے یہی سب آشکار ہے۔

ساقی کا پہلا شمارہ کراچی سے پرانے اور نئے لکھنے والوں کے ناموں کے ساتھ شائع ہوا۔ پرانوں میں حجاب امتیاز علی، چراغ حسن حسرت، عبدالرحمٰن چغتائی، طاہرہ دیوی شیرازی، ایم اسلم اور شوکت تھانوی شامل تھے۔ نئے لکھنے والوں میں انتظار حسین تھے جو دلّی میں اردو زبان کے حوالے سے بعض مضامین لکھ چکے تھے۔ ابنِ سعید نہ پوری طرح نئے تھے نہ پرانے۔ دہلوی دور میں بھی ان کے افسانے شائع ہو چکے تھے۔ شعرا میں امین حزیں، یوسف ظفر، فضلی، نہال سیوہاروی اور حبیب اشعر تھے۔ لکھنے والوں کا ایک حلقہ ابھرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ نگاہِ اولین میں شاہد احمد نے آنے والے دور کی نوید سنائی تھی اور محمد حسن عسکری نے ''جھلکیاں'' میں بڑے فکر انگیز موضوعات چھیڑے تھے۔ ایسے موضوعات جن کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔

اکتوبر کے شمارے میں ساقی کی افسانے کی روایت ایک بار پھر مستحکم نظر آتی ہے کیونکہ اس شمارے میں احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر اور ابن سعید کے افسانے شائع ہوئے ہیں۔ نومبر میں اس روایت کو مزید استحکام حاصل ہوا۔ قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، رفیق احمد اور انتظار حسین اس شمارے کے معتبر نام ہیں۔ دسمبر کے شمارے میں عصمت شاہد لطیف کا نام بھی ملتا ہے۔ رفیق احمد، صفیہ نقوی، اشرف صبوحی اور پرکاش پنڈت کے نام بھی شامل تھے۔ یہ سلسلہ یونہی بڑھتا رہا۔ پھولتا پھلتا رہا۔ اپریل ۵۰ء کے شمارے میں شاہد احمد نے نگاہِ اولین میں بڑے دکھ کے ساتھ لکھا.....

> ''ہندوستان کے اردو ادیبوں نے پاکستان کے رسالوں سے جی کھول کر تعاون نہیں کیا۔ جو کچھ بھی وجوہ ہوں انہیں بہتر معلوم ہوں گی۔ تاہم یہ ہیں بہت چھوٹے دل کی باتیں۔ ہمارے بعض ہندو معاونین نے بھی پرانی رسم وراہ کو بدستورِ سابق جاری رکھا ہے۔ یہ ان کی اس محبت کا ثبوت ہے جو انہیں اردو اور ساقی سے ہے۔ ہم نے سب کو نہایت کشادہ دلی سے بزمِ ساقی میں شریک ہونے کی دعوت دی مگر اس کا جواب ہمیں امید افزا نہیں ملا بلکہ اکثر دل آزاری اور دل شکنی کے جواب بھی ملے خیر۔
>
> ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

جہاں ہمیں اس سے نقصان پہنچا وہاں یہ فائدہ بھی ہوا کہ نئے نئے ادیب و شاعر

پاکستان کے لکھنے والوں ہی میں سے اردو اور ساقی کے لیے اپنے بیش قیمت تحائف لے کر آئے۔ یوں بھی ساقی کو نئے ہنر مندوں کی تلاش رہتی ہے اور اس باب میں ساقی کبھی ناکام نہیں رہا۔ ساقی کے پرچوں کے جرعات پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ دیکھئے کیسے کیسے لکھنے والے اس میں شامل ہوئے اور انہوں نے کیا لکھا ہے اسے بھی جانچئے۔ اس اشاعت میں ہم نہایت فخر کے ساتھ ایک ایسی افسانہ نگار خاتون کو پیش کر رہے ہیں جنھوں نے اردو میں پہلے کبھی کچھ نہیں لکھا اور جن کا پہلا افسانہ ہی دیکھ کر آپ چونک پڑیں گے۔ ان خاتون کا نام ہے..... نہیں۔ نام وہ ابھی بتانا نہیں چاہتیں۔ ان کا افسانہ 'کھلاڑی' اُن کی پہلی کوشش ہے۔ آئندہ کے متعلق آپ خود حکم لگا سکتے ہیں۔''

افسانہ ''کھلاڑی'' کی مصنفہ کا نام 'گردش' لکھا گیا تھا ۱۹۵۱ء تک گردش کے چھ افسانے شائع ہوئے۔ شاید اس کے بعد گردش کو قرار آ گیا۔

مایوسی کے ساتھ خوشی کا عنصر بھی شامل تھا۔ یعنی نگاہِ اولین کے پہلو میں اسی صفحہ پر ''ساقی کے افسانہ نمبر'' کا اشتہار بھی تھا۔ مختصر مگر اعتماد میں ڈوبا ہوا۔ ایک نظر اس پر بھی ڈالنی ضروری ہے۔

''ساقی کے قدر دانوں کا اصرار ہے کہ افسانہ نمبر شائع کیا جائے کیونکہ جدید افسانے کا پیش رو ساقی ہی رہا ہے۔ بہت اچھا۔ تعمیلِ ارشاد کی جائے گی۔ انشاء اللہ جولائی کا ساقی افسانہ نمبر ہی ہوگا۔''

یہ اعلان تمام مشکلات اور مسائل کے پس منظر میں شاہد احمد کی جراتِ رندانہ اور پاکستانی ادب کو فروغ دینے کی کوششوں کا واضح ثبوت ہے۔

اعلان کے مطابق جولائی۔ اگست ۱۹۴۹ء کا مشترکہ شمارہ 'افسانہ نمبر' تھا۔ لکھنے والے تھے انتظار حسین، حاذق الخیری، حجاب امتیاز علی، قرۃ العین حیدر، ناکارہ حیدر آبادی، اختر اورینوی، سیّد خالد، خورشید عادل منیر، اشرف صبوحی، ممتاز شیریں، سعیدہ عبدل، گردش، رفیق احمد، طاہرہ دیوی شیرازی، فیروز عاشق حسین، جہاں بانو نقوی اور بعض دوسرے افسانہ نگار۔ ناموں کی یہ فہرست اس عہد کے اضطراب، بے یقینی، حالات کی سفاکی اور ذہنی و روحانی کرب کے پس منظر میں بڑی دل خوش کن محسوس ہوتی ہے۔ نجانے شاہد احمد نے ان افسانہ نگاروں سے افسانے حاصل کرنے کے لیے کیسے کیسے پاپڑ بیلے ہوں گے۔ بہر حال انہوں نے پاکستان میں اردو افسانے کے فروغ کی نئی اور قابلِ ذکر روایت قائم کر دی۔ ساقی اور شاہد احمد دونوں کا امتیاز برقرار رہا۔

افسانہ نمبر کے بعد خصوصی شماروں کا سلسلہ ایک بار پھر جاری ہو گیا۔ دراصل شاہد احمد اردو افسانے کی روایت کو فروغ دینا اپنی زندگی کا مشن سمجھتے تھے۔ ساقی کے دور کراچی میں انہوں نے متعدد نئے افسانہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری ساقی ہی کے حسنِ توسط سے ترقی کی اس

منزل تک پہنچی۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی تنقیدی مضامین لکھتے تھے۔ شاہد احمد نے انہیں افسانہ نگاری کی راہ پر لگایا اور انہوں نے ساقی میں افسانوں کا ڈھیر لگا دیا۔ انتصار حسین اور سیّد نیوتنوی ریڈیو کی نذر ہونے سے پہلے ساقی ہی میں لکھتے تھے۔ خلیل احمد شاہد احمد کی اہم دریافت تھے۔ انہوں نے جو افسانے لکھے وہ یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔ بلوچستان میں تدریسی خدمت کی وجہ سے انہوں نے افسانے لکھنے چھوڑ دیے۔ وہ اردو افسانے کو بہت کچھ دے سکتے تھے۔ ضمیر الدین احمد اردو افسانے میں بڑی نئی اور توانا آواز تھے۔ انہوں نے زندگی کی جنسیاتی بھول بھلیوں کی بڑی معنی خیز ترجمانی کی ہے۔ سیّد شبیر حسین عمدہ افسانہ نگار تھے۔ الطاف فاطمہ، فرحت انوار، حاذق الخیری، رشیدہ رضویہ، خالد حسن قادری نئے افسانہ نگار تھے۔ الطاف فاطمہ آج بھی لکھ رہی ہیں اور ان کا شمار اردو کے معتبر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ تسنیم سلیم چھتاری، واجدہ تبسم، انور عنایت اللہ افسانہ نگاری میں ساقی کے ذریعے سے چمکے اور انہوں نے اردو کو دو بڑے اہم طویل افسانے دیے۔ پروین سرور، عفت موہانی اور جوگندر پال بھی اس دور کے افسانہ نگاروں میں نظر آتے ہیں۔ آغا بابر اور قدرت اللہ شہاب کے نام بھی ہیں۔ غرضیکہ افسانہ نگاروں کا ایک پورا جھرمٹ ہے، جس میں سے اکثر ساقی کے مرہونِ منت ہیں۔ پرانے لکھنے والوں میں ایم اسلم، صادق الخیری، حجاب امتیاز علی، اشرف صبوحی، ابنِ سعید اور بعض دوسرے محترم افسانہ نگار شامل ہیں۔ شاہد احمد دلّی کی طرح کراچی میں بھی افسانہ نگاروں کا ایک مستند حلقہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ تخلیقی صلاحیت کو پرکھنے، پروان چڑھانے اور مناسب حوصلہ افزائی کی بے مثال کوشش تھی۔ ابھرتے ہوئے فن کاروں کی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ کرنا، ان کے جوہرِ تخلیق کو بروئے کار لانا اور مسلسل کوشاں رہنا، یاددہانیاں، تقاضے، مناسب صلاح مشورے اور سب سے بڑی بات لکھنے پر اکسانا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ کارنامہ شاہد احمد نے دلّی میں بھی انجام دیا تھا اور کراچی میں بھی وہ اپنی سی کوشش میں مصروف رہے۔ فرق یہ تھا کہ دلّی میں ان کی زندگی کا طور آزادانہ تھا۔ احباب کی ایک جماعت تھی جو ان کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ دفتری عملہ تھا۔ بے فکری تھی۔ مالی فارغ البالی تھی۔ کراچی میں یہ سب کچھ عنقا تھا۔ سارے احباب اپنے اپنے حالات کا شکار تھے۔ فضلِ حق قریشی، صادق الخیری، انصار ناصری، پیر جی ولایت حسین، اشرف صبوحی سب تتر بتر ہو گئے۔ صرف عسکری صاحب معاونت کے لیے رہ گئے۔ وہ بھی ابتدا میں لاہور میں مقیم تھے۔ نہ دفتری عملہ تھا، نہ بے فکری تھی، نہ مالی فارغ البالی تھی۔ صبح سے شام تک ریڈیو کی نوکری۔ گویّوں۔ سازندوں اور شعبۂ موسیقی کے عملے سے سر مغزنی۔ مگر ان سب کے باوجود شاہد احمد ساقی نکالتے رہے اور ادب کی خدمت کرتے رہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ سارے دن کی تھکا دینے والی مصروفیت کے باوجود ساقی کو پابندی سے کیسے شائع کرتے رہے۔ صرف پابندی سے شائع نہیں کرتے بلکہ دلّی کی طرح افسانہ نمبروں کے علاوہ نمبروں پر نمبر نکالتے رہتے۔ پہلا افسانہ نمبر جولائی اگست ۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سالنامے نکلے۔ افسانہ نمبر نکلے۔ پچیسویں سال گرہ پر

جو نمبر نکلا اس میں گزشتہ پچیس برس کے افسانوں کا ایک انتخاب بھی تھا اور علاقائی زبانوں کے ادب کے جائزے کے علاوہ گجراتی، ہندی، مراٹھی، عربی، فارسی، جاپانی، روسی، امریکی اور مشرق وسطیٰ کے پچیس سالہ ادب کا جائزہ بھی پیش کیا گیا تھا۔ یہ اپنے طرز کی نئی کوشش تھی اور قاری کا عالمی ادب کے رجحانات سے واقفیت پیدا کرنے کا بڑا مناسب اقدام تھا۔ اردو زبان و ادب کے حوالے سے زبان، صحافت، ناول، ڈرامے، افسانے، تنقید، شاعری، ادبی رسائل، خطوط نویسی، عورتوں کے ادب اور بچوں کے ادب کا پچیس سالہ جائزہ بھی مختلف ماہروں نے مرتب کیا تھا۔ ان میں ڈاکٹر شوکت سبزواری، مولانا سالک، ڈاکٹر احسن فاروقی، وقار عظیم ڈاکٹر عبارت بریلوی، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، مولانا رازق الخیری اور الیاس مجیبی جیسے نامور ادیب اور عالم شامل تھے۔ پچیس سال کے منتخب افسانہ نگاروں میں پریم چند، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، حجاب امتیاز علی، پروفیسر احمد علی، چودھری محمد علی ردولوی، عظیم بیگ چغتائی، سعادت حسن منٹو، انتظار حسین، محمد حسن عسکری اور انور عنایت اللہ کے نام نظر آتے ہیں۔ یہ بڑا عمدہ انتخاب ہے۔ پچیس سال کے افسانوی رجحانات، افسانے کے انداز و آہنگ کی تبدیلیوں، افسانہ نگاروں کے ذہنی اور فنی رویّوں کی ترجمانی۔ اس انتخاب میں سب کچھ ہے۔ اردو افسانے کے ارتقا کو سمجھنے، افسانے کی صنف کو پھلتے پھولتے اور ادب کے افق کو جگمگاتے ہوئے دیکھنے کے لیے ایسے ہی یادگار انتخابوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

شاہد احمد کو افسانے کی صنف سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اس لیے انہوں نے جوبلی نمبر میں افسانوں کا انتخاب شائع کیا۔ شاعری اور مضامین کا انتخاب بھی شامل ہوتا تو ادب دوستوں کو شاہد احمد کی محنت کا صحیح اندازہ ہوتا مگر پھر بات بہت بڑھ جاتی اور شائد ساقی کے محدود وسائل اس کی اجازت نہ دیتے۔ بہرحال ساقی کا جوبلی نمبر اردو ادب کی تاریخ کا ایک باب ہے اور اپنے افسانوی انتخاب کی بنا پر ہمیشہ دلچسپی کا مرکز بنا رہے گا۔

ساقی کی ستائیسویں سال گرہ پر فروری ۵۷ء میں تراجم نمبر شائع ہوا۔ یہ دنیا کے بہترین افسانوں کے تراجم پر مشتمل تھا۔ شاہد احمد کو اس خصوصی نمبر کے سلسلے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے:

> ”ساقی کے اس افسانہ نمبر کا جب ارادہ کیا تھا (اور اس بات کو اب ڈیڑھ سال ہو گیا) تو ان دشواریوں کا مطلق اندازہ نہ ہو سکا جو اس سلسلے میں پیش آئیں۔ جب افسانے مہیا کرنے کے لیے کتابوں کی تلاش شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ کتابیں جو عموماً ہر گھر یا لائبریری میں ہوتی تھیں وہ گھر تو گھر بازار میں بھی موجود نہیں۔ بہ ہزار دشواری چند کتابیں فراہم ہو سکیں اور افسانے ترجمہ کرنے کے لیے ساقی کے قدیم و جدید قلمی معاونین کو بھیجے گئے۔ افسوس ہے کہ ان میں سے نصف کے تراجم آج تک موصول نہیں ہوئے۔“

یہ بیان واقعی شاہد احمد کے ذہنی اور روحانی کرب کا آئینہ دار ہے۔ جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے لیکن ان کی ہمت قابلِ داد ہے کہ ساری مشکلوں کے باوجود انہوں نے چار سو صفحات کا تراجم نمبر شائع کر دیا۔ مجھے بھی اس خصوصی شمارے کے مترجمین میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ترکی کے ایک افسانے کا انگریزی ترجمہ میرے حوالے کیا گیا تھا، میں نے اسے اردو میں منتقل کیا۔ اشاعت کے بعد میں نے اپنے مسودے کا شائع شدہ ترجمے سے مقابلہ کیا تو کہیں کہیں اصلاح کی خوبی محسوس ہوئی۔ لیکن صرف چند مقامات پر۔ باقی مسودے میں کوئی ترمیم تنسیخ نہیں تھی۔

بات پھر وہیں آ کر ٹھہرتی ہے کہ شاہد احمد کو افسانے سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ افسانہ نمبر شائع کرتے کرتے یہ خیال آیا کہ افسانہ نگار اور قاری دونوں کو دنیا کے بہترین افسانوں کے مطالعے کی سہولت اور موقع میسر آئے تو ذہن میں روشنی بھی ہوگی۔ فن کی نزاکتوں اور افسانے کے پیچ وخم کا اندازہ بھی ہوگا اور افسانے کی عالمی سطح کا احساس بھی ہوگا اور عالمی شہ کاروں کی تفہیم سے اردو افسانے کی بہتر نشو ونما ممکن ہو سکے گی۔ اس جذبے میں ادب آموزی اور ادب سے لطف اندوزی دونوں پہلو شامل ہیں۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ادبی ترجموں سے زبان و بیان کے نئے نئے سانچے وجود میں آتے ہیں۔ نئے نئے پیرائے زبان میں داخل ہوتے ہیں۔ مختلف قوموں اور ملکوں کے ذہنی اور روحانی رویوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ متنوع معاشروں کے طرزِ احساس کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ پاکستانی قاری کو انہی رموز سے آشنا کرنا شاہد احمد کا مقصد تھا۔ ساقی کا یہ تراجم نمبر عالمی افسانے کو سمجھنے کا بڑا موثر وسیلہ ہے۔ بعض اربابِ دانش نے بیسویں صدی کو تراجم کی صدی قرار دیا تھا۔ ساقی کے تراجم نمبر کو اسی سلسلے کو ایک کڑی سمجھنا چاہیے۔

عالمی سطح پر مختلف قوموں اور ملکوں کے عوام کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک کرنے کے حوالے سے فکشن کی اہمیت مسلم ہے۔ دل سب کے ایک ہی طرح دھڑکتے ہیں لیکن ہر خطّے میں دل کی کارفرمائیوں کا انداز جداگانہ ہوتا ہے۔ فکشن اسی جداگانہ انداز کو ایک عالمی سطح اور انداز میں تبدیل کرنے کا کام کرتا ہے۔ ساقی کے تراجم نمبر نے بھی یہی کام کیا اور بڑے حسن وخوبی سے کیا ہے۔

تراجم نمبر میں ترجموں کا معیار بھی ساقی کی دیرینہ روایت کے مطابق ہے۔ ترجمہ کرنے والوں میں بڑے بڑے اہلِ قلم شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد باقر، مجتبیٰ حسین، پروفیسر نورالحسن برلاس، آل احمد، صالحہ عابد حسین، مختار صدیقی، نسیم ہمدانی، صوفی تبسم، غلام عباس، پروفیسر حامد اللہ افسر، ممتاز شیریں، طفیل احمد جمالی، حیدر جعفری سیّد، اقبال عظیم، کمال احمد رضوی، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، انور عنایت اللہ اور خود شاہد احمد۔ سب کے سب منجھے ہوئے اور پختہ کار مترجم۔

بعض افسانوں کے ترجمے کرنا گویا لوہے کے چنے چبانے کے برابر تھا۔ ابن الحسن نے آندریف کے افسانے کا ترجمہ 'سرخ قہقہے' کے عنوان سے کیا۔ اس طویل روسی افسانے کا ترجمہ بھاری پتھر تھا۔ ابن الحسن نے یہ بھاری پتھر بڑی سہولت سے اٹھالیا اور اردو تراجم کی روایت میں گراں قدر اضافہ کیا۔

آندریف شاہد احمد کا پسندیدہ مصنف تھا۔ انہوں نے اس کی کتاب 'پھانسی' کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

عالمی سطح کے چوٹی افسانوں کا انتخاب۔ پھر انہیں ترجمے کے لیے مختلف اور موزوں اہل قلم کے سپرد کرنا، یاددہانیاں، تقاضے، موصول شدہ تراجم کا ذمہ دار مدیر کی حیثیت سے مطالعہ، نوک پلک کی درستی۔ یہ سارے کام شاہد احمد نے تنہا انجام دیے۔ انتخاب کی حد تک محمد حسن عسکری نے معاونت کی اور تراجم کے لیے بعض افسانوں کی نشاندہی بھی کی۔ باقی سارا کام شاہد احمد نے کیا۔ ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے کوئی ٹیم نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ پرچے کی ترتیب، مضامین کا پوری ذمہ داری سے مطالعہ اور کتابت کی تصحیح کا تمام کام دلی سے خود کرتے چلے آرہے تھے۔ تراجم نمبر کا تمام کام بھی خود انہوں نے انجام دیا۔ یہ حقیقتاً بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس قسم کے نمائندہ انتخاب بہ آسانی دستیاب ہیں۔ ساقی کے تراجم نمبر کو اگر آج کوئی افسانہ نگاروں اور ترجمہ کرنے والوں کے مختصر تعارف کے ساتھ شائع کر دے تو یہ ایک اہم ادبی خدمت ہوگی۔

شاہد احمد نے ساری زندگی نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ نئے لکھنے والوں کو ساقی کے ذریعے سے متعارف کرایا اور ان کی تخلیقات کو بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ انہیں لکھنے والوں میں نقی محمد خان خورجوی بھی تھے جو نئے لکھنے والے تو نہیں تھے تاہم غیر معروف تھے۔ انہیں لکھنے لکھانے۔ موسیقی اور تصوف سے شغف تھا۔ شاہد احمد نے انہیں افسانے کی راہ دکھائی اور جب دیکھا کہ وہ فسانۂ زندگی مرتب کرنے کے اہل ہیں تو انہیں اس کام پر لگا دیا۔ نقی محمد خان نے یہ کام بڑی خوبی سے کیا اور دل لگا کر کیا۔ ان کی اس محنت اور ذوق وشوق سے ساقی کا ایک خصوصی شمارہ ''عمر رفتہ'' کے عنوان سے ۵۸ء میں شائع ہوگیا۔ زندگی کی اس روداد کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور کتابی شکل میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

نقی محمد خان خورجے (جسے دامن دہلی کہا جاتا تھا) کے معزز پٹھان خاندان کے فرزند تھے۔ ان کے اکثر بزرگ اور عزیز پولیس کی ملازمت میں تھے۔ خان صاحب لڑکپن ہی سے، بڑے دلیر، مہم جو اور حوصلہ مند تھے۔ میں نے انہیں شاہد احمد کے ہاں کئی بار دیکھا۔ بڑھاپے میں بھی بڑے وجیہ، لمبے چوڑے، زندہ دل اور شگفتہ مزاج انسان تھے۔ شاہد احمد کے یہاں وہ اکثر آتے تھے۔

ہر انسان کو اپنی زندگی میں مختلف تجربے حاصل ہوتے ہیں۔ نرم گرم دونوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ آزمائش کے لمحے بھی آتے ہیں۔ فکریں اور پریشانیاں بھی ہوتی ہیں۔ دیانت دار، مخلص اور محنتی آدمی کے لیے ان میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو جاتا ہے۔ فکریں اور پریشانیاں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہیں اور ہر آدمی کے پاس دوسروں کے لیے کوئی نہ کوئی پیغام بھی ہوتا ہے۔

نقی محمد خان نے شاہد احمد کی فرمائش پر اپنی خودنوشت مرتب کی۔ انہیں ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں تھا۔ خیالات، حالات، واقعات سب کو سیدھے سادے انداز میں بیان کر دیتے تھے۔ بیان میں کوئی مبالغہ نہیں تھا۔ جیسا دیکھا ویسا ہی لکھ دیا۔ ان کی تحریر میں سادگی کے ساتھ ساتھ سچائی بھی ہے۔ انسان شناسی

ہے۔ حاضر دماغی ہے۔ زندگی کے نازک لمحوں کو ہمت اور حوصلے سے گزارنے کا سلیقہ ہے۔ پولیس کی ملازمت کی وجہ سے انہوں نے بڑوں بڑوں کی ٹیڑھ نکال دی مگر اس پر کوئی فخر نہیں کیا۔ نہ اپنے کارنامے کے طور پر بیان کیا۔ بس لکھتے گئے اور قاری کے لیے حیرت اور دل چسپی کا سامان فراہم کرتے رہے۔

''عمرِ رفتہ'' بیسویں صدی کے نصف اوّل کی ثقافتی اور تہذیبی تاریخ کا بڑا دلکش نمونہ ہے۔ اس میں جسٹس محمود کی بڑی موثر جھلک ملتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کی بزرگانہ عظمت اور شفقت کا تذکرہ ہے۔ گوہر جان کے گانے کا ذکر ہے۔ گاما اور کیکر سنگھ کی کشتی کا حال ہے۔ دیسی ریاستوں کی غفلتوں اور محلاتی سازشوں کا بیان ہے۔ قیام پاکستان اور اس کے فوراً بعد یوپی کے مسلمانوں پر گزرنے والے ہولناک اور روح فرسا واقعات کا آنکھوں دیکھا احوال ہے۔ یہ روداد ایسے شخص نے مرتب کی ہے جس نے سب کچھ خود دیکھا اور اس کا ایک زندہ کردار بھی رہا۔ ''عمرِ رفتہ'' کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے بڑا اہم اور بصیرت افروز ہے۔ اس میں 'دلّی کی بپتا' کی جھلک ملتی ہے۔

'عمرِ رفتہ' نقی محمد خان نے مرتب کی لیکن شاہد احمد کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نقی محمد خان سے یہ رودادِ حیات لکھوائی۔ شاہد احمد کی ادبی خدمات اور نگاہِ انتخاب کی کامیاب جستجو کا نمونہ ہمیشہ زندہ رہنے والا کارنامہ ہے۔ اس کی اشاعت سے ساقی کی عظمت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔

'عمرِ رفتہ' کی اشاعت اپریل ۵۸ء میں ہوئی تھی۔ ستمبر ۵۸ء میں ساقی کا میر نمبر شائع ہوا۔ میر کا یہ انتخاب محمد حسن عسکری نے مرتب کیا تھا۔ میر اردو کے بزرگ ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا کلیات چھ دواوین پر مشتمل ہے۔ مگر عام قاری کے لیے اس کا مطالعہ مشکل کام ہے۔ چنانچہ انتخابات شائع ہوئے۔ عماد الملک بلگرامی۔ بابائے اردو۔ مولانا حسرت موہانی اور اثر لکھنوی کے انتخابات منظر عام پر آئے۔ ان کے علاوہ علی سردار جعفری۔ ناصر کاظمی اور شمس الرحمٰن فاروقی کے انتخابات بھی شائع ہوئے۔ گویا سات ادیبوں کے کارنامے سامنے آئے۔ عسکری کا انتخاب اس سے الگ اپنی جداگانہ انفرادیت کا حامل ہے۔ اس انتخاب میں عسکری کا پیش لفظ میر کی فنی شخصیت پر ایک صفحے کا مختصر مضمون اور آخر میں ''میر جی'' کے عنوان سے سات صفحے کا ایک مضمون شامل ہے جس کے اختتام پر ۴۷ء سن درج ہے۔ ساقی کے بعض دوسرے اہم نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا اور اشاعت کے تھوڑے عرصے بعد کمیاب ہو گیا۔ کتابی صورت میں شائع ہوا ہوتا تو شاید عسکری کی میر شناسی اور میر کی شاعری کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا۔ شاہد احمد نے اپنے معاون کی محنت کو اس طرح سراہا کہ اسے ساقی کے ایک خصوصی شمارے کا روپ دے کر ادب کی گراں قدر خدمت انجام دی۔

ساقی کراچی کی خصوصی اشاعتوں میں ''مشرقی پاکستان نمبر'' کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ خصوصی اشاعت وقت کی آواز اور اخوت کے رشتے کا اظہار تھی۔ مشرقی پاکستان، پاکستان کا اہم جزو ضرور تھا لیکن ہماری بے خبری کا مارا ہوا۔ پاکستان کے دانش وروں، ادیبوں اور شاعروں نے

مشرقی پاکستان کو قابلِ توجہ نہ سمجھا۔ کانفرنسوں اور مشاعروں میں تو جاتے رہے مگر مشرقی پاکستان کے ادیب اور شاعر مغربی پاکستان کے پرچوں میں بار نہیں پاتے تھے۔ نئے ابھرنے والے ادیب اور شاعر بھلا کس شمار قطار میں تھے۔

اجنبیت اور سرد مہری کی اس فضا میں شاہد احمد کو ڈھاکے جانے کا اتفاق ہوا (اس کا مختصر تذکرہ پہلے ہو چکا ہے) لیکن پوری کہانی خود انھیں کی زبانی سننے کی چیز ہے۔ انہوں نے ساقی کے مشرقی پاکستان نمبر کی نگاہِ اوّلین میں لکھا ہے:

''چند سال ہوئے ڈھاکے کے چند اولوالعزم نوجوان ادیبوں نے بڑی دھوم دھام سے ''یومِ خسرو'' منایا تھا اور اس کی صدارت کا اعزاز مجھے بخشا تھا۔ یومِ خسرو کی تقریبات سے فارغ ہونے کے بعد انہیں نوجوانوں نے شکایت کی تھی کہ مشرقی پاکستان کے اردو کے ادیبوں کو مغربی پاکستان کے ادبی رسائل نے بالکل نظر انداز کر رکھا ہے۔ ساقی البتہ کسی قدر اشک شوئی کر لیتا ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ آپ اپنے آپ کو اس لائق بنایئے کہ مغربی پاکستان کے رسائل بہ اصرار آپ سے مضامین طلب کرنے لگیں۔ میری یہ صاف گوئی بعض دوستوں کو اچھی نہیں لگی۔ فوراً ہی انہیں میں سے ایک صاحب نے ساقی کا مشرقی پاکستان نمبر شائع کرنے کی تجویز پیش کر دی۔ میں نے کہا۔ بسم اللہ۔ مضامین آپ حضرات فراہم کر دیجئے۔ مشرقی پاکستان نمبر چھپ جائے گا۔ مگر میں لگے ہاتھوں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہ کام بھی آپ سے ہوگا نہیں۔ کیونکہ کام جذبات سے نہیں، عمل سے ہوتا ہے۔ میں نے یہ تڑی اس لیے دی تھی کہ وہ واقعی کچھ کام کر کے دکھائیں۔ انہوں نے بڑے زور سے وعدے کیے اور مجھے یقین دلا کر رخصت کیا۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے بیسیوں خط یاد دہانی اور تقاضوں کے لکھے مگر صدائے برنہ خاست۔ پچھلے سال انہیں دنوں میں ایک مذاکرے میں شرکت کے لیے ڈھاکے جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے ان میں سے اکثر نوجوانوں کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔ انہوں نے پھر مجھے یقین دلایا کہ اب کے ہم سب مل کر کام کریں گے۔ میں نے محکمہ تعمیرِ نو کے افسروں سے بھی خاص نمبر کی بات کی اور انہوں نے اس کے لیے کافی مواد بھیجنے کا وعدہ فرمایا۔ میں نے کراچی واپس پہنچ کر ''مشرقی پاکستان نمبر'' کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد جو مجھے شدید مایوسی ہوئی اس کی تفصیل ناقابل بیان ہے۔ میں چاہتا تو ایک اور اعلان کر کے اس تجویز کو منسوخ کر دیتا مگر میری ضدّی طبیعت نہ مانی اور میں نے ایک ایک کا مُنہ تکنے کے بجائے چند احباب کی قلمی امداد سے ایک سال میں یہ خاص نمبر مکمل کر لیا۔''

اس اداریے کے آخر میں شاہد احمد نے بڑی دردمندی سے لکھا ہے:

''اردو میں کوئی کتاب یا رسالہ ایسا نہیں ہے جو مغربی پاکستان والوں کو اپنے مشرقی پاکستان کے بھائیوں کی مفصل کیفیت بتائے، بارہ سو میل کے فصل نے دونوں کے درمیان مغائرت اور لاعلمی کی دیوار کھڑی کر رکھی ہے۔ حکومت تو اس دیوار کو ڈھانے کی کوشش کر رہی ہے مگر ہم ادیبوں پر بھی اس بے تعلقی کو دور کرنے کی بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ساقی کے مشرقی پاکستان نمبر کو اسی جہت میں ایک مفید اقدام سمجھئے۔ مجھے اس کا اقرار ہے کہ یہ خاص نمبر ہر لحاظ سے مکمل نہیں ہے۔ مشرق اور مغرب کے درمیان اس کی حیثیت صرف تعارفی سمجھ لیجئے۔ کچھ نہ جاننے سے کچھ جان جانا بہر حال بہتر ہے۔''

یہ اداریہ مشرق و مغرب کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ شاہد احمد کی مشکلات اور مسائل کا آئینہ ہے۔ خط لکھتے رہے، تقاضے کرتے رہے، یاد دہانیاں ہوتی رہیں۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ شکوہ کرنے والوں نے اپنے غم و غصہ کا اظہار تو برملا کر دیا لیکن تعاون کا وقت آیا تو کچھ بھی نہیں۔ نجانے کیسے کیسے پاپڑ بیلے جب یہ مشرقی پاکستان نمبر مرتب ہوا۔ اب اس کی حیثیت طاقِ نسیاں کے ایک گلدستے سے زیادہ نہیں ہے۔

شاہد احمد نے یہ نمبر اپنے روایتی ادارتی حسن اور سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ مشرقی پاکستان کی فضا، ماحول، تہذیب، ثقافت، لوک ورثے، صنعت و حرفت۔ سبھی کی جھلکیاں پیش کی جائیں۔ یہ جھلکیاں دلکش، دیدہ زیب اور پُر اثر ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو سکا ہے کوئی گوشہ چھوڑا نہیں گیا۔ ایک سو سات مضامین ہیں — لکھنے والوں میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، سلیم اللہ فہمی، وحید قیصر ندوی، عابد داناپوری، افسر ماہ پوری، ڈاکٹر شہید اللہ، ڈاکٹر حسن احمد دانی، پروفیسر سعد منیر، یونس احمر، احسن احمد اشک، غلام محمد، وفا راشدی اور احمد زین الدین کے نام ملتے ہیں جو مشرقی پاکستان کے حوالے سے معتبر اور مستند نام ہیں۔ چار سو صفحات پر مشتمل یہ نمبر ساقی کے تنوّع، ادبی اور قومی خدمت اور مدیر ساقی کی اولوالعزمی کی یادگار روداد ہے۔ مشرقی پاکستان مرحوم ہو گیا۔ یادیں باقی رہ گئیں۔ ساقی کا مشرقی پاکستان نمبر انہیں یادوں کا گنجینہ ہے۔ ساقی کی یہ خدمت ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

مشرقی پاکستان نمبر کے ضمن میں نذر الاسلام نمبر کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ اگر چہ اس پر جلد کا نمبر، نمبر شمار اور مہینہ درج نہیں ہے تاہم یہ ۶۵ء کا شائع شدہ معلوم ہوتا ہے۔

بنگال کے شعلہ نوا شاعر نذر الاسلام کو اردو میں یونس احمر اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے متعارف کرایا تھا۔ یونس احمر، نذر الاسلام کے بارے میں مسلسل لکھتے رہے۔ جون ۴۲ء کے ساقی میں ''دو بنگالی نظمیں'' کے عنوان سے قاضی نذر الاسلام کی دو نظموں کا ترجمہ شائع ہوا تھا۔ مترجم تھے، محمد یونس احمر۔ پھر تو قطار لگ گئی۔ نذر الاسلام کی نظموں کے تراجم کا ایک آدھ مجموعہ بھی شائع ہوا لیکن

ایک تفصیلی کتاب کی ضرورت تھی۔ یہ کام پروفیسر عبداللہ نے کیا۔

ڈکٹر عندلیب شادانی نے نذرالاسلام نمبر کے تعارف میں لکھا ہے کہ:

''اردو میں نذرالاسلام کے متعلق کوئی جامع اور مستقل تصنیف موجود نہیں۔ اردو میں نذرالاسلام کی زندگی اور شاعری پر قلم اٹھانے والے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی مادری زبان بنگلہ ہو، وہ اردو میں اچھی دست گاہ رکھتا ہو۔ بھرپور ادبی ذوق کا مالک ہو اور اردو ادب سے بخوبی واقف ہو۔ پروفیسر عبداللہ ان تمام خوبیوں کے مالک ہیں۔ ان کی مادری زبان بنگلہ ہے۔ وہ اردو میں اعلیٰ ڈگریاں امتیاز کے ساتھ حاصل کر چکے ہیں اور بہت اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ ان کی یہ کتاب اہل وطن کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔''

ڈاکٹر شادانی نے اپنے اس تعارف میں نذرالاسلام کی فنی عظمت، شاعرانہ مرتبہ اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ بھی کیا ہے۔ انہوں نے پوری کتاب پر نظر ثانی بھی کی تھی اور مفید مشورے بھی دیے تھے۔ یہاں اس امر کی صراحت بھی ضروری ہے کہ ساقی کا یہ نذرالاسلام نمبر ڈاکٹر عبداللہ کی ایک کتاب پر مشتمل ہے۔ خیال یہ ہے کہ ڈاکٹر عبداللہ نے کتاب تو مرتب کر لی لیکن انہیں کوئی پبلشر نہیں مل سکا۔ یہ صورت حال دیکھ کر ڈاکٹر شادانی نے شاہد احمد سے بات کی۔ وہ نت نئے تجربوں کے لیے سدا تیار رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر عبداللہ کی کتاب کو ساقی کے نذرالاسلام نمبر کا روپ دے دیا۔

کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر قاضی دین محمد نے لکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

''نذرالاسلام کو اردو بولنے والوں سے روشناس کرانے کی یہ پہلی جامع کوشش ہے۔ اس سے پاکستان کے ایک خطۂ عظیم کے لوگوں کو شاعر موصوف، ان کے ماحول اور ان کے علاقے کے باشندوں سے واقف ہونے کا موقع ملے گا۔ پروفیسر صاحب نے عرصے سے محسوس کی ہوئی اس کمی کو پورا کیا ہے اس لیے ہم انہیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔''

اس مبارکباد پر مجھے غالب کا یہ مصرع ''مبارکباد اسد غم خوارِ جانِ دردمند آیا'' شدت سے یاد آیا۔ کیسی مبارکباد اور کس کی مبارکباد۔ ''چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا۔''

پونے دو سو صفحے کا یہ نمبر قاضی نذرالاسلام کی حیات اور شاعری کے مختلف گوشوں پر مشتمل ہے۔ سترہ ابواب میں نذرالاسلام کی زندگی، شخصیت، اثرات، شاعری کے مختلف پہلو، عربی، فارسی اور اردو الفاظ کے استعمال، سب کا جائزہ ہے اور باغی شاعر کے باغیانہ خیالات، آہنگ اور فکر سب کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ نے معرکے کا کام یہ کیا ہے کہ برصغیر کے تین عظیم معاصرین، اقبال، ٹیگور اور نذرالاسلام کی فکر و فن کا ایک مختصر جائزہ بھی مرتب کیا ہے۔ یہ جائزہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اہم ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اسے ایک ایسے بنگلہ عالم نے مرتب کیا ہے جو اردو میں مکمل دست گاہ رکھتا تھا اور اردو شاعری کے مزاج اور روایت سے واقف تھا۔

ساقی کے نذرالاسلام نمبر کی اہمیت اور افادیت مشرقی پاکستان کے مرحوم ہو جانے کے باوجود آج بھی

برقرار ہے۔ کیونکہ شاعر، شعر اور ادب کسی زبان اور قوم کی ملکیت نہیں ہوتے۔ ان پر سب کا حق ہوتا ہے۔ شاہد احمد نے نذر الاسلام نمبر شائع کر کے ساقی کی ادبی روایت کو بھی مستحکم کیا اور ادب کا بھرم بھی قائم کیا۔

ساقی کے سالناموں، افسانہ نمبروں، ناولٹ نمبروں اور دوسرے خصوصی شماروں کے نمبروں میں ایک بڑا تابناک ستارہ ''ممتاز خواتین افسانہ نگاروں کے بہترین افسانوں کا انتخاب'' ہے۔ انتخاب افسانہ نگاروں نے خود کیا ہے اور اپنے حالات بھی قلم بند کیے ہیں جو اس خصوصی شمارے کے آخر میں درج ہیں۔ دو تین افسانہ نگاروں نے حالات لکھنے سے گریز کیا ہے۔ باقی سب نے اپنے بارے میں لکھا ہے۔ بعض نے طولانی، بعض نے مختصر۔ شمارے کے شروع میں افسانہ نگاروں کی تصویریں بھی ہیں۔ گویا شاہد احمد نے اس نمبر کو بھرپور بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسا زبردست نمبر شائع کرنا شاہد احمد ہی کا کمال تھا۔

اردو میں خواتین افسانہ نگاروں کے انتخاب کی روایت ساقی کے اس خصوصی شمارے سے پہلے موجود تھی۔ ''شاعر'' آگرہ نے اس قسم کا ایک نمبر شائع کیا تھا۔ ساغر نظامی نے اپنے رسالے ''ایشیا'' کا بھی اسی قسم کا نمبر نکالا تھا۔ یہ دونوں نمبر میں نے نہیں دیکھے۔ اس لیے ان کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔ ۱۹۴۷ء میں احمد ندیم قاسمی نے ''نقوش'' لطیف کے عنوان سے خواتین افسانہ نگاروں کا ایک انتخاب کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔ یہ انتخاب چوبیس افسانوں پر مشتمل ہے۔ افسانہ نگاروں کے حالات زندگی بھی ہیں اور سترہ افسانہ نگاروں کے ادبی اور فنی نظریات کا بیان بھی ہے۔

ساقی کا انتخاب نمبر ان سب پر بھاری ہے۔ یہ چھیالیس افسانہ نگاروں کی تخلیقات پر مشتمل ہے۔ اس میں پرانے نام جیسے نذر سجاد حیدر، اور شائستہ اختر سہروردی بھی شامل ہیں اور ان کے مقابلے میں نئے نام، حجاب امتیاز علی، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، قرۃ العین حیدر، اے۔ آر خاتون، ممتاز شیریں، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، صدیقہ بیگم سیوہاروی، آمنہ نازلی، شکیلہ اختر، جہاں بانو نقوی، تسنیم سلیم چھتاری، سیّدہ عبدل، سعیدہ رضوی، شفیق بانو، شکیلہ معظم، نجمہ انوار الحق، فرحت انوار، بیگم خورشید مرزا، نینا کاش اور ناہید عالم بھی پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ یہ سب ہمارے افسانوی ادب کے بڑے محترم نام ہیں۔ ساقی کے خواتین افسانہ نمبر میں ان کا یک جا ہونا شاہد احمد کی مدیرانہ صلاحیت اور عظمت کا کمال ہے۔

ساقی کے تراجم نمبر کی طرح یہ نمبر بھی فردِ واحد کی شب و روز محنت کا نتیجہ ہے۔ آج ہم جب اس خصوصی اشاعت کا مطالعہ کرتے ہیں اور خواتین افسانہ نگاروں کی اتنی بڑی اور سجی سجائی محفل دیکھتے ہیں تو اس محفل کے پس منظر میں اس محنت کش ادیب گر ادیب کی جھلک نظر آتی ہے جسے وقت اور حالات کی سفاکی نے وقت سے بہت پہلے بوڑھا اور دل شکستہ کر دیا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسے جفاکش، حالات سے لڑنے والے، ادب کی راہوں میں نئے چراغ جلانے والے اور ادیبوں کو حوصلہ دینے والے لوگ بھی اردو ادب میں موجود تھے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار بڑا جان لیوا عمل ہے۔ لکھنے والا لکھتا ہے تو اپنا لہو جلاتا

ہے۔ نثر لکھنے میں شاید خون کچھ زیادہ ہی خشک ہوتا ہے۔ لیکن ادیبوں سے لکھوانا، ہاتھیوں سے گنّے کھانا ہے۔ تقاضے پر تقاضہ کیے جایئے۔ خط پر خط لکھے جایئے۔ خوشامد، درآمد، منت، سماجت، دھمکی، سارے حربے آزما لیجئے۔ مجال ہے جو مطلق اثر ہو۔ لکھنے والا تو اسی وقت لکھے گا جب اس کا جی چاہے گا۔ پھر معاوضے کی رسم بھی چل نکلی تھی۔ ایک بڑے ادبی رسالے کے مالک نے ایک افسانہ نگار کو لکھا۔ ''سنا ہے آپ کوئی افسانہ لکھ رہے ہیں۔ مکمل ہوتے ہی اسے ہمارے نام وی پی کر دیجئے۔'' برافروختہ افسانہ نگار کا ردِ عمل خوش گوار نہیں تھا۔ مگر معاوضہ نہ دینے کے باوجود شاہد احمد نے نجانے کیا کیا جتن کیے کہ یہ نمبر شائع کر دیا۔ انسان دل پر لکھ لے تو پھر کام ہو ہی جاتا ہے۔ شاہد احمد نے نگاہِ اولین میں اپنی بپتا سنائی ہے۔ لکھ دیا ہے کہ ''اب میں زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ چلتے چلتے ہانپ گیا ہوں۔'' لیکن ہانپنے کے باوجود وہ خصوصی شمارے مسلسل شائع کرتے رہے انہوں نے بے سروسامانی کے باوجود ہار نہیں مانی۔

تراجم نمبر کی طرح یہ نمبر بھی بہت مقبول ہوا۔ بڑا چرچا رہا۔ حوالے دیے جاتے رہے۔ اور پھر یہ نمبر بھی ساقی کے دوسرے یادگار تاریخی نمبروں کی طرح نایاب ہوگیا۔

خواتین افسانہ نگاروں کے اس نمبر کے بعد شاہد احمد نے ساقی کے متعدد خصوصی شمارے شائع کیے۔ ناولٹ نمبر، افسانہ نمبر، سالنامے، آئین نمبر، اور جوش نمبر۔ انہوں نے ساقی کے دور کراچی میں خصوصی شمارے شائع کرنے کی روایت کو مستحکم کر کے یہ ثابت کر دیا کہ دورِ کراچی، دہلوی دور سے کسی طرح کم نہیں بلکہ بعض اعتبارات سے اس سے زیادہ بہتر ہے۔

کراچی میں ساقی کے چار ناولٹ نمبر شائع ہوئے۔ پہلا نمبر جنوری ۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ادارے کی جانب سے ایک تعارف تھا اور اس کے بعد اختر حامد خان کے چار ناولٹ تھے۔ چاروں کے چاروں جگ بیتی نہیں آپ بیتی تھے۔ دوسرا جولائی ۶۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں بھی پانچ طبع زاد ناولٹ تھے اور ایک ترجمہ شاہد احمد نے کیا تھا۔ طبع زاد ناولٹ لکھنے والے تھے۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی (صبح بنارس) پروین سرور (حسرتِ پرواز) عنایت اللہ (حویلی) نعیمہ شہباز (بکھرے تار) رشیدہ رضویہ (گلِ نسیم سحر)۔ خواتین افسانہ نمبر کے بعد ایسا نمبر نکالنا شاہد احمد ہی کا حصہ تھا۔ وہ ساقی کے فکر میں مسلسل گھلتے جا رہے تھے مگر ادب کا نشان بلند سے بلند تر کر رہے تھے۔ تیسرا نمبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اِس میں سات ناولٹ تھے۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی (تمنائے نشاط) بیگم خورشید مرزا (روبی) فہمیدہ اختر (پھنو) پروین سرور (زخمِ پنہاں) رشیدہ رضویہ (یہاں پیار دفن ہوتا ہے) الطاف فاطمہ (جنت اور جہنم) اور محمود نظامی (نیا راستہ)۔ اس نمبر میں طویل مختصر افسانے کے عنوان سے ڈاکٹر فاروقی کا ایک مختصر مضمون بھی شامل تھا۔ آخری ناولٹ نمبر جون ۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں چار طبعزاد اور دو ترجمہ شدہ ناولٹ تھے۔ حسبِ معمول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا ناولٹ (اور ریکارڈ بجتا رہا) پروین سرور (طوفانِ حوادث) رشیدہ رضویہ (سفید صورت کالا آدمی) فرحت انوار (اک شمع رہ گئی تھی) ترجموں میں ایک بنگلہ اور دوسرا

فارسی سے تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، پروین سرور اور رشیدہ رضویہ کے ناولٹ پہلے نمبر کے علاوہ ہر نمبر میں شائع ہوئے۔ یہ شاہد احمد کا ادارتی کمال ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ہمہ رنگ ادیب تھے۔ تنقید بھی لکھتے تھے۔ ناول اور افسانے بھی لکھتے تھے۔ شاہد احمد کے دوست تھے۔ ان کی فرمائش کو ٹال نہیں سکتے تھے۔ پروین سرور اور رشیدہ رضویہ کو شاہد احمد کی طرف سے مناسب حوصلہ افزائی حاصل ہوئی۔ شاید اس وجہ سے انہوں نے شاہد احمد کی فرمائش کی تعمیل کی۔ جو بھی ہو۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ شاہد احمد نے ہمت بندھائی۔ لکھنے والوں نے لکھا اور خوب لکھا۔ یہی مدیر کا کمال ہوتا ہے کہ لکھنے والوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور ان کے ادبی سفر کی راہ متعین کر دے۔

شاہد احمد نے ساقی کا آئین نمبر۔ اشتراکی ادب نمبر اور جنگ نمبر بھی شائع کیا۔

پہلے دو نمبر ادارتی مصلحتوں اور تیسرا نمبر محض حب الوطنی کے جذبات پر مشتمل تھا۔ اس بنا پر انہیں کوئی خصوصی اہمیت بھی حاصل نہیں ہوئی۔

جس خصوصی شمارے کا تذکرہ باقی رہ گیا ہے وہ ہے ''جوش نمبر۔'' جوش نمبر کے بارے میں کسی گفتگو سے پہلے ایک روایت کا یا اگر آپ چاہیں تو اسے لطیفہ سمجھ لیں تذکرہ ضروری ہے۔ ایک بار اورنٹیل کالج لاہور کے شعبۂ عربی کے کچھ طالب علم علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ درخواست کی کہ فلاں قصیدہ نصاب سے خارج کروا دیجئے۔ علامہ نے دریافت کیا۔ ''کوئی وجہ؟'' تو ان طالب علموں نے کہا۔ ''اس قصیدے میں گالیاں ہیں۔'' علامہ نے پوچھا۔ ''کیا آپ کے ساتھ لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں۔'' طالب علموں نے کہا۔ ''جی نہیں۔ لڑکیاں نہیں پڑھتیں۔'' اس پر علامہ نے فرمایا کہ ''پھر اس قصیدے کا نصاب سے خارج ہونے کا کوئی جواز نہیں۔ آپ عربی زبان و ادب کے طالب علم ہیں آپ کو یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ شرفائے عرب گالی کیسے بکتے تھے''، جوش نمبر کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس سے قاری کو اندازہ ہوتا ہے کہ شرفائے ملیح آباد اور شرفائے دلّی گالی کس طرح بکتے تھے۔ ساقی کے جوش نمبر کی اشاعت کا واقعہ کیسے پیش آیا۔ جوش و شاہد میں لفظی گولہ باری کیوں ہوئی۔ اس کے بارے میں شاہد احمد کا بیان یہ ہے:

> ''یہ مضمون (جوش کا خاکہ۔ جوش ملیح آبادی۔ دیدہ و شنیدہ) جناب صہبا لکھنوی کی فرمائش پر افکار کے جوش نمبر کے لیے لکھا تھا۔ میں نے صہبا صاحب کو بتا دیا تھا کہ اگر جوش صاحب پر مضمون لکھوں گا تو مجھے جو کچھ ان کے متعلق معلوم ہے سبھی کچھ لکھوں گا۔ اس میں ان کی شخصیت کے گھناؤنے پہلو بھی آئیں گے۔ اس لیے بہتر تو یہی ہے کہ آپ مجھ سے جوش صاحب پر مضمون نہ لکھوائیں۔ اس سے دل برے ہوں گے۔ آپ کے خاص نمبر پر بھی بات آئے گی۔ مگر صہبا صاحب نہ مانے اور ان کا اصرار برابر جاری رہا۔ وہ زیادہ مصر اس لیے بھی تھے کہ کسی نے جوش صاحب کے شخصی پہلو پر انہیں مضمون لکھ کر نہیں بھیجا تھا۔ اور لکھتا بھی کیوں؟ کسی میں اپنی برائیاں سننے کی تاب نہیں ہوتی۔

جب صہبا صاحب نے فرمایا۔ ''آپ برائیاں بھی لکھ دیجئے۔ ہر شخص میں برائیاں اور خرابیاں ہوتی ہیں۔'' تو میں نے جو باتیں مجھے یاد آئیں لکھ دیں۔ ان میں اچھائیاں بھی تھیں اور برائیاں بھی۔ صہبا صاحب نے مضمون پڑھ کر پسند فرمایا مگر اس کے دو ایک صفحے حذف کرنے کی مجھ سے اجازت چاہی۔ میرا مقصد جوش صاحب کو نقصان پہنچانے کا ہرگز نہیں تھا اس لیے بعض حصّے جن میں ان کی جنسی، مذہبی اور سیاسی کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا شائع نہیں کیے گئے۔ اس پر بھی میرا اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ مضمون جوش صاحب کو ناگوار گزرا اور ان سے زیادہ ان کے دوستوں کو اس سے تکلیف پہنچی۔ مجھے اس کا افسوس ہوا اور میں چاہتا تھا کہ جوش صاحب سے مل کر انہیں منالوں اور اس کی تلافی کی کوئی صورت نکالوں کہ مجھے معلوم ہوا جوش صاحب اس کا جواب لکھ رہے ہیں۔ لہٰذا عذر خواہی کی اب گنجائش نہیں رہی۔ جوش صاحب کا جوابی مضمون 'افکار' کے جوش نمبر (دوسرے ایڈیشن) میں شائع ہوا۔ اسے پڑھنے کے بعد میں نے اپنا مضمون مع محذوف حصّوں کے ماہنامہ 'نقش' میں شائع کروادیا تھا کہ جوش صاحب محذوف حصّوں کا جواب بھی دے سکیں۔''

شاہد احمد کے خاکے کا جواب جوش نے ''ضربِ شاہد بفرقِ شاہد باز'' لکھا۔ شاہد احمد کے خاکوں کا نمایاں وصف ان کی حقیقت پسندی ہے۔ انہوں نے اپنے کسی خاکے میں لگی لپٹی نہیں رکھی ہے۔ کسی کا خاکہ ہو ان کی حقیقت پسندی کہیں نہ کہیں اپنا رنگ ضرور دکھاتی ہے۔ جوش کے خاکے میں بھی اسی حقیقت پسندی کا اظہار ہے جو جوش کو ناگوار گزرا۔ جوش کی تحریروں میں حقیقت پسندی نہیں ملتی لیکن احباب کی پگڑیاں اچھالنے کا جذبہ ضرور ملتا ہے۔ احساسِ امارت اور احساسِ برتری بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ انہوں نے شاہد احمد کے خاکے کا جواب لکھا اور اپنے مضمون میں اور بہت سی باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا کہ

''شاہد صاحب نے مجھے مفت کی شراب پینے والا تحریر فرمایا ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ مفت کی وہ پیتے ہیں جن کی جیب میں خاک اڑتی ہے اور جن کی غیرت مفلوج ہوا کرتی ہے اور جو ٹٹ پونجئے خاندانوں یا سود خوار ملاؤں یا غاصب حاکموں کے پٹھو علمائے کرام کے گھروں میں جنم لیتے ہیں اور وہیں تربیت بھی پاتے ہیں۔''

اپنے اسی مضمون میں جوش ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''چونکہ شاہد احمد اور مولوی نذیر احمد صاحب اس کرۂ ارض پر ایسے دو تنہا استثنائی وجود ہیں کہ جہاں تک زبان و ادب کا تعلق ہے ان سے کسی نوع کی کسی ادبی یا لسانی غلطی کا امکان ہی نہیں ہے اور جس طرح انبیاء و آئمہ دائرۂ مذہب میں معصوم تھے یہ دادا اور پوتے بالکل اسی طرح حلقۂ ادب میں معصوم واقع ہوئے ہیں۔ چونکہ روسیاہ جوش نے

ان معصوموں کی جانب انگلی اٹھانے کا ارتکاب کیا ہے اس لیے ضرور — کوئی بڑی بے ہودگی ہوئی ہوگی جوش کی طرف سے۔

جب کوئی فتنہ زمانے میں نیا اٹھتا ہے
وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

اور کیوں نہ بتائیں کہ شاہد پرستوں کے ساتھ شاہدانِ بازاری اور شاہدانِ مقالہ نگاری کا ازل سے یہی سلوک رہا ہے۔''

ظاہر ہے کہ یہ سب پڑھنے کے بعد شاہد احمد کے تلووں سے لگی اور سر تک پہنچی اور پہنچنی بھی چاہیے تھی۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے عادی تھے۔ چنانچہ شاہد احمد نے جوش نمبر کا اعلان کیا۔ مضامین کی تلاش میں دلّی گئے۔ کراچی میں مضامین جمع کیے۔ وہ مدت سے ساقی کا سارا بارتنِ تنہا اٹھا رہے تھے مستقل مزاجی سے کام میں لگ گئے۔

ویسے بھی وہ جوش سے تپے ہوئے تھے، ہوا یہ تھا کہ ترقی اردو بورڈ کراچی نے مولوی نذیر احمد کی کتاب ''منتخب الحکایات'' شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ شاہد احمد سے کہا گیا کہ کتاب میں جو غلطیاں کتابت اور طباعت کی وجہ سے داخل ہوگئی ہیں ان کی تصحیح کر دیجئے اور کتاب پر آٹھ دس صفحات کا مقدمہ لکھ دیجئے۔ شاہد احمد کو یہ کتاب پاکستان میں تو ملی نہیں۔ دلّی سے ایک نسخہ منگوایا اور ٹھیک ٹھاک کر کے بورڈ کو بھیج دیا۔ ایک مہینے بعد بورڈ کے سیکریٹری شان الحق حقّی کا فون آیا کہ منتخب الحکایات، کا کوئی نسخہ ہو تو بورڈ بھیج دیں۔ بورڈ اس کی قیمت ادا کر دے گا۔ شاہد احمد نے کہا۔ قیمت تو اس کی چھ آنے یا آٹھ آنے ہی ہے مگر وہ کتاب ملتی کہاں ہے۔ پہلے بھی مشکل سے ملی تھی۔ معلوم ہوا کہ ناظرِ ادبی (جوش) نے نہ صرف ان کے مقدمے کی زبان ٹھیک کر دی بلکہ اصل کتاب کی زبان بھی ٹھیک کر دی اور فقرے کے فقرے اس بری طرح کاٹے ہیں کہ اصل عبارت پڑھی نہیں جا سکتی۔ شاہد احمد نے کہا کہ خیر میری زبان تو وہ ٹھیک کر سکتے ہیں مگر جس کی کتابیں پڑھ کر ہم سب نے اردو سیکھی ہے اس کی زبان میں بھی جوش صاحب کو غلطیاں نظر آ گئیں۔ ذرا مجھے بھی اصلاح شدہ نسخہ بھیج دیجئے تا کہ میں بھی جوش کے افادات سے محروم نہ رہوں۔ مگر حقی صاحب نے قضیے کو بڑی خوبی سے ٹال دیا اور شاہد احمد نے دوسرا نسخہ انہیں بھیج دیا۔ شاہد احمد کا بگڑنا بجا تھا۔ جوش ہوں یا کوئی اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مستند اہلِ قلم کی زبان درست کرنے میں جُٹ جائے۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا تھا اس لیے کوئی ناگوار صورت حال پیش نہیں آئی۔ تاہم شاہد احمد نے جب جوش کا خاکہ لکھا تو دیدہ اور شنیدہ دونوں پہلوؤں کا احاطہ کیا اور اپنی سفاکانہ حقیقت پسندی سے گفتنی اور ناگفتنی سب ہی قلم بند کر دیا۔ لیکن جو کچھ لکھا بہت بچ کر اور سنبھل کر لکھا۔

جوش کے جواب نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ شاہد احمد نے ساقی کا جوش نمبر شائع کر دیا اور جواب میں ''نہ جنتی نہ ڈھول بجتے'' کے عنوان سے وہ مضمون قلم بند کر دیا جسے بیسویں صدی کی ہجو یہ اردو نثر کا

بہترین نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جوش نے اپنا مضمون لکھنؤ کی بوجھل نیم شاعرانہ نثر میں لکھا تھا۔ اس مضمون میں اتراہٹ، بڑبولا پن اور حقائق سے گریز ہے۔ الفاظ کا طمطراق اور جاگیردارانہ طنطنہ ہے۔

جوش صاحب کا جواب پڑھ کر محمد حسن عسکری کا ایک پیراگراف ذہن میں آتا ہے۔ جوش اور شاہد کے معرکے سے چند برس پہلے فراق واثر میں چل گئی تھی۔ اس حوالے سے محمد حسن عسکری نے ''جھلکیاں'' میں لکھا تھا کہ:

> ''ذاتی طور پر مجھے اثر صاحب کے مضامین زیادہ پسند آئے کیونکہ جب پُرتکلف، مقطع اور شیروانی کے بٹن گلے تک بند رکھنے والے حضرات غصے میں آ کے اپنی بوٹیاں نوچنے لگتے ہیں تو مجھے یہ تماشا بڑا مزے دار معلوم ہوتا ہے۔ ایسا تماشہ دیکھ کے آدمی انسانی تہذیب کے بہت سے راز سمجھتا ہے۔''

باون تولے پاؤ رتی کی بات کہی عسکری صاحب نے۔ ایسے مضامین میں انسانی تہذیب کے بہت سے بھید کھلتے ہیں اور آدمی پہچانا جاتا ہے۔ شاہد احمد نے اپنا مضمون دلّی کی بولی ٹھولی میں لکھا۔ طنز، تمسخر، پھبتی، کاٹ دار فقرے، جملے سبھی وار کیے ہیں۔ شاہد احمد کے مضمون میں میر امّن کی زبان کی جھلک ہے۔ جوش کے ہاں مرزا رجب علی بیگ سرور کا بھاری بھرکم انداز ہے۔ دونوں کے اسالیب، آہنگ، مزاج اور ذہنی وروحانی روّیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ معرکہ آرائی کوئی اردو زبان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ عام ہے۔ انگریزی ادب میں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو اس معرکے سے کسی طرح کم نہیں بلکہ اس معرکے سے کچھ عرصہ پہلے فراق واثر میں مکالمہ ہو چکا تھا۔ جہاں چار برتن ہوتے ہیں کھٹکتے بھی ہیں۔ بحث وتکرار نہ ہو تو زندگی کا مزا نہیں۔ ہاں دلوں میں کینہ نہیں رہنا چاہئے۔ اردو کی حد تک شاعری کے ہر دور میں معرکہ آرائی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ لڑانے والے لڑاتے ہیں۔ تماشہ دیکھتے ہیں اور الگ ہو جاتے ہیں۔ لڑنے والے لڑتے رہتے ہیں۔ پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتی ہیں۔ جوش وشاہد کے معرکے میں بھی یہی ہوا۔ پھلجھڑیاں چھوٹ گئیں۔ تماشہ ختم ہو گیا۔ ساقی کے جوش نمبر کی اشاعت کے بعد کسی صاحب نے شاہد احمد کو خط لکھا کہ میں جوش کے خلاف ساقی میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ شاہد احمد نے جواب دیا۔ ''وہ باب اب بند ہو گیا ہے۔'' محفلوں میں، تقریبوں میں جوش سے ان کی ملاقات ہوتی تو صاحب سلامت بھی ہوتی اور گفتگو بھی ہوتی۔ شاہد احمد کا انتقال ہوا تو تعزیتی جلسے کی صدارت جوش نے کی۔ میں بھی اس جلسے میں شریک تھی۔ جوش نے کسی قسم کی برگشتگی کا اظہار نہیں کیا۔ اس معرکے کی یادگار ایک کاٹ دار خاکہ اور ہجویہ نثر کے دو اعلیٰ نمونے باقی رہ گئے۔

ساقی کے خاص نمبروں کا سلسلہ چل رہا تھا مگر چونکہ ادبی معرکوں کا باب کھلا ہے ایک اور معرکے کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ معرکہ کیوں شروع ہوا، کیسے شروع ہوا، اس کی تہہ تک پہنچنا تحقیق کرنے والوں کا کام ہے۔ ہوا یہ کہ پروفیسر عزیز احمد کا ایک افسانہ ساقی میں شائع ہوا۔ اس افسانے کے انداز

میں ایک دوسرا افسانہ شائع ہوا۔ جس کے لکھنے والے کا نام صرف ''ع'' لکھا گیا تھا۔ سوال جواب ہوتے رہتے ہیں لیکن پروفیسر عزیز احمد جوابی افسانے سے بڑے بھنائے۔ ایک صبح شاہد احمد کو ایک گمنام خط موصول ہوا جس میں چار مصرعے درج تھے۔ ان مصرعوں میں شاہد احمد کے لیے نہایت بیہودہ گالی تھی۔ عزیز احمد کا خط الگ پہچانا جاتا تھا۔ شاہد احمد کو مکتوب نگار تک پہنچنے میں کوئی دِقّت نہیں ہوئی۔ اب جوان کا پارہ چڑھا تو چڑھا۔ عزیز احمد سے ان کے رسمی تعلقات تھے۔ صاحب سلامت تھی۔ وہ ساقی کے اہلِ قلم میں بھی شامل تھے مگر ان کا یہ روپ شاہد احمد کے لیے بالکل نیا اور انوکھا تھا۔

جوابی کارروائی شروع ہوگئی۔ مئی ۵۲ء کے ساقی میں انتظار حسین کا مضمون ''غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہوکر'' اور جون ۵۲ء کے شمارے میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا مضمون ''سب سے برا ناول نگار'' شائع ہوا۔ اسلم اور شمس زبیری کا رسالہ ''نقش'' ان دنوں جاری تھا۔ اس میں عزیز احمد کے ایک کردار ''غفنفر'' کے حوالے سے ''غفنفر کی ڈائری'' کے عنوان سے ایک بڑا دل چسپ سلسلۂ مضامین شروع ہوگیا۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ عزیز احمد نے بڑی سخت جوابی کارروائی کی۔ قلمی جنگ میں بات بحث وتکرار تک محدود رہتی ہے۔ کسی کو نقصان پہنچانے یا روزگار پر لات نہیں ماری جاتی۔

ہوا یہ کہ لالو کھیت میں ایک راشن کی دکان پر آٹا خریدنے والوں کا ہجوم بڑھا اور مجمع قابو سے باہر ہونے لگا تو پولیس نے خریداروں پر لاٹھی چارج کردیا۔ اس واقعے کو بنیاد بنا کر نقش میں 'لاٹھی رول' کے عنوان سے ایک ادارتی شذرہ شائع ہوا۔ عزیز احمد ان دنوں وزارتِ اطلاعات میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ انہیں خدا ساز موقع ہاتھ آیا۔ وزارت کے افسرانِ اعلیٰ کو باور کرایا کہ یہ ادارتی نوٹ حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔ کھلی ہوئی بغاوت۔ شاہد احمد۔ اسلم اور شمس زبیری تینوں ریڈیو میں ملازم ہیں۔ انہیں بغاوت کے جرم میں ریڈیو سے نکال دیا جائے۔ وزارت نے ریڈیو کے ناظمِ اعلیٰ بخاری صاحب کو لکھا۔ بخاری صاحب بڑے معاملہ فہم انسان تھے۔ انہیں پورا واقعہ معلوم تھا لہٰذا انہوں نے وزارت کو یہ جواب دیا کہ ان لوگوں کو نکالنے سے فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جائے گا۔ مناسب یہ ہے کہ ان تینوں کو محکمانہ سرزنش نامے جاری کردیے جائیں۔ اگر یہ لوگ پھر بھی نہ مانے تو مزید کارروائی کی جائے گی۔ وزارت کے جوائنٹ سیکریٹری شیخ محمد اکرام، عالم بھی تھے۔ شریف آدمی بھی تھے۔ تینوں آدمیوں سے ذاتی طور پر واقف بھی تھے۔ انہوں نے بخاری صاحب کی رائے سے اتفاق کیا۔ محکمانہ سرزنش نامے جاری ہوگئے۔ عزیز احمد دانت پیستے رہ گئے۔

اب انہوں نے ایک اور وار کیا۔ وزارت اطلاعاتِ کے نائب وزیر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھے۔ ان سے شکایت کی کہ شاہد احمد نے مجھے زندگی سے عاجز کردیا ہے۔ مجھے رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انہیں سمجھایئے کہ یہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے شاہد احمد کو بلایا۔ عزیز احمد نے ڈاکٹر صاحب کو اپنی بپتا تو سنادی تھی لیکن

یہ بھول گئے تھے کہ ڈاکٹر صاحب شاہد احمد کے بڑے بھائی منذر احمد کے ہم جماعت اور شاہد احمد کے استاد بھی تھے۔ شاہد احمد نے صورتِ حال بھانپ لی تھی۔ اس لیے جب ملاقات ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ شاہد میاں آپ عزیز کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں تو انہوں نے عزیز احمد کا 'نامہ محبت' جیب سے نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا اور پورا واقعہ سنا دیا۔

عزیز احمد کی بیہودہ تحریر دیکھ کر ڈاکٹر صاحب آگ بگولہ ہو گئے۔ وہ بڑے ضبط اور تحمل کے انسان تھے۔ شریف اور وضع دار تھے۔ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ عزیز احمد ایسی رکیک حرکت بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے شاہد احمد سے کہا ''شاہد میاں آپ جایئے اور اپنا قلمی جہاد جاری رکھیئے۔'' عزیز احمد کا یہ حال ہوا کہ گئے تھے روزے بخشوانے الٹی نماز گلے پڑ گئی۔ بہر حال انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ دو ایک بزرگوں کو بیچ میں ڈالا۔ باہم صلح صفائی ہو گئی۔ شاہد احمد جوابی کارروائی کرنے میں رستم تھے اور معاف کرنے میں حاتم۔ انہوں نے خوش دلی سے عزیز احمد کو معاف کر دیا۔

ریڈیو اسٹیشن سے شاہد احمد، اسلم اور شمس زبیری کے نام سرزنش نامے جاری ہوئے۔ اسلم کے نام جو سرزنش نامہ جاری ہوا تھا، میں نے اُسے پڑھا تھا اور اس کی وصولی کی روداد بھی سنی تھی۔ یہاں اس روداد کا بیان دل چسپی سے خالی نہ ہوگا:

> ''ایک دن اسٹیشن ڈائریکٹر نے شاہد احمد، اسلم فرخی اور شمس زبیری کو اپنے کمرے میں بلوایا۔ اسٹیشن ڈائریکٹر ان دنوں انصار ناصری تھے۔ یہ لوگ کمرے میں داخل ہوئے تو ایک کلرک سرزنش نامے لیے کھڑا تھا۔ اس نے تینوں سے دفتری کاپی پر وصولی کے دستخط لیے۔ انصار نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ وہ کلرک فوراً باہر چلا گیا۔ کلرک چلا گیا۔ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا تو انصار نے کہا ''شدّو بھائی یہ دن بھی دیکھنا تھا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اسلم فرخی اور شمس زبیری کو بھی آنکھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ یہ دونوں بھی باہر چلے آئے۔ شاہد احمد بڑی دیر بعد کمرے سے نکلے۔ بجھے بجھے سے۔ کچھ چپ چپ۔ انصار ان کے ساختہ پرداختہ تھے۔ انہیں کی کوشش سے آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوئے تھے۔ ان کا دستخطی سرزنش نامہ دیکھ کر ان پر جو گزری ہوگی اس کا اندازہ دوسرے نہیں کر سکتے۔ میوزک سیکشن میں واپس آنے کے بعد شاہد احمد نے اس موضوع پر کسی سے کوئی بات نہیں کی۔''

شاہد احمد کی ایک جھپٹ ''نقوش'' کے مدیر محمد طفیل سے بھی ہوئی تھی۔ اس کا تعلق ساقی سے نہیں 'نقش' سے تھا جس پر شاہد احمد کا نام آتا تھا۔ شاہد احمد کے تعلقات محمد طفیل سے بہت شگفتہ اور مخلصانہ تھے۔ وہ نقوش میں مسلسل لکھتے رہتے تھے حالانکہ ادبی رسائل کے مدیر عام طور پر دوسرے پرچوں میں لکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ شاہد احمد کے ہاں اس قسم کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ نقوش میں بھی لکھتے تھے۔ افکار کراچی

میں بھی لکھتے تھے۔ تعلقات کو نباہتے تھے۔

ہوا یہ کہ نقش کے مدیر شمس زبیری نے مضامین جمع کرنے کی کھکھیڑ سے بچنے اور پرچے کو مقبول بنانے کے لیے اسے افسانوی ڈائجسٹ میں تبدیل کر دیا۔ 'نقش' پاک و ہند میں شائع ہونے والے رسالوں کے افسانوں کا انتخاب چھاپنے لگا۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو محمد طفیل کو بجا طور پر شکایت پیدا ہوئی۔ انہوں نے اس روش کے خلاف احتجاج کیا اور کہا کہ دکھ بھریں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔ نجانے کس کس جتن سے کوئی چیز لکھواتا ہوں۔ شائع کرتا ہوں اور شائع ہوتے ہی انتخابی پرچے اسے چھاپ لیتے ہیں۔ یہ احتجاج رائیگاں نہیں گیا۔ محمد طفیل اور شاہد احمد کی بالمشافہ بات چیت ہوئی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ مضمون، مضمون نگار کی اجازت سے دوبارہ شائع ہونا چاہئے۔ مضمون کا کاپی رائٹ رسالے کے پاس ہو تو اس سے اجازت لینی چاہئے۔ رائٹرز گلڈ نے بھی اس فیصلے کی توثیق کی اور یہ اضافہ کیا کہ دوبارہ شائع کرنے والے پرچے ادیب کو رائلٹی بھی ادا کریں۔ ہر تحریر کے لیے الگ اجازت نامے کی ضرورت ہوگی، عام اجازت نامہ حاصل کر لینا کافی نہیں ہوگا۔

یہ فیصلہ تو سیدھے سبھاؤ ہو گیا مگر محمد طفیل نے یہ کیا کہ ادیبوں اور شاعروں سے اپنے نام مختار نامے حاصل کرنے شروع کر دیے۔ لاہور گلڈ کے سیکریٹری وقار عظیم کے دستخطوں سے ایک محضر نامہ جاری ہوا جس میں انتخابی پرچوں کے بائیکاٹ کی اپیل تھی۔ شاہد احمد نے وقار عظیم سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ میں نے طفیل صاحب کے کسی محضر نامے پر دستخط نہیں کیے۔ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے بھی محضر نامے پر دستخط کرنے سے لاعلمی ظاہر کی۔ مطلب یہ کہ ان کے کسی خط یا مضمون سے دستخطوں کے چربے اتار کر محضر نامے میں شامل کر دیے گئے۔ شاہد احمد نے اس پر یہ کہا کہ جب اتنے ذمہ دار ادیبوں کے ساتھ یہ فریب کیا جا سکتا ہے تو اس فہرست کے دوسرے ناموں کے بارے میں کیا رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ محضر نامہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ لیکن شاہد احمد کا موقف کہ نقش کو نقوش سے نہیں ادیب سے اجازت لینی چاہئے، برقرار رہا۔ معرکہ ختم ہو گیا۔ تعلقات بدستور شگفتہ رہے۔

ساقی کراچی کے خاص نمبروں اور ادبی معرکوں کے تعلق سے شاہد احمد کے ادارتی حسن اور سلیقے کی داستان یہاں پہنچ کر ختم ہو گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شاہد احمد نے علمی، ادبی، تاریخی اور معلوماتی سطح پر کن کن اہل قلم کی بازیافت کی اور ان کی کوششوں سے کون کون سے نئے لکھنے والوں کو اعتبار اور وقار حاصل ہوا۔

جن پرانے اور بزرگ ادیبوں نے ساقی کی صدا پر لبیک کہا۔ ان میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر سید سجاد، پرنسپل مشتاق احمد زاہدی، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، پروفیسر وقار عظیم، آغا محمد اشرف، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، مالک رام، ڈاکٹر عبادت بریلوی، جعفر علی خان اثر، فراق گورکھپوری، کلیم الدین احمد اور ملا واحدی جیسے نامور اہلِ قلم شامل تھے۔ شاہد احمد کی کوششوں سے ساقی کے پرانے لکھنے والوں کا حلقہ بڑی حد تک برقرار رہا۔

محمد حسن عسکری بدستور معاونت کرتے رہے۔ 'جھلکیاں' دکھاتے رہے۔ انہوں نے آزادیٔ فکر اور جراتِ اظہار کا جو نمونہ ساقی کراچی کے دوسرے شمارے (اکتوبر ۴۸ء) میں پیش کیا اسے یادگار تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ میں یہاں اس کالم کی ایک جھلک ضرور پیش کروں گی۔ عسکری صاحب لکھتے ہیں:

''مغربی پنجاب کی حکومت نے ایک دن میں تین بڑے ادبی رسالوں کو چھ چھ مہینے کے لیے بند کر دیا ہے۔ نہ تو ان پر مقدمہ چلایا گیا ہے نہ انہیں واضح طور سے یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا جرم کیا ہے۔ بس ایک عمومی بات کہہ دی گئی ہے کہ ان رسالوں میں ایسی چیزیں شائع ہوتی ہیں جن سے امنِ عامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے اور 'نقوش' کے سلسلے میں منٹو کے افسانے ''کھول دو'' کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ ادب کے خلاف اتنا سخت اقدام تو انگریزوں کے زمانے میں بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اگر کسی تحریر پر اعتراض ہوا تو زیادہ سے زیادہ ایک پرچہ ضبط ہو گیا۔ پھر معاملہ عدالت میں پیش ہوا اور وہاں سے فیصلہ ہو گیا۔ ایسے موقعوں پر عموماً رسالوں کو بری ہوتے ہی دیکھا ہے مگر ایسا نادر شاہی حکم تو نہ سنا نہ دیکھا۔ ہمیں تو ادب اور ادیبوں کی بے اثری کا بڑا شکوہ تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ ادیب تو امنِ عامہ کو درہم برہم کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ بفرضِ محال اگر ادیب اس بات کے درپے تھے بھی تو کم سے کم حکومت کو ادیبوں اور غیر ادیبوں میں کچھ تو فرق کرنا چاہئے تھا بلکہ عبدالغفار خان کو بار بار تنبیہہ بھی کی گئی۔ ادبی رسالوں کے خلاف تو ایک دم سے نظر بندی کا حکم آ گیا ہے۔ اگر ادب کا اثر اتنا ہی زہریلا اور فوری ہوتا ہے جتنا اس حکم سے معلوم ہوتا ہے تو پھر حکومت کو اور بھی سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہئے اور کچھ نہیں تو سب سے پہلے دنیاوی مصلحت ہی کا لحاظ ہوتا۔ ہندوستان اس حکم امتناعی سے کتنا فائدہ اٹھا سکتا ہے اور دنیا میں پاکستان کو بدنام کر سکتا ہے کہ وہاں اخبار تو اخبار ادیب تک آزاد نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہماری حکومت کے افسر ذہنی طور سے بڑے معصوم ہیں۔ انہیں واقعی یہ احساس تھا ہی نہیں کہ ہم ادب اور کلچر کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ وہ تو غالباً یہی سمجھتے تھے کہ جیسے اور بیسیوں اخبار ہیں ویسے یہ بھی ہیں اور نہ انہیں یہ پتہ ہے کہ دوسرے ملکوں میں ادب کا کیسا احترام کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ افسر جنہوں نے یہ حکم صادر کیا ہے ایک حد تک بے گناہ ہیں مگر بہر حال وہ ایک آزاد ملک کے افسر ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہماری کس حرکت کی کیا نوعیت ہے اور اس کا اثر کیا ہوگا۔''

عسکری صاحب کا یہ احتجاج کتنا واشگاف اور جرات مندانہ ہے۔ اس احتجاج میں شاہد احمد کو بھی شریک سمجھنا چاہئے کیونکہ کالم یا مضمون معاون کا ہو یا کسی اور کا مدیر بہر حال رسالے کی ہر تحریر کا ذمہ دار ہوتا ہے

اور شاہد احمد تو ساقی کی ہر تحریر اور کتابت خود ہی پڑھتے تھے۔ مجھے یہ بھی خیال آتا ہے کہ شاہد احمد کو پوری دوڑ بھاگ کے باوجود لاہور میں ساقی کا ڈیکلیریشن نہیں ملا تھا۔ چنانچہ وہ لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے اور یہیں سے ساقی کا اجرا کیا تھا۔ اگر انہیں لاہور میں ڈیکلریشن مل جاتا تو پھر پابندی لگنے والے ان تین رسالوں میں چوتھا نام ساقی کا ہوتا کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے معتوب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے شاہد احمد پر بڑا فضل کیا۔ انہیں لاہور میں ڈیکلریشن مل جاتا تو 'ساقی' باقی نہ رہتا۔ قدرت کے کھیل نیارے ہیں۔ کبھی کبھی برائی میں بھلائی کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ قدرت کو کیا منظور ہے انسان کو یہ وقت گزرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے۔

عسکری صاحب اردو ادب میں ایک تنقیدی دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاہد احمد اور ساقی دونوں کو اس دبستان کی تشکیل میں دخل ہے۔ ساقی کراچی کے اوراق کو ایک بزرگ کرم فرما پیر و مرشد استاد الاساتذہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب علیہ الرحمۃ کی عالمانہ اور وقیع تحریروں کی اشاعت کی سعادت و افتخار حاصل ہوا۔ یہ سلسلہ ڈاکٹر صاحب کے حیدر آباد سندھ منتقل ہونے تک مسلسل جاری رہا۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ 'معارف' اعظم گڑھ اور 'اورینٹل کالج میگزین' لاہور کے معتبر اہلِ قلم میں شامل تھے۔ ۱۹۵۶ء تک ہر مہینے آپ کا کوئی نہ کوئی علمی اور تنقیدی مضمون ساقی کے صفحات کی زینت بنتا تھا۔ شاہد احمد نے ڈاکٹر صاحب سے اِستفادے کے لیے یہ بھی کیا کہ جب انہیں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا تنقیدی مجموعہ ''روایت کی اہمیت'' تبصرے کے لیے موصول ہوا تو انہوں نے وہ مجموعہ ڈاکٹر صاحب قبلہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑا عالمانہ تبصرہ لکھا جو ساقی میں شائع ہوا۔ اسی طرح جب انہیں احتشام حسین کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''زندگی، ادب اور شعور'' موصول ہوا تو انہوں نے یہ مجموعہ بھی ڈاکٹر صاحب کے سپرد کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس پر سیر حاصل تبصرہ لکھا۔ یہ تبصرہ بھی ساقی میں شائع ہوا۔

ساقی کے نئے لکھنے والوں کی فہرست طویل ہے۔ اس طویل فہرست میں پہلا نام ڈاکٹر جمیل جالبی کا ہے جو ساقی کے معاون مدیر بھی رہے اور ''باتیں'' کے عنوان سے ہر ماہ ایک سلسلہ مضامین بھی لکھتے رہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''باتیں'' میں ادبی تنقید کو بڑے دل چسپ اور باتوں کے انداز میں پیش کر کے اپنی انفرادیت قایم کر لی۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے قاری سے آسان اور روزمرّہ کے پیرائے میں باتیں کر رہے ہیں۔ باتوں کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے متعدد مضامین بھی ساقی میں شائع ہوئے۔

ڈاکٹر خان رشید اور خالد حسن قادری نے بھی معاون کی حیثیت سے کام کیا۔ خان رشید ایک ماہانہ سلسلہ ''پیمانے'' کے عنوان سے لکھتے تھے۔ خالد حسن قادری نے ساقی کے جوبلی نمبر کی اِشاعت میں شاہد احمد کی معاونت کی اور کچھ افسانے بھی لکھے۔

نئے لکھنے والوں میں ایک اہم نام سلیم احمد کا ہے۔ سلیم احمد نے ساقی میں شاعری سے ابتدا کی تھی لیکن جلد ہی وہ تنقید کی طرف آ گئے۔ ادبی تنقید کے حوالے سے ساقی کے بعض مضمون نگار دبستانی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سلیم احمد، ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، اسلوب احمد انصاری، نظیر صدیقی،

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی اور ڈاکٹر محمد عقیل قابلِ ذکر ہیں۔ سلیم احمد نے اردو تنقید میں بڑے فکر انگیز مباحث چھیڑے اور بڑی شہرت حاصل کی۔ ممتاز حسین مارکسی تنقید کے معتبر نقاد کی حیثیت سے جانے پہچانے گئے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ حلقۂ ساقی کے ان تنقید نگاروں نے اردو تنقید کو نیا رنگ و آہنگ دیا۔

ساقی میں شائع ہونے والے محمد حسن عسکری کے سلسلہ مضامین ''جھلکیاں'' کتابی صورت میں شائع ہو گئے ہیں اور اردو تنقید کی اہم دستاویز سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''باتیں'' کے علاوہ جو تنقیدی مضامین لکھے وہ بھی کتابی شکل میں شائع ہو گئے ہیں۔ ممتاز حسین کے تنقیدی مجموعے فکر انگیز اور توجہ طلب ہیں۔ ساقی کے حلقۂ تنقید کے ایک اہم رکن ڈاکٹر محمد احسن فاروقی بھی تھے جنھوں نے ساقی میں فکشن کی تنقید پر سیر حاصل مضامین لکھے اور فکشن کی تنقید کو اعلیٰ سطح تک پہنچایا۔ عسکری صاحب، ڈاکٹر جمیل جالبی، سلیم احمد، ڈاکٹر احسن فاروقی اور ممتاز حسین کے جوہر کو آشکار کرنے میں شاہد احمد اور ساقی دونوں کی ادبی خدمات کا بڑا دخل ہے۔ ڈاکٹر فاروقی کے بیشتر تنقیدی مضامین جو فکشن کے حوالے سے لکھے گئے تھے کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے۔ ساقی کے اوراق میں محفوظ رہے تحقیق و ادب کے طلبہ ان مضامین کی وجہ سے کراچی کی غالب لائبریری اور بیدل لائبریری میں ساقی کے مختلف شماروں کا مطالعہ کرتے نظر آتے ہیں۔

نئے حلقہ بگوشوں میں بعض بزرگ بھی تھے۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے علمی اور تاریخی مضامین، ڈاکٹر شوکت سبزواری کے تحقیقی مضامین'' کئی چاند تھے سر آسماں'' کے ایک کردار سلیم جعفر کے علمی مضامین، ڈاکٹر غلام یزدانی کے تاریخی مضامین سے ساقی کراچی کے علمی وقار میں اضافہ ہوا۔ ساقی کے قدیم دہلوی معاون اشرف صبوحی اور صادق الخیری نے بھی ساقی کراچی کی معاونت کا حق ادا کیا۔ نئے ابھرنے والے ادیبوں میں نثار احمد فاروقی، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر خلیق انجم، الیاس عشقی، اسلم پرویز، نظیر صدیقی، مجتبیٰ حسین، عزیز حامد مدنی، جلال الدین احمد، بسم اللہ نیاز احمد اور ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے نام اہم ہیں۔ ان سب نے آگے چل کر بڑی شہرت حاصل کی اور ان کا نام اردو تنقید و تحقیق میں بہت نمایاں ہوا۔

اس ساری روداد سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ افسانوی ادب کے فروغ کی طرح علمی تنقیدی اور تحقیقی مباحث کے فروغ میں بھی 'ساقی' کراچی اور شاہد احمد نے نمایاں کردار انجام دیا— ستمبر ۱۹۴۸ء سے اپریل ۱۹۶۷ء تک ساقی میں ادب، علم، تاریخ، ثقافت، تہذیب، روایت اور جاذبیت کی ایک دنیا آباد رہی جو ادبی تاریخ کا زرّیں باب ہے۔

ساقی کی بزمِ شعر بھی بڑی بارونق رہی۔ دورِ کراچی میں اساتذہ اور نئے شاعروں کے کلام کی کثرت رہی۔ (درویشِ کافر جامہ) امین حزیں اور اثر صہبائی ساقی کے جنم جنم کے رفیق تھے۔ ساقی کراچی آ گیا۔ ان کا کلام حسبِ دستور شائع ہوتا رہا۔ فراق کی غزلیں، جوش کی رباعیات (جوش نمبر کی اشاعت سے پہلے) حیرت شملوی کی غزلیں شائع ہوتی رہیں اور ثاقب کانپوری، ہادی مچھلی شہری، قاسمی صاحب، رضا علی وحشت

کلکتوی، صبا اکبر آبادی رعنا اکبر آبادی، صفیہ شمیم ملیح آبادی، جھنگ رنگ کے فن کار شیر افضل جعفری، شاد عارفی، سلام مچھلی شہری، عبدالحمید عدم، فضلِ احمد کریم فضلی، یوسف ظفر، باقی صدیقی، شہرت بخاری، فارغ بخاری، کرشن موہن، شان الحق حقی، ادیب سہارن پوری، رئیس امروہوی، نہال سیوہاروی، سلیم احمد، ذوالفقار بخاری، حبیب اشعر اور موج علیگ بھی اس محفل میں شریک نظر آتے ہیں۔

ساقی کے نئے شاعروں میں بانی، شہریار، خلیل الرحمٰن اعظمی، مخمور سعیدی، محشر بدایونی، حامد اللہ افسر، ابنِ انشا، عبدالعزیز خالد، تیغ الہ آبادی، زیب غوری، رفعت سروش، شاہین غازی پوری، ارم لکھنوی، یاور عباس، محبوب خزاں، اطہر نفیس، کشور ناہید، عرش ملسیانی، وجد چغتائی، انور احسن صدیقی، افسر سیمابی احمد نگری، حبیب جالب، اختر انصاری اکبر آبادی، علیم اختر مظفر نگری، من موہن تلخ اور بہت سے دوسرے شاعر شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر آج ہماری شاعری کے معتبر نام ہیں۔ شاہد احمد نے ان کے کلام سے ساقی کو زینت دے کر انہیں اور ساقی دونوں کو اعتبار بخشا ہے۔ بحیثیت مدیران کا یہ کارنامہ قابلِ قدر اور اہم ہے۔ ساقی کراچی میں شائع ہونے والی غزلوں اور منظومات کا مطالعہ اردو شاعری کے نئے رجحانات کا کی تفہیم کا مُرقّع ثابت ہوگا۔ یہ اردو شاعری کے ایک پورے دور کا احاطہ کرتا ہے۔

بالآخر ایوانِ ادب میں بے شمار نئی شمعیں روشن کرنے کے بعد اپریل ۶۷ء میں شاہد احمد کی اِدارت میں شائع ہونے والا ساقی کا آخری شمارہ بھی شائع ہوگیا۔ اس شمارے کی ''نگاہِ اولین'' میں انہوں نے بڑے کرب سے لکھا:

''حملہ تو بڑا سخت ہوا تھا مگر زندگی تھی بچ گیا۔ خدمت کرنے کی کچھ مہلت مل گئی۔ رسمِ دنیا تو یہ ہے کہ پکّی عمر والوں کو چھٹی دے دی جاتی ہے تا کہ وہ باقی عمر سکون سے گزار دیں مگر شاید ادب کی نوعیت بھی عشق جیسی ہے کہ

اس کو چھٹّی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

تقریباً سبھی عیادت کرنے والوں نے اس نیک خواہش کا اظہار کیا ہے کہ مجھے طویل عمر ملنی چاہیے تا کہ اردو ادب کی خدمت ہوتی رہے۔ خود اپنا بھی یہی حال ہے کہ

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

جیتے جی تو میں ادب سے قطع تعلق کر نہیں سکتا مگر سدا کون جیتا ہے؟ اس لیے ذرا اس پر بھی غور کر لینا چاہیے کہ

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد''

نہ ساقی رہا، نہ صلائے ساقی اور نہ شاہد احمد، رہے نام اللہ کا۔

تراجم اور تصانیف

شاہد احمد کو علم وادب ورثے میں ملے تھے۔ دادا بھی ادیب، باپ بھی ادیب، دادا کی سات ناولوں کی کہکشاں آج بھی جگمگا رہی ہے۔ باپ کے دو ناول ''اقبال دلہن'' اور ''حسنِ معاشرت'' اپنے عہد میں بڑے مقبول ہوئے۔ تین تین چار چار ایڈیشن شائع ہوئے۔ باپ کو لکھتے پڑھتے دیکھ کر شاہد احمد کے دل میں بھی لکھنے کا شوق یقیناً پیدا ہُوا ہوگا۔ ڈاکٹر سیّد محمد عارف کی تحقیق یہ ہے کہ ان کا ایک افسانہ ''مالی کی لڑکی'' لاہور کے رسالے شبابِ اردو میں فروری ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد ایک اور افسانہ ''دیوانہ'' اگست ۲۹ء میں شائع ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے لکھنے لکھانے کی ابتدا افسانے سے ہوئی اور افسانے سے ان کی دل چسپی تمام عمر قائم رہی۔

جنوری ۳۰ء میں ساقی جاری ہوا تو اس میں شاہد احمد کی دو تحریریں تھیں۔ ایک تو وہ اداریہ تھا جس کا اقتباس پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ دوسری تحریر دو صفحوں پر مشتمل ایک افسانہ تھا ''تجلّی'' آخر میں ''ماخوذ'' لکھا ہوا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ افسانے کا مرکزی خیال کہیں سے اخذ کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ شاہد احمد کے ابتدائی دور کی افسانوی تحریر ہے اس لیے ایک اقتباس دیکھنا ضروری ہے:

''ایک تنِ تنہا مسافر روشنی میں نمودار ہوا۔ ننگے سر اور ننگے پاؤں۔ اس نے اپنی حسرت بھری آنکھیں اوپر کی طرف اٹھائیں۔ ٹھٹکا، دیکھا اور مسکرایا۔ اس کے جوڑ جوڑ میں درد تھا اور اس کے ہاتھ محنتِ شاقہ اٹھانے سے سخت ہو گئے تھے۔ اس کا چہرہ زرد اور افسردہ تھا۔ مگر خوبصورتی اور رعب داب کے آثار ظاہر تھے۔ اس کے خشک لبوں میں جنبش ہوئی اور ایک خوشی کا نعرہ بلند ہوا۔''

''میرے معبود یہ تجلّی تیری ہے۔ الحمدللہ۔''

اس کی سریلی آواز فضائے خاموش میں گونج گئی۔ پردارِ طفلِ نحیف جواب تک سرگرمِ آہ وفغاں تھا چونکا اور مسافر کے قریب آیا۔ اس کے قدموں کو بوسہ دیا اور بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا:

''تو کون ہے؟ کہ اس تجلّی کی تلاش میں اتنی دور سخت مصیبتیں اٹھا کر آیا ہے۔ حسد وبغض سے تجھے مطلق سروکار نہیں معلوم ہوتا۔ خالق کی حمد وثناء تیرے ہونٹوں پر ہے۔''

مسافر نے مسکرا کر کہا۔

''او محبت کے فرشتے۔ میں وہ بد بخت ہوں جس سے تمام کائنات متنفر ہے۔ دنیا مجھے حقارت و نفرت سے دیکھتی ہے۔ میرا کوئی شریکِ حال نہیں اور نہ کوئی خیر خواہ ہے۔ میں نے تنہا اس تجلّی کی جستجو کی اور آخر کار پالیا۔ اسی لیے میں اس تجلّی کے پیدا کرنے والے کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ہراساں نہ کیا۔ میرا نام صدق ہے۔

ایک بار پھر سایہ نمودار ہوا مگر اب وہ ایسا نہ تھا۔ ایک نور تھا جو تجلّی میں شامل ہوتا جاتا تھا۔ تھکے ہوئے ''صدق'' نے اس نور کو جذب کرنا شروع کیا۔ اس کی کھوئی طاقتیں واپس آ گئیں۔ محبت نے اپنے طفلانہ اشک خشک کیے۔ دور سے فرشتوں کی حمد و ثناء کی آواز آئی اور تجلّی پہاڑوں پر پھیلی ہوئی تھی۔''

جولائی ۳۴ء میں انہوں نے ساقی کے ''طرحی'' افسانہ نمبر کے لیے ایک طویل افسانہ لکھا تھا۔ ''خوابوں کی بستی اور حقیقت کی دنیا''۔ تیئس صفحات پر مشتمل اس افسانے کو شاہد احمد کے افسانوی اسلوب کا دلکش نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ دو سہیلیوں کی بے تکلفانہ بات چیت میں بھرپور نسوانی لہجہ اور افسانے کے حوالے سے خوابناک افسانوی انداز ہے۔ اس افسانے سے ایک اقتباس پیش کرتی ہوں:

''ٹوٹے ہوئے تاروں کو مت چھیڑو۔ ان میں نغمہ کہاں۔ ان کی جھنکار تمہیں پریشان کر دے گی۔ نغمہ سن کر جھوم جانے والے دوست۔ شکستِ نغمہ بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ تم رباب کے تاروں سے کھیلتے رہے اور یوں بیدار ہونے والے ترنم میں کچھ ایسے کھوئے گئے کہ مضراب، ضرب و رباب سب کچھ بھول بیٹھے۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے تم نے سارے تار توڑ دیے۔ پھر تم ان کی صدائے سمع خراش سے چونکے اور تم نے ایک حقارت کا قہقہہ لگا کر اس رباب شکستہ کو دور پھینک دیا اور دوسرا رباب اٹھا لیا مگر تم نے وہ آخری جھنکار نہیں سنی جو یوں حقارت سے پھینکے جانے پر رباب سے بلند ہوئی۔ اس میں سیکڑوں دکھی روحوں کی جگر پاش چیخیں تھیں۔ ہزاروں بیواؤں کے بین کا شور تھا۔ لاکھوں یتیموں کی دل خراش چیخ پکار تھی۔ کروڑوں مظلوموں کی دردناک آہ و زاری تھی۔ کیا اب بھی مجھے بتانے کی ضرورت ہے کہ ''شکستِ نغمہ'' کیا چیز ہوتی ہے۔''

رومانوی افسانوں کی جذباتیت، شاعرانہ اسلوب اور سجی ہوئی نثر، ہر ہر لفظ سے آشکار ہے لیکن شاہد احمد نے افسانے لکھنے کا سلسلہ ختم کر دیا اور مغرب کے شاہ کاروں کو اردو میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ ان شاہ کاروں میں بھی رومانوی انداز کی جھلک تھی۔ ترجموں کے ساتھ ساتھ انہوں نے دتی کو بھی اپنی توجہ کا مرکز قرار دیا۔ دتی والوں کے خاکے لکھے اور ایسے لکھے کہ ہر خاکہ ایک ادبی شاہ کار قرار پایا۔

شاہد احمد کی کتابوں کی تفصیل کچھ یوں مرتب ہوتی ہے:

(۱) تراجم۔ (ادبی)

نرگسِ جمال (۱۹۳۴ء)

پروین و ثریا (۱۹۳۴ء)

سرگزشتِ عروس (۱۹۳۶ء)

فاؤسٹ (۱۹۳۷ء)

پھانسی (۱۹۳۷ء)

حیرت ناک کہانیاں (۱۹۵۵ء)

انوکھی کہانیاں (۱۹۵۷ء)

دھان کا گیت (۱۹۵۷ء)

عثمان لبطور (۱۹۵۷ء)

(غیر ادبی)

غریب لڑکے جو نامور ہوئے (۱۹۴۸ء)

انتخاب معاش (۱۹۶۳ء)

بچے بدتمیزیاں کیوں کرتے ہیں

بچّوں کے سیکھنے کی قابلیت بڑھانا

بچّوں کے خوف (۱۹۶۳ء)

بچّوں کی نشوونما (۱۹۶۳ء)

کامیاب باپ (۱۹۶۳ء)

بچّوں کے جذباتی مسائل (۱۹۶۳ء)

بچّوں میں جذبہ عداوت (۱۹۶۳ء)

بچّوں کی معاشرتی زندگی

آپ کے بچّے کی وراثت

بچّے کی اخلاقی قدریں

خودشناسی

بچّوں کی جنسی تعلیم

بچّوں کے کھیل

والدین اور معلّمین

بچّوں کی دلچسپیاں

مغربی پاکستان میں خواتین کیا پڑھتی ہیں (ایک جائزہ رپورٹ)

(۲) خاکے

گنجینۂ گوہر

بزمِ خوش نفساں مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی ۱۹۹۱ء

طاقِ نسیاں مرتبہ ڈاکٹر سید محمد عارف

(۳) دلی کے حوالے سے

دلی کی بپتا ۱۹۵۰ء

اجڑا دیار ۱۹۶۷ء

یہ تو ہوئیں کتابیں۔ ان کتابوں کے علاوہ افسانوں، طویل افسانوں، خاکوں، تنقیدی مضامین، موسیقی کے بارے میں مضامین، بعض تقریبوں اور اجلاسوں کا آنکھوں دیکھا احوال، ساقی کے اداریے، پاک بھارت جنگ کی روداد اور بے شمار ریڈیائی فیچر بھی شامل ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر چیزیں ساقی، نقوش اور بعض دوسرے رسالوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ اگر شائع ہو جائیں تو ادب کا بہت بڑا ذخیرہ محفوظ ہو جائے۔

مطبوعہ کتابوں میں ترجمہ کی ہوئی نو کتابیں ہیں۔ پہلی دو کتابیں ''نرگسِ جمال'' اور ''پروین وثریا'' ہیں۔ پروین وثریا کے ترجمے میں فضل حق قریشی بھی شریک تھے۔ یہ دونوں ترجمے بے سبب نہیں ہوئے۔ شاہد احمد کو بلجیم کے ایک ادیب مارس میٹرلنک کی تحریریں بہت پسند تھیں۔ غالباً کچھ ذہنی ہم آہنگی بھی محسوس ہوئی تھی مگر میں نے یہ دونوں ترجمے نہیں دیکھے۔ بڑی تلاش کی۔ کنوؤں میں بانس ڈالے مگر کہیں نہیں ملے۔ کراچی کے ایک تاجر کتب اکرام احمد نے ان دونوں ترجموں کی اشاعت کا اعلان بھی کیا تھا لیکن اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ لہٰذا ان ترجموں کے بارے میں میرے لیے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ ہاں شاہد احمد کے دستِ راست، دوست اور افسانہ نگار صادق الخیری نے جنوری ۳۳ء کے ''ساقی'' میں نرگسِ جمال پر ایک نظر کے تحت ایک مضمون لکھا تھا۔ انہوں نے اپنے مضمون میں میٹرلنک کی فکر اور روحانیت اور نفسیات کے پیچیدہ مسائل کو سلاست اور حسن سے پیش کرنے کو سراہا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ:

''ترجمہ شستہ، صاف اور اس قدر لطیف ہے کہ اس پر مستقل تصنیف کا دھوکا ہوتا ہے یعنی مصنف کے خیالات اور فلسفیانہ مسائل مترجم کے دماغ میں اس طرح پیوست معلوم ہوتے ہیں کہ وہ مجبوراً اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں ان کو بے ساختہ ادا کر دیتا ہے۔ نازک سے نازک بحثیں، معمولی روزمرہ جہاں تک ساتھ دے سکتا تھا اس برجستگی کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھالی گئی ہیں کہ دماغ پر زور ڈالنے کی ضرورت

نہیں ہوتی اور خود بخود ذہن نشین ہوتی چلی جاتی ہیں..... فلسفیانہ ادب کے لیے جس خاص طرز تحریر کی ضرورت ہوتی ہے وہ ضرورت کامل احتیاط سے پوری کی گئی ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ مغربی تخیلات کو سادہ پرکار انداز میں ادا کر کے ہمارے لیے گوارا بنا دینا کچھ بھائی شاہد احمد صاحب ہی کے قلم کا کام تھا مثلاً:۔

''مستقبل ایک ایسی دنیا ہے جسے ہم نے خود محدود کر دیا ہے۔ جس میں ہم صرف ان چیزوں کو معلوم کر لیتے ہیں جن کا تعلق ہماری ذات سے ہوتا ہے یا کبھی کبھی اتفاق سے ان چیزوں کا علم بھی ہم کو ہو جاتا ہے جو ہماری محبوب ترین ہستیوں سے متعلق ہوتی ہیں۔''

''غم اس وقت تک رونما نہیں ہوتا جب تک کہ محبت کا تسلط رہتا ہے۔''

مقاصد زندگی کے لیے انسانی کمزوریاں اکثر بہت ضروری ہوتی ہیں۔''

صادق الخیری ہی نہیں نیاز فتح پوری نے بھی اس ترجمے کی تعریف کی تھی ادبی دنیا میں بھی اس پر بڑا اچھا تبصرہ شائع ہوا تھا۔

میٹرلنک اور شاہد احمد کی ذہنی ہم آہنگی کو تبصرہ نگاروں نے محسوس کیا لیکن شاہد احمد کے تراجم کا ایک پہلو اور بھی ہے، وہ اردو زبان و ادب میں ترجمے کی روایت کے امین تھے۔ مولوی نذیر احمد کا شمار اردو کے بہترین مترجموں میں ہوتا ہے۔ شاہد احمد کے والد مولوی بشیر الدین احمد بھی اچھے مترجم تھے۔ انہوں نے انگریزی کی معلوماتی کتابوں کے بڑے کامیاب ترجمے کیے تھے۔ مثل مشہور ہے۔ مچھلی کے جائے کو تیرنا کون سکھائے۔ ترجمہ کرنا تو شاہد احمد کی گھٹی میں پڑا تھا۔

کتابی شکل میں شائع ہونے والا تیسرا ترجمہ ''سرگزشتِ عروس'' ہے جو ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس ترجمے کے آغاز میں ناشر کی جانب سے یہ اعلان تھا:

''یہ روزنامچہ بالکل اسی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے جس صورت میں لکھنے والی کے نمائندے نے ہمیں دیا اور پبلک کے سامنے بحیثیت ایک نمایاں و سبق آموز دستاویز پیش کیا جا رہا ہے اور مفید مطلب تاثراتِ قلبی کی تصویر ہونے کے علاوہ رُفت کے خاص خاص حالات کی تفسیر بھی ہے بڑے بڑے ملکوں مثلاً لندن و پیرس کے علاوہ سب نام بدل دیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں سے بعض ٹکڑے نکالنے ہی مناسب سمجھے گئے لیکن اس کے باوجود ہمیں یقین ہے کہ یہ روزنامچہ مطلقاً اسی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے جس میں اسے لکھا گیا تھا۔''

اس اعلان سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ سرگزشتِ عروس ترجمہ ہے جس میں کہیں کہیں اصل سے انحراف کیا گیا ہے۔ افرادِ سرگزشت کے نام بھی بدل دیے گئے ہیں۔ لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس ناول کا ترجمہ ہے۔ چھپی ہوئی کتاب میں اس جانب کوئی ہلکا سا اشارہ بھی نہیں۔ مترجم نے اسے اپنے تہذیبی رنگ میں اس خوش اسلوبی سے ڈھال لیا ہے کہ ترجمے پر ترجمے کا گمان نہیں ہوتا۔

بیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں انگریزی میں مقبول رومانی ناولوں کی بھرمار ہوگئی تھی۔ ان سب کا موضوع ایک ہی تھا۔ ایک بے یارومددگار حسینہ اور اس کی ایذارسانی پر کمربستہ ظالم سماج۔ سرگزشتِ عروس میں بھی یہی فارمولا ہے۔ ایک ناتجربہ کار کم سن حسینہ، مالی مشکلات کے شکار نوابی خاندان کے والدین، امیر کبیر بوڑھا خطاب یافتہ سرمایہ دار، خوبرو ماموں زاد بھائی، والدین لڑکی کی شادی بوڑھے امیر سے کر دیتے ہیں۔ لڑکی کی ذہنی اور پریشانی اذیتیں، ماموں زاد بھائی کی بدطینتی، والدین کی بے اعتنائی، شوہر کی عیاشیاں اور آخر کار ایک بدکار عورت کے ہاتھوں زخمی ہوکر اپنے انجام کو پہنچنا۔ لڑکی کی ایک شریف اور سچی محبت کرنے والے وکیل سے وابستگی، واقعات ایک دائرے میں گھومتے ہیں جنھیں لڑکی نے اپنے روزنامچے میں قلم بند کیا ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ شاہد احمد نے یہ ناول اردو کے قالب میں کیوں ڈھالا۔ یہ عام انداز کا ایک رومانوی ناول ہے۔ ترجمہ دلکش اور رواں دواں ہے لیکن اس کی کوئی ادبی اہمیت نہیں ہے۔ اس ناول میں ترجمے کی بابت کوئی اشارہ نہ ہونے سے بعض ناقدوں نے اسے شاہد احمد کی تصانیف میں شمار کیا ہے۔

۱۹۳۷ء ہی میں شاہد احمد نے گوئٹے کے مشہور ڈرامے فاؤسٹ کا ترجمہ بھی شائع کیا۔ یہ ترجمہ جنوری تا مارچ ۱۹۳۷ء کے ساقی میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔ کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوا تو مشہور عالم اور ادیب ڈاکٹر عابد حسین نے اس کا پیش لفظ لکھا۔ ڈاکٹر عابد حسین ۱۹۳۱ء میں بذاتِ خود فاؤسٹ کو اردو میں منتقل کر چکے تھے۔ لیکن شاہد احمد کا ترجمہ ان کے ترجمے سے مختلف تھا۔ میں یہاں اس پیش لفظ کو پیش کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔ اس پیش لفظ سے فاؤسٹ اور شاہد احمد کے ترجمے دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''گوئٹے نے اپنے شہرۂ آفاق ڈراما فاؤسٹ کی بنیاد جرمن ادب العوام کے ایک مشہور قصے پر رکھی تھی جو اس کے زمانے میں بہت مقبول تھا۔ عوام کی اکثر کہانیوں کی طرح اس کہانی میں بھی ایک فلسفیانہ حقیقت دبی اور سمٹی ہوئی تھی جسے گوئٹے نے اپنے ڈرامے میں ابھارا اور پھیلایا۔ گوئٹے اس راز سے واقف تھا کہ زندہ اور پائدار ادب وہی ہے جو عوام کی سمجھ میں آسکے اور ان کے دل میں بھی گھر کر سکے۔ اس بات کو وہ ''تماشا گاہ کے تمہیدی سین'' میں مسخرے کی زبان سے ان الفاظ میں ادا کرتا ہے۔

''جسے اپنے خیالات دلچسپ پیرائے میں ادا کرنا آتا ہے وہ عوام کے تلوّن کا رونا نہیں روتا۔ اس کے لیے تو جتنا بڑا حلقہ ہو اتنا ہی اچھا۔ جتنے ہی زیادہ لوگ ہوں گے اتنا ہی زیادہ ہوگا۔''

فاؤسٹ کا پہلا حصہ، اپنی فلسفیانہ گہرائی اور شاعرانہ نزاکت کے باوجود گوئٹے کے زمانے میں عام فہم اور عام پسند تھا۔ مگر سو سال میں زمانے کا مذاق بہت بدل گیا ہے خصوصاً سینما نے پبلک کی نظروں کو ایسے حیرت انگیز اور ہیجان خیز مناظر کا عادی کر دیا ہے کہ گوئٹے کا فاؤسٹ اب عام پسند نہیں رہا۔ چنانچہ اس

ڈرامے کو پردۂ تصویر پر لانے کے لیے اس میں تصرف اور رنگ آمیزی کی گئی اور اس طرح وہ فاؤسٹ وجود میں آیا جس کا ترجمہ شاہد احمد صاحب مدیرِ ساقی نے اردو میں کیا ہے۔

اصل کتاب کے متعلق مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ اس کا خاکہ وہی ہے جو گوئٹے کے فاؤسٹ کا تھا مگر قصہ کو زیادہ دلچسپ اور فلم کے قابل بنانے کے لیے اس میں بہت کچھ تصرف کیا گیا ہے، مناظر کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔ اصل ڈرامے کے بعض منظر چھوڑ دیے گئے ہیں اور بعض نئے منظر بڑھائے گئے ہیں۔ اس ردّو بدل سے قصے کی دلچسپی میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ ظاہر ہے کہ معنوی خوبیوں کے لحاظ سے اسے گوئٹے کے ڈرامے سے کوئی نسبت نہیں مگر ع

بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

اور تماشہ دیکھنے سے اہلِ نظر بھی نہیں چوکتے۔ فاؤسٹ کا یہ نیا چولا ذوقِ تماشائی کی بخوبی تسکین کرتا ہے۔ ادبی قدر و قیمت اس کی یہ ہے کہ یہ گوئٹے کے فاؤسٹ کے لیے تعارف کا کام دیتا ہے اور یہ کچھ کم نہیں۔

ترجمہ شاہد احمد صاحب نے ایسا ہی کیا ہے جیسی ان سے توقع تھی — صاف، سلیس، رواں اور شگفتہ۔ ادبی کتابوں کا ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں، جو عبارت یوں پڑھنے میں اچھی خاصی سہل معلوم ہوتی ہے ترجمہ کرنے بیٹھیے تو پہاڑ ہو جاتی ہے۔ شاہد صاحب کو جو کوہ کنی کرنی پڑی اسے انہی کا دل جانتا ہوگا۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ جوئے شیر لانے میں کامیاب ہوگئے۔''

ڈاکٹر عابد حسین کی اس رائے کے بعد ''فاؤسٹ'' کے ترجمے کے بارے میں مزید کچھ کہنا غیر ضروری ہے۔ صرف یہ کہنا کافی ہے کہ ایک ادبی شاہ کار کا ترجمہ بھی ادبی شاہکار ہے۔ شاہد احمد نے یہ ترجمہ مولوی عنایت اللہ کے نام معنون کیا تھا۔

''فاؤسٹ کے ترجمے کے بعد شاہد احمد نے روسی ادیب آندریف کے ایک طویل افسانے'' ''The seven who were Hanged'' کو 'پھانسی' کے عنوان سے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ یہ ترجمہ جنوری تا جون ۴۰ء کے ساقی میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔ بعد میں اسے اردو نشر گاہِ دہلی نے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ ۱۹۹۵ء میں آصف فرخی نے اسے ایک تفصیلی تعارف کے ساتھ از سرِ نو شائع کیا۔

آصف فرخی نے اپنے تعارف میں آندریف کے ادبی کارناموں، روسی ادب میں اس کے مقام اور عالمی ادب میں اس کی حیثیت کا جائزہ لیا ہے۔ ترجمے کے حوالے سے اُنہوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:

''شاہد احمد کو طویل افسانے کے ترجمے سے خاص مناسبت تھی۔ چنانچہ انہوں نے جیمز جوایس کا ''مُردے۔'' ہیمنگ وے کا ''کلمین جارو کی برف'' آندرے ژید کا ''تھیسی ایس'' ''ایملی زولا کا ''جولین'' اور ''سارتر کا دیوار'' ترجمہ کیے۔ افسانوی ترجموں کے اس خاص انداز کی پہلی جھلک ہمیں

''پھانسی'' میں ملتی ہے اور اس انداز میں شاہد احمد کے جوہر کھلتے ہیں۔''

آصف فرخی نے اس ترجمے کی اہمیت کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''اس ترجمے کی اہمیت میں آج بھی کمی نہیں آئی جبکہ دنیا میں موت کی سزا ختم کرنے کی بحث، پُرتشدد سیاست اور دہشت کے حلقہ در حلقہ رقصِ خونیں اور تاریخی ابتلا میں انفرادی زندگی کی معنویت کے سوالوں سے الجھی ہوئی ہے۔ اس لیے جب میں نے یہ ترجمہ پڑھا تو خیال آیا کہ اسے دوبارہ شائع ہونا چاہیے تاکہ اس کتاب اور اس کے مصنف سے تعارف کی تجدید ہو سکے اور اس تعارف میں شناسائی کا رنگ اور گہرا ہو سکے۔''

شاہد احمد کو اپنے تراجم میں ''پھانسی'' سب سے زیادہ پسند تھا۔ ۱۹۵۳ء کے ایک انٹرویو میں انہوں نے اسے اپنا بہترین ترجمہ قرار دیا تھا۔ یہ ۵۳ء کی بات ہے۔ اس کے بعد انہوں نے متعدد طویل افسانوں کے بڑے خوب صورت ترجمے کیے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بعد کے کسی ترجمے کو اپنا بہترین ترجمہ قرار دیتے۔ ''پھانسی'' کی نئی اشاعت سے اس کی بازیافت ہوئی اور شاہد احمد کا کمالِ فن کتابی صورت میں ایک بار پھر سامنے آیا۔ ان کے دوسرے ترجمے پروین و ثریا، نرگسِ جمال، سرگزشتِ عروس اور فاؤسٹ نایاب تو نہیں کمیاب ضرور ہو گئے ہیں۔

کتابی صورت میں شائع ہونے والے دو ترجموں ''دھان کا گیت'' اور ''عثمان بطور'' کا تعلق شاہد احمد کی پسند ناپسند سے نہیں تھا۔ یہ مارے باندھے کا سودا تھا۔ انہوں نے بذاتِ خود ان ترجموں کو ''مزدوری'' قرار دیا ہے۔ یہ دونوں ترجمے کراچی اور دلّی دونوں جگہ سے شائع ہوئے تھے۔ اس مزدوری کے بارے میں میرا مشاہدہ یہ ہے کہ شاہد احمد نے اصل کتاب یا مضمون سامنے رکھا اور قلم برداشتہ ترجمہ شروع ہو گیا۔ نہ کاٹ چھانٹ نہ ردّ و بدل۔ اسی دوران میں لوگ آتے رہتے۔ باتیں ہوتی جاتیں اور چائے کے دور بھی چلتے رہتے۔ یہ دونوں ترجمے ۵۷ء میں شائع ہوئے تھے۔ ترجمے رواں دواں اور سلیس ہیں۔ ادبی اعتبار سے ان کی اہمیت یہ ہے کہ یہ شاہد احمد کے ترجمے ہیں۔ سجل، زبان و بیان کے اعتبار سے تخلیقی آہنگ کے حامل۔ اکثر مقامات پر ترجمے نے تخلیق کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ بڑا فن کار بہرحال بڑا فنکار رہتا ہے۔

شاہد احمد نے بچوں کے لیے بھی دو کتابیں ترجمہ کی ہیں۔ دونوں مشہور امریکی کہانی نگار نتھینیل ہاتھورن کی کتابوں کے ترجمے ہیں۔ پہلی حیرت ناک کہانیاں A wonder Book کا ترجمہ ہے جو ۱۹۵۵ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ دوسری ''انوکھی کہانیاں Tangle wood Tales کا ترجمہ ہے جو ۱۹۵۷ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ دونوں ترجمے پچاس برس پرانے ہیں۔ پچاس برس پہلے بچوں کی زبان کا انداز آج کے مقابلے میں خاصہ مشکل تھا۔ اس وجہ سے شاہد احمد کے یہ دونوں ترجمے سلاست اور روانی کے باوجود آج کے بچوں کو مشکل معلوم ہوں گے۔ شاہد احمد نے اپنے معیار کے مطابق بچوں کے ادب کے دو شاہکار اردو میں بڑی خوبی سے منتقل کر دیئے۔ ترجمے کے مشکل انداز کی

وجہ یہ بھی ہے کہ ہاتھورن نے اپنی دونوں کتابیں آج سے ایک سو ساٹھ برس پہلے اپنے منفرد اسلوب میں لکھی تھیں اردو ترجمہ بھی اس اسلوب کا نمونہ ہے اور مشکل ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ ایک ترجمہ ''غریب لڑکے جو نامور ہوئے'' کے عنوان سے لاہور سے شائع ہوا اور بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق معلوماتی کتابوں کا ایک پورا سیٹ فرینکلن کی سرپرستی میں کراچی اور لاہور سے شائع ہوا۔ یہ ترجمے عام فہم، سادہ، سلیس اور موضوع کی وضاحت کے اعتبار سے معلوماتی اور مفید ہیں۔ ایک اور ترجمہ ''مغربی پاکستان میں خواتین کیا پڑھتی ہیں'' ایک جائزہ رپورٹ پر مشتمل تھا۔ یہ سارے ترجمے اگرچہ مزدوری کے تحت انجام پائے لیکن جیسا کہ میں بیان کر چکی ہوں ان سب پر شاہد احمد کی چھاپ بہت گہری ہے۔ ان ترجموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایسے مترجم کا کارنامہ ہے جو ترجمے کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ زبان کا بادشاہ ہے اور اصل مصنف کے اسلوب کو اپنی زبان میں منتقل کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔

کتابی شکل میں شائع ہونے والے ان تراجم کے علاوہ شاہد احمد نے بے شمار ترجمے اور بھی کیے۔ برطانیہ، یورپ اور امریکا کا کوئی نامور افسانہ نگار ایسا نہیں ہے جس کے کسی شاہ کار کو انہوں نے اردو میں منتقل نہ کیا ہو۔ بڑی طویل اور بڑی پُر وقار فہرست ہے۔ ان میں سے بیشتر ترجموں کی نئی اشاعت آج کے قاری کے ادبی ذوق کی تشکیل اور تعمیر کا موثر ذریعہ ثابت ہوگی۔

شاہد احمد کے ترجموں کے بعد ان کی طبع زاد کتابوں کا جائزہ ضروری ہے۔ طبع زاد کتابوں میں خاکوں کے تین مجموعے ہیں۔ ''گنجینۂ گوہر، بزمِ خوش نفساں اور طاقِ نسیاں'' ''گنجینۂ گوہر'' پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ سترہ خاکوں پر مشتمل ہے۔ جن اشخاص کے خاکے مرتب کیے گئے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

مولوی نذیر احمد، میر ناصر علی، استاد بینجو دہلوی، خواجہ حسن نظامی، بشیر الدین احمد، مولانا عنایت اللہ، مرزا عظیم بیگ چغتائی، میراجی، سعادت حسن منٹو، جگر مرادآبادی، حکیم کیف دہلوی، پروفیسر مرزا محمد سعید، استاد بندو خان، ایم اسلم، جوش ملیح آبادی، جمیل جالبی اور شاہد احمد دہلوی بقلم خود۔''

شاہد احمد کو خاکہ نگاری کا شوق بھی تھا اور طبعی مناسبت بھی تھی۔ ان کی خاکہ نگاری کا آغاز ساقی کے ابتدائی دور ہی میں ہو چکا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس صنف ادب سے ان کی دل چسپی بڑھتی گئی۔ انہوں نے دل لگا کر ایک سے ایک اچھا خاکہ لکھا اور ان کا شمار اردو کے بزرگ خاکہ نگاروں میں ہونے لگا۔

خاکوں کا دوسرا مجموعہ ''بزمِ خوش نفساں'' ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتب کیا۔ یہ مجموعہ ۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مجموعے کے لیے دو دیباچے اور شاہد احمد کا خاکہ لکھا۔ اس طرح یہ مجموعہ شاہد احمد کے خاکوں کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت اور فن کا جائزہ بھی بن گیا ہے۔

''بزمِ خوش نفساں'' کی اشاعت ۱۹۸۵ء میں ہوئی تھی۔ اس میں تیرہ بڑے خاکے ہیں اور خریطۂ خیال کے عنوان کے تحت تیرہ ہی مختصر خاکے بھی ہیں۔ گویا کل چھبیس خاکے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

مولوی عبدالحق، مولانا عبدالسلام نیازی، شوکت تھانوی، مولانا نیاز فتح پوری، فیض احمد فیض، مولانا صلاح الدین احمد، علامہ راشد الخیری، قاری سرفراز حسین، آغا شاعر قزلباش، کرشن چندر، حفیظ جالندھری، ڈپٹی صاحب (انتصار حسین)۔ نفاست حسین

خریطۂ خیال کے تحت یہ خاکے ہیں۔

میر باقر علی داستان گو، میر جالب دہلوی، شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن، خواجہ ناصر نذیر فراق، نواب سائل دہلوی، مولوی احتشام الدین، مرزا چپاتی۔ نواب تاباں۔ ملا واحدی۔ پنڈت امرناتھ ساحر۔ خلیقی دہلوی۔ مرزا حیرت دہلوی، نہال سیوہاروی۔

مگر اس میں ایک گھپلا بھی ہے۔ شاہد احمد نے شوکت تھانوی کے انتقال پر نقوش کے لیے ان کا خاکہ لکھا تھا۔ یہ خاکہ نقوش میں شائع بھی ہوا لیکن تعلقاتی مصلحت یا کسی اور وجہ سے آخری حصہ شائع نہیں ہوا۔ شاہد احمد نے یہ خاکہ تمام و کمال مارچ ۱۹۶۴ء کے ساقی میں شائع کر دیا۔ ''بزمِ خوش نفساں'' میں شوکت تھانوی کا جو خاکہ شامل ہے وہ ادھورا ہے یعنی وہ خاکہ ہے جس میں آخری حصہ نہیں ہے۔ اس حصے میں شاہد احمد نے شوکت تھانوی کی ایک مظلوم بیوی اور پانچ بچوں کا خصوصی تذکرہ کیا ہے اور مالی معاملات میں اُن کی بدعہدی پر افسوس کیا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ 'بزمِ خوش نفساں' میں یہ حصہ خارج کر دیا گیا۔

شاہد احمد کے خاکوں کا تیسرا مجموعہ ''طاقِ نسیاں'' ہے۔ یہ مجموعہ ان کے کمیاب خاکوں پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر سیّد محمد عارف نے شاہد احمد کے خاکوں کے تفصیلی مطالعے میں یہ کمیاب خاکے دریافت کیے اور انہیں ایک مجموعے میں شائع کر دیا۔ کل ۲۳ خاکے ہیں۔ ان میں سے بعض مناسب اضافوں کے ساتھ دوسرے مجموعوں میں بھی شامل ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد محمد عارف نے اپنے مرتب شدہ اس مجموعے میں تصویروں کا التزام بھی کیا ہے۔

شاہد احمد کا شمار اردو کے بزرگ صاحب طرز اور منفرد خاکہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اردو میں خاکہ نگاری کی روایت مستحکم اور شان دار ہے۔ آبِ حیات میں محمد حسین آزاد کے خاکے خاص طور پر میر اور انشا کے خاکے، نذیر احمد کے ہاں مرزا ظاہر دار بیگ کا خاکہ اردو کے بہترین خاکوں میں شامل ہیں۔ نذیر احمد کی ماہرانہ انسان شناسی نے ایک فرضی کردار کو جیتا جاگتا کردار بنا دیا ہے جو آج بھی زندہ ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکے، نذیر احمد کی کہانی اور وحید الدین تسلیم کا خاکہ۔ بڑے دلکش خاکے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے خاکے ''نام دیو مالی اور نور خان'' مولوی صاحب کی انسان دوستی اور انسان شناسی کے مرقعے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے خاکے ذہانت کے بھرپور حوالے سے انسان شناسی کا منفرد انداز ہیں۔

شاہد احمد بھی انہیں بزرگ خاکہ نگاروں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

نقادوں اور ادب شناسوں نے شاہد احمد کی خاکہ نگاری کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ بعضوں نے ان کی چہرہ نویسی کی برجستگی، حسن کاری اور مصورانہ پیچ وخم کی نشان دہی کی ہے۔ بعضوں نے ان کی دل کی گہرائی میں جھانکنے والی شخصیت شناس نظر کو سراہا ہے۔ کوئی خاکے کے مجموعی تاثر کا دلدادہ ہے۔ کسی نے لکھا ہے کہ شاہد احمد کا لکھا ہوا خاکہ پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ان صاحب سے بذاتِ خود ملے ہیں اور انہیں اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ شاہد احمد بے مثل زبان لکھتے ہیں۔ ان کے ہاں ہلکا ہلکا مزاح اور طنز ملتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ ان کی خاکہ نگاری کے بارے میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ میری رائے میں یہ ساری باتیں درست ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ شاہد احمد بڑے حقیقت پسند خاکہ نگار ہیں۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ جو دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، برملا کہتے ہیں۔ ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں۔ کسی کی پروا نہیں کرتے اور ان کے ہاں ایک سفاکانہ حقیقت پسندی بھی پائی جاتی ہے۔ جو انہیں دوسرے تمام خاکہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کا لکھا ہوا کوئی خاکہ پڑھیے۔ یہ خصوصیت ہر خاکے میں نظر آئے گی۔ انہوں نے خوبیاں بھی بیان کی ہیں اور خامیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی سے انہیں بڑی محبت تھی۔ ان سے ملنے کے لیے جودھپور جیسے ریگستانی شہر کی خاک پھانکنے اکثر جاتے رہتے تھے۔ ضرورت کے وقت روپے پیسے سے بھی ان کی مدد کرتے تھے لیکن ان کی کمزوریوں کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ خاکے میں جان اسی حقیقت پسندی سے آئی ہے۔ میراجی کے خاکے میں انہوں نے میراجی کی شخصیت کا بڑا سچا اور فنکارانہ جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کی تمام تر بری عادتوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی۔ اردو خاکہ نگاری میں ایسی سفاکانہ حقیقت پسندی کہیں اور نظر نہیں آتی۔ شاہد احمد اس حقیقت پسندانہ انداز کے اعتبار سے منفرد خاکہ نگار ہیں۔

شاہد احمد کے خاکوں میں زندگی ہے۔ حرارت ہے۔ کشمکش اور ہلکا سا طنز ہے۔ مدح گستری نہیں سچائی ہے۔ یہ سارے خاکے شاہد احمد کی انسان شناسی شخصیت کی سچی اور حقیقی مصوری، زبان و بیان کی جادوگری اور خلوص و محبت کے منفرد انداز کی روشنی ہیں۔ شاہد احمد کی خاکہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کسی خاکے میں بعض دوسرے خاکہ نگاروں کی طرح اپنے آپ کو وَر نہیں رکھا نہ اپنی ذات کا بے جا اظہار کیا ہے۔

شاہد احمد کی خاکہ نگاری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ انہوں نے ''شنیدہ'' کو بھی ''دیدہ'' کی حیثیت عطا کی ہے۔ جوش کے خاکے کے عنوان ''جوش ملیح آبادی۔ دیدہ و شنیدہ'' پر جوش کو اعتراض تھا کہ سنی سنائی باتیں کیوں لکھی گئی ہیں۔ لیکن باکمال لکھنے والا جو کچھ سنتا ہے اسے اپنے قاری کی آنکھوں کے سامنے لاکر زندہ حقیقت بنا دیتا ہے۔ ''مولانا عبدالسلام نیازی'' کا خاکہ شاہد احمد نے بڑی محبت، خلوص اور فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ لیکن مولانا عبدالسلام سے ان کے تعلقات نہیں تھے۔ نہ کبھی ملاقات

ہوئی تھی۔ دیکھا ضرور تھا۔ رمضان خان اور عثمان خان مولانا کے دو حاضر باش گویئے تھے۔ بیشتر وقت انہیں کے یہاں گزارتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں دلّی کی بربادی کے بعد رمضان خان کراچی چلے آئے۔ عثمان خان وہیں رہ گئے۔ رمضان خان، شاہد احمد کے حاضر باش تھے۔ اکثر صبح کو بیٹھے نظر آتے اور مولانا عبدالسّلام کے حالات بڑی محبت سے سناتے تھے۔ شاہد احمد نے اس شنیدہ کو ایک ادبی شاہ کار میں بدل دیا۔ روایت کو حقیقت میں ڈھالنے کا یہ انداز شاہد احمد کی خاکہ نگاری کا کمال ہے۔

دلّی کے حوالے سے شاہد احمد کی کتابوں کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے یہ کہنا ضروری ہے کہ میر تقی میر اکبر آبادی ہونے کے باوجود جب دلّی سے نکلے اور لکھنؤ گئے تو باقی ساری زندگی دلّی کے ہُڑکے میں مبتلا رہے۔

خاکِ دلّی سے کیا ہم کو جُدا یک بارگی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار

میر امّن کا گھر۔ سورج مل جاٹ نے کھدوا دیا تو وہ بھی جامع مسجد کی سیڑھیوں کو یاد کرتے ہوئے نوحہ کناں عظیم آباد اور کلکتے میں حیران پریشان رہے۔ ۱۸۵۷ء میں دلّی لٹی تو مرزا غالب نے اس تباہی پر آنسو بہائے۔ ''ہائے دلّی۔ وائے دلّی۔ بھاڑ میں جائے دلّی۔'' اور پھر دلّی کی یادوں کو تازہ رکھنے کے لیے خواجہ ناصر نذیر فراق، سیّد احمد دہلوی، منشی فیاض الدین، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ اور اشرف صبوحی نے مضامین اور کتابیں مرتب کیں۔ فراق، سیّد احمد دہلوی، منشی فیض بخش، راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کے ہاں قدیم دلّی کی بازیافت ہے۔ دلّی کا ہُڑکا نہیں ہے۔ کم و بیش یہی کیفیت اشرف صبوحی کے ہاں بھی ہے لیکن شاہد احمد کے ہاں دلّی کا ہُڑکا ہے اور اسی ہُڑکے نے اُن سے ''اُجڑا دیار'' جیسی زندہ کتاب لکھوالی۔ یہ کتاب چھبیس رنگا رنگ مضامین کا مرقع ہے جو شاہد احمد کے بقول وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے۔ ہر مضمون کا رنگ انوکھا ہے مگر سب ایک مرکز دلّی کے گرد گھومتے ہیں اور دلّی کی معاشرتی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی نشان دہی کرتے ہیں:

''۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد دلّی کے اہلِ قلم نے دلّی کے بارے میں خامہ فرسائی کے دو انداز اختیار کیے تھے۔ دربارِ شاہی، قلعۂ معلّٰی اور شاہی ادب آداب کے حوالے سے اداس کر دینے والی تصویریں۔ دوسرا انداز بھی حزن و یاس کا حامل تھا۔ اس میں دلّی کی رونقوں اور چہل پہل کی یادیں تھیں۔ پہلے انداز کا مرقع خواجہ حسن نظامی کی کتاب بیگمات کے آنسو ہے۔ خواجہ ناصر نذیر فراق کے مضامین ہیں۔ دوسرے انداز کا مرقع اشرف صبوحی کی کتابیں ''دلّی کی چند عجیب ہستیاں'' اور ''غبارِ کارواں'' ہیں۔ خواجہ حسن نظامی اور ناصر نذیر فراق نے قلعۂ معلّٰی کو ایک زندہ اور توانا تہذیبی قوت کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور نئی نسل کے لیے اس کی بازیافت کی ہے۔ اشرف صبوحی کی دلّی عوامی دلّی ہے۔ اہلِ حرفہ کی دلّی

ہے۔ اس میں عوامی سطح کے لوگوں کی چال ڈھال، بات چیت اور رہن سہن کی فنکارانہ عکاسی ہے۔ دونوں کا انداز اردو ادب کا لازوال سرمایہ ہے۔''

شاہد احمد کی دلّی۔ شاہی، ادبی، علمی اور عوام کی دلّی ہے۔ ادبی اور علمی مرقعے انھوں نے اپنے خاکوں میں پیش کر دیے ہیں۔ ''اجڑا دیار'' کے مضامین میں دلّی کی دل والی مُنہ چکنا پیٹ خالی کی مصوری ہے۔ ان کے مضامین میں دلّی کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ ان میں قطب صاحب۔ سترھویں اور پھول والوں کی سیر ہے۔ پھول والوں کی سیر مرزا فرحت اللہ بیگ نے بھی لکھی تھی اور خوب لکھی تھی مگر دونوں کا انداز مختلف ہے۔ بسنت کی بہار ہے۔ چوک کی بہار ہے۔ تہوار اور تقریبیں ہیں۔ رہن سہن کی جھلک ہے۔ عید اور بقر عید کا نقشہ ہے۔ دلّی کے چٹخارے، چٹورپن، دلّی کے گیت، بھانڈ اور طوائفوں کا ذکر ہے۔ شاہ جہانی دیگ کی کُھرچن کے عنوان سے چند مستند دلّی والوں کے خاکے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کا نوحہ ہے اور دلّی کے غسلِ خونیں کی وہ جھلک ہے جو دلّی کی بپتا میں تفصیل کے ساتھ قلم بند ہو کر ادب اور تاریخ دونوں کا حصہ بن چکی ہے۔

شاہد احمد نے دلّی کو سیلانی کی آنکھ سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ قطب صاحبؒ اور حضرت سلطان جیؒ کی درگاہوں کی رونق۔ چہل پہل، روشنی، عقیدت اور دلّی والوں کا جوش و خروش انہیں کے محاورے میں اس کمال سے قلم بند ہو گیا ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ جامع مسجد کی رونق، چہل پہل، تہہ بازاری کی بھیڑ بھاڑ، دکان داروں کی زبردستی، سودا بیچنے والوں کی ہنرمندی، انہیں کی زبان، محاورے اور روزمرہ میں قلم بند ہوئی ہے۔ دلّی کے کرخنداروں کا رہن سہن، ذہنی روّیے اور زبان سب میں ایک خصوصیت تھی۔ یہ زبان گرما گرم فقروں، جگت اور عوامی محاوروں کی زبان تھی۔ لہجے کی برجستگی اور الفاظ کی بے ساختگی نے اس زبان کو بہت زوردار بنا دیا تھا۔ شاہد احمد نے اسے بڑی کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ شاید دلّی کے کسی اور نثر نگار نے کرخنداری زبان اس خوب صورتی اور مہارت کے ساتھ نہیں لکھی۔ انہیں فصیح و بلیغ زبان کے ساتھ ساتھ اس بولی ٹھولی پر بھی عبور تھا۔ چچا کبابی اور میاں شبّو کا مچیٹا پڑھ لیجئے۔ دلّی کی زبان کا صحیح لطف آ جائے گا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ شاہد احمد خاندانی آدمی، دلّی کے معزز شہری، ادیب اور انشا پرداز لیکن جب دلّی کی عوامی زندگی کا احوال قلم بند کرنے بیٹھے تو عوامی زندگی کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دلّی کے کوچہ و بازار، میلے، ٹھیلے، سیر تماشے، تہوار، عقیدتیں اور محبتیں، تقریبیں اور رسم و رواج۔ بولی ٹھولی اور زبان کا بانکپن سب ہماری آنکھوں اور ہماری سماعت کو اپنی گرفت میں جکڑے ہوئے ہے۔ ہم یہ سیر اس سیر کا ایک حصّہ بن کر دیکھ رہے ہیں۔ دلّی والوں کے ساتھ خود بھی سیلانی بن گئے ہیں۔ ''اجڑا دیار'' میں شاہد احمد نے سچ مچ ۱۹۴۷ء تک کی دلّی کو زندہ کر دیا ہے:

''اجڑا دیار'' کے حوالے سے بات ہُڑ کے سے شروع ہوئی تھی۔ ہُڑ کے کا صحیح تاثر ''راگ رنگ کی ایک

رات'' میں استاد بندو خان کے سارنگی پر دیپک راگ بجانے اور استاد چاند خان کے منع کرنے سے ہوتا ہے۔ کیا رات تھی۔ کیا جلسہ تھا۔ موسیقی کی کیا روایتیں بیان ہوگئیں۔ یادوں کے کیسے نقش دلوں پر بیٹھ گئے۔ بہادر شاہ کے بارے میں ''اجڑا دیار'' میں شامل مضمون۔ آنکھ سے ٹپکا ہوا وہ آنسو ہے جس کے سوز سے دل آج تک جلتے ہیں۔ دلّی کے غسلِ خونیں کے بارے میں میں نے شروع ہی میں یہ صراحت کر دی تھی کہ یہ مضمون دلّی کی بپتا کا حصہ بن گیا ہے۔ لیکن ''اجڑا دیار'' کا ایک واقعہ جو دلّی کی بپتا میں قلم بند نہیں ہوا۔ میں یہاں پیش کرتی ہوں تا کہ آنسوؤں کی گرمی اور سوز کا اندازہ ہو سکے:

''جب کھانے کو کچھ نہیں رہا تو لوگوں نے اپنے پالتو جانور کاٹنے شروع کر دیے تھے۔ سوکھی روٹیاں پانی میں بھگو کر کھائی جا رہی تھیں۔ گیہوں، جو، باجرہ، مکئی جو کچھ بھی میسر آتا سل پر پیس کر ٹکڑ پکا لیے جاتے۔ چکیوں کا رواج دلّی میں مدتوں سے نہیں رہا تھا۔ بازار میں گیہوں پسوایا جاتا یا پسا پسایا آٹا بنئے کے ہاں سے آ جاتا تھا۔ بازار بند پڑے ہوئے تھے۔ گیہوں ابال کر اور نمک چھڑک کر پیٹ کا دوزخ بھر لیا جاتا۔ بدہضمی اور پیچش کی شکایت عام ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر اور دوائیں مشکل سے ملتی تھیں۔ یہی شب و روز تھے۔ ایک دن ہمارے محلے میں صبح صبح خلیفہ بٹو نے آ کر آواز دی۔ خلیفہ بڑے جی دار آدمی تھے۔ لکڑی چلانا بہت اچھی جانتے تھے۔ مگر بڑھاپے نے ان کے کس بل توڑ دیے تھے۔ کہتے تھے ''میاں اب میرے ہاتھ کیا دیکھو گے؟ کدی جوانی میں دیکھتے۔ ''لُفط'' آ جاتا۔ میاں چرپائی کے نیچو قبوتر چھوڑ دو۔ مجال ہے جو نکل جائے۔ ہاتھ قلم کرا دینا۔ اب بھی خاک چاٹ کر کہتا ہوں دس پانچ کے بس کا تو اب بھی نہیں ہوں! ہاں تو خلیفہ نے آواز دی تو جی سن سے ہوگیا۔ نہ جانے محلے پر کیا نئی افتاد پڑی۔ بارے ڈرتے ڈرتے جا کر ان سے پوچھا ''خلیفہ خیر تو ہے؟'' بولے ''میاں اللہ خیر ہی رکھے گا۔ لو بابو جی یہ گھر میں دے آؤ لپک کے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے اپنے شالی رومال کے نیچے سے کوئی دو سیر گوشت کا دونا نکال کر تھما دیا۔ پوچھا ''خلیفہ یہ کہاں سے لائے؟ اور کتنے کا لائے؟''

بولے ''میں نے آج اپنے ''تُرکی'' کو حلال کر دیا۔ دیکھنا گوشت کیسا ''توفہ'' ہے چاندی کے ٹکڑے ہیں چاندی کے۔''

''خلیفہ یہ تم نے کیا کیا؟''

''جی میاں مجھ سے جنور کی بے بسی دیکھی نہ گئی۔ آدمیوں تلک کو کھانے کو نہیں مل رہا۔ اسے کہاں سے کھلاتا؟ بھلا جس جناور کو دودھ جلیبیاں کھلا کر پالا ہو، اسے گھاس تک نصیب نہ ہو۔ نالت ہے اس کے جینے پر۔ لو اب دیر نہ کرو بابو جی۔ خوب کسا ہوا قورمہ پکاؤ اور بچوں کو کھلاؤ۔

خلیفہ بٹو منہ پھیر کر جلدی جلدی قدم اٹھاتے چلے گئے۔ شاید ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔''

کیا حسرت ناک بیان ہے۔

دلّی شاہی شہر تھا۔ ہندوستان کا دل تھا۔ برصغیر کی اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ لکھنے والوں نے اس کے بارے میں خوب خوب لکھا۔ شاہد احمد کے والد بشیر الدین احمد نے ''واقعات دارالحکومت دہلی'' کے عنوان سے تین ضخیم جلدوں میں اس کی تاریخ، تاریخی آثار اور شہری آبادی کا حال احوال قلم بند کر دیا ہے۔ ان سے پہلے سر سیّد نے آثار الصنادید مرتب کر کے آثار نگاری کی راہ ہموار کی تھی۔ متعدد اہلِ قلم اور انشا پردازوں نے دلّی اور اہلِ دلّی کے مرقعے تیار کیے۔ بڑی موثر تصویریں بنائیں۔ لیکن شاہد احمد کی چھوٹی سی کتاب میں دلّی کی دلہن کا سہاگ اور سنگھار جس طرح پیش ہوا ہے وہ بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ہے۔ اس کتاب میں دلّی کا دل بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

حیرت اس بات پر بھی ہے کہ شاہد احمد نے دلّی کے ہنر مندوں کے جس فن کو بھی بیان کیا ہے اس کی تھوڑی سی تفصیل اور اصطلاحات بھی بیان کر دی ہیں۔ کُشتی کا ذکر آیا تو داؤں پیچ اس طرح بیان ہوئے جیسے انہیں کے سیکھنے اور پرکھنے میں عمر گزری ہے۔ تیراکی کی بات چھڑ گئی تو بیسیوں قسموں کی تیرائی کا تذکرہ ہو گیا۔ پتنگ بازی کی بات ہے تو کانپ ٹھڈے مانجھے اور ڈور سے نکھرتی ہوئی تکلوں کے پیچ شروع ہو گئے۔ کیا کیا تکلیں ہوتی تھیں۔ ''دمڑ چل، دھل چال، ادھا کل دُما۔ لل دُما، چپ، پری، شکر پارہ، بھیڑیا، پڑھنے والا پڑھتا جاتا ہے اور آسمان میں تاوے کاٹنے والی پتنگوں کو آنکھوں سے اڑتا دیکھتا جاتا ہے۔

ایک مضمون ''شام کی چہل پہل'' میں پھول والوں کی دکانیں ہیں۔ مہکتی دہکتی ان دکانوں کا بیان اتنا خوبصورت اور معطّر معطّر ہے کہ میں اسے یہاں نقل کیے بغیر نہیں رہ سکتی:

''مٹیا محل کے بازار کے نکڑ پر پہنچتے ہی خوشبو کا بھپکا آیا۔ سامنے پھول والوں کی دکانیں ہیں۔ بڑی بڑی چھبڑیوں اور چنگیروں میں لال لال گیلا قند بچھا ہوا ہے۔ اس پر چنبیلی کا ڈھیر پڑا مسکرا رہا ہے۔ ایک طرف گجراتی موتیا کی لپٹیں آ رہی ہیں۔ چھبڑی میں مکھانے سے پھیلے ہوئے ہیں۔ جوہی کی بالیاں قرینے سے بھری رکھی ہیں۔ مولسری کی لڑیاں ہیں۔ منہ بند کلیوں کی چمپا کلیاں ہیں۔ پھولوں اور مقیش کے جھومر ہیں۔ کلیوں اور بادلوں کی سراسریاں ہیں۔ کرن پھول ہیں۔ ٹیکے ہیں۔ مانگ پٹیاں ہیں۔ سیس جال ہیں۔ طُرّے ہیں۔ بدھیاں ہیں۔ کنگن ہیں۔ کلیوں کی چوہے دنتیاں ہیں۔ پہونچیاں ہیں۔ آرسیاں ہیں۔ ہار ہیں۔ گجرے ہیں۔ چمپا کی گڈیاں ہیں۔ ایک ٹوکرے میں گلاب اور گیندے کے پھول بھرے ہیں۔ بیلا، موگرا اور زرد چنبیلی کی کچھ اور ہی بہار ہے۔ بڑے بڑے ڈھاک کے پتوں کے دونوں میں تول تول کر پھول ڈالے جا رہے ہیں۔ پھولوں کے گہنے اکواں بکتے ہیں۔ دلّی والے تیل پھلیل اور پھولوں کے عاشق ہیں۔ منوں سے پھول تُلتا اور بکتا ہے۔ منڈیوں اور دکانوں کے علاوہ پھیری والے چھپے بھرے محلّے محلّے اور گھر گھر بیچتے پھرتے ہیں۔ اور سب پھول بک جاتے ہیں۔''

کیا حسین اور مہکا ہوا منظر ہے۔ ''جیسے کوئی برات پھولوں کی'' خوشبوؤں میں بسے ہوئے اس منظر کو

دیکھنے کے بعد ہر قاری یہ پکار اٹھے گا کہ شاہد احمد واقعی دلّی کی معلومات کا سمندر تھے۔ دلّی کی صحیح خوشبو انہی کے ہاں ملتی ہے۔

''اجڑا دیار'' کا دیباچہ شاہد احمد کی شائع ہونے والی آخری تحریر ہے۔ اس پر ۲۲ رمئی ۱۹۶۷ء کی تاریخ ہے۔ ۲۷ رمئی کو ان کا انتقال ہوا تھا اس لحاظ سے یہ دیباچہ ان کی آخری شائع شدہ تحریر قرار پاتا ہے۔ اس آخری تحریر میں کوئی اضمحلال، تھکن اور افسردگی نہیں ہے۔

شاہد احمد کی طبع زاد کتابوں کا سلسلہ ''دلّی کی بپتا'' پر ختم ہوتا ہے۔ اس بپتا کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے دلّی متعدد بار لٹی اور برباد ہوئی۔ جس فاتح کو موقع ملا اس نے دلّی کو دل بھر کر لوٹا۔ کبھی منگول چڑھ دوڑے۔ کبھی تیمور آن دھمکا۔ نادر شاہ اور اس کے سپاہیوں نے تین دن تک دلّی والوں کا قتل عام کیا۔ احمد شاہ ابدالی نے دلّی کو غارت کیا۔ مرہٹوں، جاٹوں، انگریزوں غرض سب نے دلّی کو تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مگر یہ بربادی اور تباہی عام تھی۔ اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں تھی ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد دلّی میں جو قتل و غارت گری، بربادی اور تباہی ہوئی وہ صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص تھی۔ مسلمانوں کو چن چن کر نشانہ بنایا گیا۔ ان کے گھر لوٹے گئے۔ انہیں گھروں سے بے گھر کیا گیا اور انہیں زبردستی پرانے قلعے کے ہولناک ماحول میں دھکیل کر پاکستان جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ جو لوگ گھروں سے نکلنا نہیں چاہتے تھے ان کے گھر بھی لٹے اور وہ مارے بھی گئے۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ دلّی میں حکومت نام کی کوئی چیز مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔ کوئی نظم و نسق نہیں ہے۔ کوئی تحفظ نہیں ہے۔ دلّی کی طرح سارے مشرقی پنجاب میں بھی مسلمانوں کو اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ننگی عورتوں کے جلوس نکالے گئے۔ نہتے مسلمانوں کے قافلوں پر حملے کیے گئے۔ دلّی سے لاہور آنے والی ریلیں بالعموم مسلمان مسافروں کے خون سے رنگین ہوتی تھیں۔ جب ادھر بھی کچھ جوابی کارروائی ہوئی تو ریلوں میں قتل و غارت گری کا سلسلہ رکا۔ یہ سارے انسانیت سوز واقعات تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں نے بھی انہیں اپنا موضوع بنایا۔ مثلاً جگر صاحب کہتے ہیں ''فکر جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل''۔ افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے۔ ناول نگاروں نے ناول لکھے۔ شاعروں نے نظمیں کہیں لیکن لکھنے والوں نے اپنا دامن بچانے کے لیے کسی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا۔ فسادات کے موضوع پر کرشن چند کا افسانہ ''پشاور ایکسپریس'' پڑھ لیجیے۔ کیا برابر کا بیان ہے۔ آج اس قسم کی حساب برابر رکھنے والی تحریریں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ لکھنے والوں نے سچائی اور حقیقت پسندی سے کام نہیں لیا۔ شاید اسی وجہ سے فسادات کے حوالے سے لکھی جانے والی تحریریں آج ادبی معیار کے لحاظ سے بہت کمتر درجے کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں لیکن ان تحریروں میں شاہد احمد کی ''دلّی کی بپتا'' اپنی واشگاف سچائی اور سفاکانہ حقیقت پسندی کی وجہ سے ادبِ عالیہ کا ایک شہ پارہ بن گئی ہے۔ اس کتاب کے بعض اقتباسات

شاہد احمد کے سوانح میں پیش کیے جا چکے ہیں۔

''دلّی کی بپتا'' ممتاز شیریں کے رسالے ''نیا دور'' میں شائع ہوئی تھی۔ کتابی شکل میں شائع ہونے کی نوبت بعد میں آئی لیکن شائع ہوتے ہی اس کا شہرا ہو گیا اور اسے فسادات کے حوالے سے لکھی جانے والی بہترین تحریر قرار دیا گیا۔ ''دلّی کی بپتا'' مختصر کتاب ہے۔ بمشکل ساٹھ صفحے ہوں گے لیکن ان ساٹھ صفحوں میں جو آگ بھری ہوئی ہے۔ ظلم، زور، دھونس اور دھاندلی کا جو سیدھا، سچا اور پُر اثر بیان ہے، ظلم اور ظلم کی برداشت کی جو خونیں روداد ہے وہ آج بھی دل ہلا دیتی ہے۔ شاہد احمد نے دلّی کی بپتا میں کہیں مبالغے یا جذباتیت سے کام نہیں لیا۔ آگ اور خون کے دریا سے وہ جس طرح پار اترے اس کے بے کم و کاست بیان میں غضب کا سوز ہے۔ ''دلّی کی بپتا'' کے مطالعے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ سیدھے اور سچے بیان میں بھی کس غضب کا سوز ہوتا ہے لیکن اس سیدھے اور سچے بیان کے پس منظر میں ذاتی تجربے کی آنچ اور صاحب طرز انشا پرداز کا رُندھا ہوا چہرا بھی نظر آتا ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی ساتھ دلّی میں مسلمانوں کو تباہ کرنے کی خبریں عام ہو گئی تھیں۔ شاہد احمد کی روداد یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ دلّی کے مضافات سے خوف زدہ مسلمان پناہ لینے کے لیے دلّی آ گئے مگر پناہ کہاں تھی۔ روز ایک نیا ہنگامہ ہوتا تھا۔ شاہد احمد نے خوف کی فضا، ہنگاموں کے زور، مسلمانوں کی بے بسی اور مجبوری کو بڑی سچائی سے قلم بند کیا ہے۔ خلوص اور سچائی نے ان کے بیانات کو بڑا رچا ہوا ادبی آہنگ عطا کیا ہے۔ واقعات ایک منظم اور مربوط سلسلے میں بیان ہوتے جا رہے ہیں۔ خوف اور بربادی کے سائے مہیب ہوتے جا رہے ہیں۔ آج یہ محلّہ ختم ہوا کل اس محلّے کے مسلمان بے گھر ہوئے۔ جن محلّوں نے بڑی بڑی تیاریاں کر رکھی تھیں فوج کے مقابلے میں وہ بھی بے بس ہو گئے۔ شاہد احمد روداد بیان کرتے جاتے ہیں، ان کے ذاتی ردِعمل میں جذباتیت نہیں نظم و ضبط ہے۔ آنسو پلکوں تک آتے ہیں مگر دامن نم نہیں ہوتا۔ عافیت اور فن کا تقاضہ آنسو پی جانے ہی میں ہے۔

دلّی کی تباہی اور بربادی دیکھتے ہوئے آخر کار شاہد احمد بقولِ خود دلّی کے بھاڑ سے نکلے اور پرانے قلعے کے جہنم کو بھگتنے وہاں پہنچ گئے۔ پرانے قلعے کی حالت پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قلعے کی حالت کا ایسا سچا بیان شاہد احمد ہی لکھ سکتے تھے۔

شاہد احمد اور ان کا کنبہ بارش سے گیلی زمین پر خانہ خرابوں کی طرح بیٹھ گیا۔ ایک بچے نے کہا۔ ''ارے یہ تو۔ چچا جان بیٹھے ہیں۔'' یہ میرے والد کے لیے کہا گیا تھا۔ جن کے ساتھ ہم سب بہن بھائی اور والدہ بھی تھیں۔

میں اس دردناک منظر کی عینی گواہ ہوں۔ بارش، جگہ کی تنگی، سڑاند، لوگوں کا ہجوم، چاروں طرف موت کے سائے منڈلاتے ہوئے۔ میرے والد اور تایا سول لائنز میں کورٹ روڈ پر رہتے تھے۔ بار بار تلاشی

ہوئی۔ ہتھیاروں کے نام پر قلم تراش اور کاغذ کاٹنے کی چھری تک ضبط کر لی گئی۔ اور آخر کار یہ نادری حکم ملا کہ کوٹھی خالی کر دو۔ نجانے کیسے پرانے قلعے پہنچے۔ میں نے اس رات اپنے والد، تایا اور شاہد احمد کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ کتنی بھاری تھی یہ رات۔ میں نے اس مصیبت کے احساس اور خوف کی وجہ سے آج تک دلّی میں قدم نہیں رکھا۔ دلّی جا۔ نر کے نام پر ہنگاموں کا خوف وطن کی محبت پر غالب آ جاتا ہے۔ تین دن قلعے میں گزارنے کے بعد ایک صبح ہم لوگ شاہد احمد اور ان کے گھر والوں کو قلعے میں چھوڑ کر دلّی سے روانہ ہو گئے۔ شاہد احمد کی تین بیٹیاں ہمارے ساتھ ہو گئی تھیں۔ کیسا ہولناک سفر تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر گرے جا رہے تھے۔ نفسانفسی کا ایسا عالم پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ ریل ٹھہرتی تو دل دہل جاتے۔ سڑی گرمی کے باوجود کھڑکیاں چڑھا لی جاتیں۔ پانی کی بوند بوند کو ترسنا پڑا۔ گولیوں کی آوازیں اور جے کارے مسلسل سنائی دیتے رہے۔ شاہد احمد کا سفر ہم سے بھی زیادہ سخت تھا کیونکہ ہماری ریل وہ آخری ریل تھی جس پر حملہ نہیں ہوا تھا۔ شاہد احمد جس ریل میں تھے اس پر حملہ ہوا تھا۔ شروع کے کچھ ڈبے گولیوں کا نشانہ بنے تھے جس پر بلا تحقیق ان کی موت کو یقینی جان کر مرنے کی خبریں اخباروں میں چھپ گئی تھیں۔

شاہد احمد نے قلعے سے لاہور پہنچنے کی جو روداد ''دلّی کی بپتا'' میں قلم بند کی ہے اس میں بڑا فنکارانہ سلیقہ ہے۔ ایک منظر کے بعد دوسرا منظر۔ ایک واقعے کے بعد دوسرا واقعہ۔ ہر واقعہ اپنی جگہ مکمل بھی اور دوسرے تمام واقعات سے جڑا ہوا بھی۔ غم کا اظہار اس طرح کہ قاری کو حالات کی سنگینی کا پورا احساس ہو جائے۔ کہیں کہیں طنز کی ہلکی سی لہر اور شاہد احمد کا منفرد، رچا ہوا دہلوی انداز۔ ہر لفظ دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔

دلّی سے مسلمانوں کا اِنخلا بیسویں صدی کا بڑا دل دوز اور انسانیت سوز المیہ تھا۔ یہ المیہ شاہد احمد کی زندگی کا سب سے بڑا ذاتی سانحہ بھی تھا۔ لیکن انہوں نے اس سانحے کو جس طرح ادب میں محفوظ کر دیا ہے، جس نظم و ضبط اور سچائی سے محفوظ کر دیا ہے وہ اردو ادب میں ایک یادگار حیثیت کا حامل ہے۔

آٹھ مہینے کے بعد شاہد احمد پھر دلّی گئے۔ اس وقت تک ''دلّی ماں'' مسلمانوں کے لیے بقول شاہد احمد ''ڈائن ماں'' ہو چکی تھی۔ بظاہر امن و امان تھا لیکن ہر مسلمان ہر لمحے خود کو سولی پر ٹنگا محسوس کرتا تھا۔ شاہد احمد نے اس ڈائن ماں کی آغوش میں بارہ دن بارہ برس کے بن باس کی طرح گزارے۔ دوست احباب، جاننے والے، سب تتر بتر ہو چکے تھے۔ سڑکیں اور بازار غیر محفوظ، ساقی کے دفتر میں ایک ہندو پولیس انسپکٹر آ بادھا۔ مسلمانوں پر جو گزر رہی تھی اسے شاہد احمد نے سچائی اور خلوص سے مختلف واقعات کے سہارے اجاگر کر دیا اور آخر میں یہ نوحہ پڑھا:

''میں اپنی ماں کی گود میں دلِ شکستہ لے کر آیا تھا اور دلِ مردہ لے کر واپس آیا۔ ماں کا رنڈ سالہ دیکھا، بیوگی کے آنسو دیکھے، شاہ جہانی مسجد کو ملگجی چاندنی میں دیکھا تو سمجھا کہ ماں کے دونوں ہاتھ دعا کے لیے

آسمان کی طرف اٹھے ہوئے ہیں اور مریم کی طرح اس کے دل میں شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یہ تصور کچھ ایسا بندھا کہ بھلائے نہیں بھولتا اور بار بار دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔

ماں کیا تیرا سہاگ ہمیشہ کے لیے اجڑ گیا۔''

شاہد احمد کے اس جذباتی سوال کا جواب میرے پاس ہے۔ ہاں ماں کا سہاگ ہمارے واسطے ہمیشہ کے لیے اجڑ گیا۔ میں آج بھی پرانے قلعے کی اس بھیانک سیاہ رات، بارش سے بھیگی زمین اور اپنے بزرگوں کی بے بسی اور ان کے غمناک چہروں کا تصور کرتی ہوں اور یہ سوچتی ہوں کہ قلعے کی اس رات نے مجھے موت سے کس قدر قریب کر دیا تھا۔ میری فکر میں کتنی اداسی پیدا کر دی تھی۔ میرے ذہن کو کس طرح ماؤف کر دیا تھا تو میں شاہد احمد کے اس سوال کا جواب پیش کرتی ہوں کہ ''دلّی ماں'' کا سہاگ ہم لوگوں کے واسطے ہمیشہ کے لیے اجڑ گیا۔ اس میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں ہے۔

''دلّی کی بپتا'' جب شائع ہوئی تھی تو توازن برقرار رکھنے والے بعض نقادوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ شاہد احمد اس آخری پیراگراف میں جذباتیت کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان پر رقّت طاری ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ جو شخص اتنے ہولناک تجربے سے گزرا ہو اس پر رقّت طاری نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا:

ممتاز افسانہ نگار اور نقاد ممتاز شیریں نے دلّی کی بپتا کے بارے میں بڑی صحیح بات کہی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے۔ ''دلّی کی بربادی کی خون چکاں داستان اس طرح بیان کی گئی ہے کہ یہ شاہد صاحب ہی کا حق تھا۔ ذاتی تجربات کے بیان کے باوجود اس قدر، نظم و ضبط اور توازن۔ پھر شاہد احمد کا رچا ہوا بیان اور اسلوب کی پختگی۔ یہاں تکنیک اور ترازو۔ رقیق القلبی اور سستی جذباتیت نہیں ہے بلکہ خلوص، حقیقت، سچی مستند تفصیلیں اور سچا درد ہے۔ شاہد صاحب خود اس آگ سے گزرے ہیں اور دلّی کی یہ بپتا ان کی زبانی عجب اثر رکھتی ہے۔''

دلّی کی بپتا کے تکملے کے طور پر میں یہ بھی لکھ دوں کہ مجھے اپنی والدہ بہنوں اور بھائی کے ہمراہ چار پانچ مہینے شاہد احمد کے ساتھ لاہور میں اُن کے پانی والے تالاب کے مکان میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ صبح دیکھتی تھی کہ شاہد احمد شیروانی پہن کر گھر سے کہیں جاتے تھے۔ دوپہر کو لوٹتے تو چہرے پر اداسی اور تھکن کے آثار نظر آتے۔ بہت دن تک یہی لیل و نہار رہے اور آخر کار ایک دن انہوں نے دوسری ہجرت کی تیاری کی۔ لاہور سے کراچی چلے گئے۔ دلّی کی بپتا تمام ہو گئی۔

یہاں ایک عبرتناک بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ شاہد احمد لاہور میں زندہ سلامت تھے۔ لیکن ان کے انتقال کی خبریں اخباروں میں شائع ہو گئیں۔ خبریں کچھ اس قسم کی تھیں کہ شاہد احمد ریل میں دہلی سے لاہور آ رہے تھے کہ پوری ریل ختم کر دی گئی اور شاہد احمد بھی ہلاک ہو گئے۔ بعض اخباروں نے یہ بھی لکھ

دیا کہ ان کی انگوٹھی سے ان کی نعش کی شناخت ہوگئی ہے۔ شاہد احمد یہ خبریں پڑھتے اور ہنستے کہ دنیا والے مجھے جیتے جی مارے ڈالتے ہیں۔ میں ابھی نہیں مرنے کا—

کہنے کو دلّی کی بپتا ایک چھوٹی سی کتاب ہے لیکن اہم تاریخی دستاویز بھی ہے۔ ادبی شاہ کار بھی ہے اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی ہجرت کی ایسی روداد بھی ہے جسے ہر عہد اور ہر زمانے میں بڑے شوق سے پڑھا جائے گا۔ اس روداد میں کہیں کوئی مبالغہ نہیں۔ کوئی الزام تراشی نہیں۔ اکثریت کی قوت اور غرور، جنون کی لہر اور مزاجوں کی یک لخت تبدیلی کو بڑے سادہ لیکن موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ شاہد احمد کی یہ کتاب بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں کی ہولناک تباہ کاریوں اور جاپان پر ایٹم بم گرائے جانے کے ناقابلِ تلافی نقصانات کا دلدوز تتمہ ہے ۱۹۱۴ء۔ ۱۹۳۹ء۔ ۱۹۴۵ء۔ ۱۹۴۷ء سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ شاہد احمد نے زنجیر کے ایک حلقے کو لازوال کر دیا ہے مگر اس حلقے کے پس منظر میں ایک بہت بڑا انعام بھی ہے— قیامِ پاکستان۔

میں آخر میں اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ میں نے ''ساقی'' میں شائع ہونے والے پچاس افسانوں کے اس انتخاب کو جو شاہد احمد نے ''ریزہ مینا'' کے عنوان سے مرتب کر کے شائع کیا تھا اُن کی تصنیفات اور تعلیفات میں شامل نہیں کیا ہے کیوں کہ اس انتخاب میں نہ تو کوئی دیباچہ ہے اور نہ انتخاب کے بارے میں کسی قسم کا حرفِ وضاحت ہے۔ یہ محض انتخاب ہی انتخاب ہے۔

شاھد احمد دھلوی

ریڈیو پاکستان کراچی میں

۱۹۳۶ء میں دلّی میں آل انڈیا ریڈیو کا اسٹیشن قائم ہوا۔ پروگرام نشر ہونے لگے۔ دلّی کے شرفا تقریروں اور فن کار موسیقی کے پروگراموں میں شرکت کرنے لگے۔ ابتدا میں لوگ ریڈیو پروگراموں میں شرکت کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ بڑی مشکل اور سمجھانے بجھانے سے راضی ہوتے تھے۔ آہستہ آہستہ ریڈیو کے پروگرام مقبول ہوتے گئے اور ادیب، شاعر، عالم، فنکار، صدا کار ریڈیو میں شوق سے آنے لگے۔

شاہد احمد آل انڈیا ریڈیو کے قیام کے وقت ادیب اور ادیب گر کی حیثیت سے نمایاں ہو چکے تھے۔ ان کی موسیقی کا بھی شہرا تھا۔ چنانچہ ریڈیو نے ان کی خدمات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ ادبی اور ثقافتی تقریریں بھی نشر کرتے تھے اور کلاسیکی موسیقی بھی پیش کرتے تھے لیکن ریڈیو سے کوئی معاوضہ قبول نہیں کرتے تھے۔ شان یہ تھی کہ جب وہ ریڈیو اسٹیشن جاتے اور پروگرام پیش کرتے تو اسٹیشن ڈائرکٹر ان کے آگے پیچھے پھرتا تھا۔ ریڈیو کے افسر اعلیٰ احمد شاہ بخاری ان کے مدّاح تھے۔ برصغیر کے ابھرتے ہوئے شاعروں اور ادیبوں کا ایک پورا گروہ ریڈیو سے وابستہ تھا جو شاہد احمد کی ادبی بزرگی کا معترف اور ان کی موسیقی کا مدّاح تھا۔ شاہد احمد موسیقی کے پروگراموں کے سلسلے میں لکھنؤ اور لاہور بھی گئے۔ مختصر یہ کہ وہ آل انڈیا ریڈیو کے ممتاز فنکار تھے اور انہیں آل انڈیا ریڈیو دلّی کے معماروں میں شمار کیا جاتا تھا۔

دلّی سے لاہور آنے کے بعد شاہد احمد ریڈیو پاکستان لاہور سے گانے کا پروگرام بھی کرتے رہے اور ان کی تقریریں بھی نشر ہوتی رہیں۔ کراچی آنے کے بعد ریڈیو پاکستان کراچی میں ان کا معاہداتی تقرر ہو گیا۔ پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہو گئی جس میں کبھی کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ان کا تقرر بحیثیت نگران موسیقی ہوا لیکن ان کی خدمات موسیقی تک محدود نہیں تھیں بلکہ وہ ادبی، علمی اور ثقافتی تقریریں بھی کرتے تھے۔ غنائیے بھی لکھتے تھے۔ فیچر بھی لکھتے تھے۔ بعض فیچر ان کے ساتھ مخصوص تھے۔ مثلاً حضرت امیر خسروؒ کے عرس کے موقع پر وہ خصوصی فیچر لکھتے تھے۔ امیر خسروؒ کے کمالاتِ ادب، کمالاتِ موسیقی اور

حضرت سلطان جیؒ کے عشق بے پایاں کا مرقع تیار کرتے تھے۔قول، قلبانہ اور امیرؒ کے دوسرے راگ اس فیچر کی نمایاں خصوصیت ہوتے تھے۔عید، بقرعید، ہولی، دیوالی کے موقع پر بھی ان کے غنائیے نشر ہوتے تھے۔انہوں نے ریڈیو پاکستان کراچی میں بلا مبالغہ سیکڑوں فیچر لکھے ہوں گے۔فیچروں کا انداز دل نشیں اور زباں ٹکسالی — سامعین کے لیے دل موہ لینے والی کشش۔ چنانچہ ان کے فیچر اور غنائیے بڑے مقبول ہوتے تھے۔''قدیم مسلمان موسیقار'' موسیقی کے فیچروں کا بڑا خوب صورت اور معلومات افزا سلسلہ تھا۔اس سلسلے میں حضرت امیر خسروؒ، سلطان حسین شرقی، نظام الدین مدھ نایک، میاں تان سین، ادا رنگ، سدا رنگ اور نجانے کتنے بڑے موسیقار شامل تھے۔ان فیچروں کے مسودے اسلم کے پاس بہت دن تک محفوظ رہے۔یہ فیچر شاہد احمد ہی لکھ سکتے تھے کیونکہ انہیں موسیقی کے عملی اور علمی دونوں پہلوؤں پر عبور حاصل تھا۔اتفاق سے ایک فیچر کا مسودہ دستیاب ہوگیا ہے۔اسے میں یہاں نقل کرتی ہوں تا کہ ایک نایاب تحریر محفوظ ہوجائے۔

مدھ نایک (نظام الدین)

راوی: اکبر اعظم کا دربار خاص آراستہ ہے، بادشاہ سلامت نے حکم دیا کہ آج جشنِ برشگال منایا جائے گا، اس سال گرمی ایسی پڑی ہے کہ خلق خدا تراہ تراہ پکار اٹھی۔ برسات کا موسم آ پہنچا، مگر آسمان پر ابر کا ٹکڑا نہیں آیا، زمین تپتے تپتے سرخ ہوگئی، کھیتیاں جل گئیں، آسمان تانبا بن گیا، دن بھر سورج آگ برساتا رہتا ہے۔ ملک میں کئی جگہ کال پڑنے کی اطلاعیں آچکی ہیں۔

نقیب: باادب باملاحظہ ہوشیار، نگہہ روبرو، مہابلی تشریف لاتے ہیں۔

بادشاہ: ابوالفضل — ہم نے سنا ہے کہ میگھ گانے سے بارش ہونے لگتی ہے، آج ہم نے یہ دیکھنے کے لیے دربارِ خاص کا حکم فرمایا ہے۔

ابوالفضل: مہابلی سلامت، اہلِ ہنود کی کتبِ قدیم میں تو یہی مرقوم ہے کہ مختلف راگوں کی مختلف تاثیریں ہوتی ہیں، بعض راگ ایسے ہوتے ہی کہ ان سے حیوانات پر اثر ہوتا ہے، بعض سے نباتات اور بعض سے جمادات پر اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن سے عناصر متاثر ہوتے ہیں۔

بادشاہ: بظاہر یہ باتیں ماورائے عقل معلوم ہوتی ہیں۔

ابوالفضل: ظلِ الٰہی عقلِ انسانی ناقص ہے، قوتِ مدرکہ کا انحصار حواسِ خمسہ پر اور حواسِ خمسہ کا احساس اضافی ہوتا ہے، حکیم ارسطا طالیس کے قول کے مطابق.....

بادشاہ: ابوالفضل تم نے حسبِ عادت دلائلِ عقلی ونقلی پیش کرنے شروع کردیے۔ ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے، ہم اس کا عملی ثبوت چاہتے ہیں، ہمارے دربار میں یگانہ روزگار موسیقار جمع ہیں، ہمیں آج ان کا کمالِ فن دیکھنا ہے۔

ابوالفضل: ظل اللہ کے اقبال سے دربار شاہی میں تمام علوم وفنون کے ماہرین جمع ہیں، علمِ موسیقی کا بے مثل کلاکار میاں تان سین نورتنِ اکبری میں شامل ہے۔

تان سین: مہابلی کے اقبال سے کوئی بات ناممکن نہیں ہے، سچے سروں کا مناسب امتزاج ہوجائے تو اثر ہونا ناگزیر ہے، اگر اثر نہ ہوتو یہ فن کا قصور نہیں فنکار کا عجز ہے۔

بادشاہ: تان سین! تمہاری یہ بات ہماری سمجھ میں آئی، نورتنِ اکبری میں کوئی نورتن اپنے فن میں عاجز نہیں ہے۔

تان سین: مہابلی سلامت، اس ذرّۂ بے مقدار کو دربارِ اکبری کا رتن بنانے میں شہنشاہِ ہند کی نظرِ کیمیا اثر کارفرما ہوئی ہے۔ کیا عجب کہ اکبری جمال و جمال سے تان سین کے گانے میں وہ سوز وگداز پیدا ہوجائے کہ سنگ دل آسمان کا بھی زہرہ گداز ہوجائے۔ اجازت ہے مہابلی؟

بادشاہ: اجازت۔

(تان سین میگھ گاتا ہے)

ابوالفضل: ظل اللہ، چاند کی نقرئی روشنی گل ہوگئی۔ ابر سیاہ فیل مست کی طرح جھومتا چلا آتا ہے، میگھ کا دل بادل اُمڈا چلا آرہا ہے۔ گرج کے نقارے اور دمامے گونجنے لگے، بجلی کے کوڑے بن رہے ہیں۔

بادشاہ: لو وہ بوندیاں بھی آگئیں، تان سین گانا جاری رہے۔

ابوالفضل: مہابلی سلامت تان سین راگ گانے میں اس قدر محو ہے کہ اسے کچھ ہوش نہیں، یہ انہماک اور خلوص نہ ہوتو راگ میں تاثیر بھی نہ ہو۔

(تان سین کا گانا جاری رہتا ہے۔ زور کی بارش ہونے لگتی ہے)

ابوالفضل: شہنشاہ عالم پناہ دھونتال مینھ پڑنے لگا، تان سین کو حکمِ خاموشی صادر فرمایا جائے ورنہ یہ انہماک، یہ بے خودی مہلک ثابت ہوگی، اس کے نغمے میں اس کی روح پھڑ پھڑا رہی ہے۔ کچھ دیر اور اگر یہی سلسلہ رہا تو اس کا طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے گا۔

بادشاہ: تان سین، میگھ کا اثر ہم نے دیکھ لیا اور اس کے ساتھ تمہارا کمالِ فن بھی، نغمہ ختم کرو۔

(گانا بند ہو جاتا ہے)

ادھر آؤ تان سین، آج سے تم ہم سے اور بھی زیادہ قریب ہو گئے، خلعتِ ہفت پارچہ اور جاگیرِ کثیر تمہیں عطا کی جاتی ہے۔ آج روئے عالم پر تمہارا کوئی ہم سر نہیں ہے۔

ابوالفضل: مہابلی بجا، درست ہے، ایسا گویا ہزار سال میں پیدا ہوتا ہے۔

تان سین: ظلِ اللہ، تاثیر منجانب اللہ ہے۔ یہ عطیۂ خداوندی ہے۔ ورنہ تان سین کی بضاعت کیا؟ صرف ایک اور شخص ہے کہ جس کو اللہ نے یہ قدرت دی ہے کہ آواز سے جادو جگاتا ہے۔

بادشاہ: وہ کون شخص ہے؟ کیا ہم اسے جانتے ہیں؟

تان سین: عالی جاہ، وہ نظام الدین مدھ نایک ہے۔ جو ساداتِ بلگرام میں سے ہے۔ آج کل رئیسِ شاہ آباد کے وابستگان میں شریک ہے۔

بادشاہ: ابوالفضل، فرمانِ واجب الاذعان جاری کرو کہ مدھ نایک کو عزت و تکریم کے ساتھ بارگاہِ خسروی میں پیش کیا جائے۔

تان سین: ظلِ اللہ مناسب ہوگا کہ فرمانِ شاہی کے تعمیل کرانے کے لیے کسی گویّے کو مامور کیا جائے۔

بادشاہ: ہمیں تان سین کی رائے سے اتفاق ہے، مابدولت کا خیال ہے کہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے گُن سمندر کو مامور کیا جائے۔

راوی: گُن سمندر منزل پر منزل مارتا۔ رئیس شاہ آباد کی پائگاہ میں پہنچا۔ رئیس نے فرمانِ اکبری کو سر آنکھوں پر رکھا، حکمِ شہنشاہی سے آگاہ ہو کر بولا۔

رئیس: مہابلی کے حکم سے سرتابی کی کسے مجال ہے؟ مگر مدھ نایک بہت ضعیف

ہو گئے ہیں۔ حواس میں عمر کے ساتھ اختلال آ گیا ہے۔ سفر کی صعوبت برداشت کرنے کی ان میں ہمت نہیں۔

گُن سمندر: اگر اجازت ہو تو میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔

رئیس: اس سے بہتر اور کیا ہوگا کہ آپ بہ چشم خود انہیں دیکھ لیں، اور ظلِ اللہ سے ان کی حالت مِن وعَن بیان کر دیں۔

راوی: مدھ نایک تارک الدّنیا ہو کر شہر سے باہر ایک خانقاہ میں رہتے ہیں۔ دروازے پر دستک دی۔ ایک بوڑھی عورت برآمد ہوئی۔ گُن سمندر نے اس سے پوچھا مدھ نایک یہیں رہتے ہیں۔ عورت نے جواب دیا۔ ہاں۔ اس پر گُن سمندر نے کہا۔

گُن سمندر: شہنشاہِ ہند محمد جلال الدین اکبر اعظم نے مدھ نایک کو طلب کیا ہے۔

(بڑھیا گُن سمندر کو اندر لے گئی)

راوی: گُن سمندر۔ خانقاہ میں داخل ہوا۔ سامنے ایک معمر انسان کو دیکھا کہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا ہے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔

گُن سمندر: آداب و تسلیمات کے بعد میں شہنشاہِ ہند کا پیغام آپ کو پہنچانا چاہتا ہوں کہ آپ دربارِ شاہی میں طلب فرمائے گئے ہیں۔

مدھ نایک: ہم فقیروں کو بادشاہوں سے کیا واسطہ؟ اکبر سے کہہ دو کہ گدائے متکبر درباروں میں حاضر نہیں ہوا کرتے۔ فقیر کے دربار میں بادشاہوں کی کوئی پُرسش نہیں ہوا کرتی۔

راوی: گُن سمندر نے دیکھا کہ فرمانِ خسروی اس فقیرِ گوشہ نشین پر اثر انداز نہ ہو سکے گا تو اس نے گفتگو کا رخ ہی بدل دیا۔

گُن سمندر: میں دور دراز کی مسافت طے کر کے حاضرِ خدمت ہوا ہوں کہ آپ کے کمال فن سے مستفیض ہوں، میری آرزو ہے کہ آپ مجھے اپنی نغمہ طرازی سے سرفراز فرمائیں۔

مدھ نایک: مدّت ہوئی ہم نے گانا چھوڑ دیا۔ ایک زمانہ تھا کہ ایک ہندو لڑکی سندری کے عشق نے ہمارا دل گداز کر دیا تھا، اس کی قوم والوں نے ہمیں ترکِ وطن پر مجبور کر دیا مگر وہ نیک بخت بھی ہمارے ساتھ یہاں چلی آئی اور مشرف بہ اسلام ہو کر ہماری ہو گئی۔ وہ ولولے جوانی کے ساتھ گئے۔ اب

تو سانس پورے کرنے ہیں۔

راوی: گُن سمندر نے دیکھا کہ مدھ نایک گانے پر آمادہ نہیں ہوئے تو خود گانا شروع کر دیا۔

(گُن سمندر سگھڑی کا نہڑا گاتا ہے)

مدھ نایک: تم نے سگھڑی کا نہڑا خوب گایا۔ ہم نے بھی ایک کا نہڑا بنایا ہے۔ ''مدھ کی کا نہڑا'' سنو۔

(مدھ کی کا نہڑا گاتا ہے)

اور دیکھو تم نے سارنگ بہت سنے ہوں گے۔ مدھ مار سارنگ میں بھی سنو۔

(مدھ مار گاتا ہے)

ہم نے بارہ شیام بھی بنائے ہیں۔ خیر ان کا یہ وقت نہیں۔ اچھا مدھ مالتی اور سن لو۔

(مدھ مالتی گاتا ہے)

گن سمندر: سبحان اللہ، سبحان اللہ، میں اس پر فخر و ناز کروں گا کہ میں نے مدھ نایک کا گانا سنا ہے۔ واقعی آپ اپنے وقت کے نایک ہیں۔ میں آپ کے سنائے ہوئے راگ بادشاہ کے حضور میں بطور تحفہ لے جاؤں گا۔''

یہ فیچر کاغذ پر بے جان اور بے کیف نظر آتا ہے۔ پڑھنے والا صرف شاہد احمد کی زبان سے لطف اندوز ہوتا ہے لیکن جب یہ موسیقی کے پورے ٹھاٹ کے ساتھ نشر ہوا تھا تو ایک دھوم مچ گئی تھی۔ سامعین میں مُدت تک اس کا چرچا رہا۔ اس فیچر میں کلاسیکی موسیقی کا جو انداز ہے اُسے شاہد احمد ہی سلیقے سے پیش کر سکتے تھے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس فیچر میں مدھ نایک کا پارٹ خود شاہد احمد نے ادا کیا تھا۔ ان کے علاوہ یہ پارٹ موسیقی کی وجہ سے کسی اور کے بس کا تھا بھی نہیں۔

شاہد احمد شعبۂ موسیقی میں موسیقی کے تمام پروگراموں کے ذمہ دار اور نگراں ہوتے تھے۔ ان کے زمانے میں ریڈیو سے نشر ہونے والے تمام پروگراموں میں موسیقی کا حصہ سب سے زیادہ ہوتا تھا۔ پروگراموں کا تقریباً پچھتر فی صد حصہ موسیقی پر مشتمل ہوتا تھا۔ حصہ لینے والوں میں اساتذۂ فن بھی تھے۔ پیشہ ور گانے والے اور گانے والیاں بھی تھیں۔ شوقیہ گانے والوں کا بھی ایک بڑا گروہ تھا۔ اور دھنیں ترتیب دینے والے استادوں اور سازندوں کا بھی بڑا عملہ تھا۔ سب نازک مزاج، آن بان والے خان صاحبان، پیشہ وروں کے نخرے، سازندوں کے جھگڑے اور آپس کی چپقلش۔ لیکن شاہد احمد کی

بزرگی کے سب قائل تھے۔ان کی شخصیت کا اثر یہ تھا کہ ریڈیو پاکستان کراچی کے سب سے بڑے شعبے یعنی شعبۂ موسیقی میں سُنا ہے کبھی کوئی بدمزگی نہیں ہوئی۔کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ ہر موسیقار شاہد احمد کا احترام کرتا تھا۔ان میں استاد بندو خان اور رمضان خان جیسے فنکار بھی تھے۔متعدد گانے والیاں بھی تھیں۔ سب شاہد احمد کی بات غور سے سنتے تھے اور اس پر عمل بھی کرتے تھے۔

شاہد احمد خود بھی موسیقی کا پروگرام کرتے تھے کہ ان کے پروگرام پسند بھی کیے جاتے تھے۔ ریڈیو میوزک اسکول کے نام سے انہوں نے موسیقی سیکھنے کا ایک سلسلہ وار پروگرام بھی شروع کیا تھا جو ہر اتوار کی دوپہر کو نشر ہوتا تھا۔انہوں نے ریڈیو میں بعض شوقیہ گانے والوں کی صلاحیت کو ابھارا اور انہیں فن موسیقی کی طرف مائل بھی کیا۔ریڈیو پاکستان کراچی میں موسیقی کے پروگراموں کو کامیاب بنانے میں شاہد احمد کا حصہ بہت نمایاں ہے۔ریڈیو کے دو مقبول فنکار استاد امراؤ بندو خان اور نہال عبداللہ، اسلم سے انگریزی پڑھنے آتے تھے۔ میں نے دونوں کی زبانی شاہد احمد کی موسیقارانہ مہارت، بزرگانہ شفقت اور وضع داری کا تذکرہ سنا ہے۔استاد امراؤ بندو خان نے ان کی موسیقارانہ مہارت کے بارے میں ایک مضمون بھی لکھا تھا جو ساقی کے شاہد احمد نمبر میں شامل ہے۔

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ ریڈیو پاکستان کراچی میں ایک کمرے میں حمید نسیم مرحوم بیٹھتے تھے۔ایک کمرے میں عزیز حامد مدنی کی بیٹھک تھی اور شعبۂ موسیقی کے بڑے کمرے میں شاہد احمد بیٹھتے تھے۔ تینوں کمروں میں ادبی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔شاہد احمد کے ہاں جمگھٹا لگا رہتا تھا۔چھیڑ اس وقت ہوتی تھی جب وہ موسیقی کے پروگراموں کی ریہرسل دیکھنے اسٹوڈیو چلے جاتے تھے۔ جو بھی ادیب، شاعر اور موسیقار آتا وہ سب سے پہلے شاہد احمد سے ملتا۔ پھر کسی اور کے پاس جاتا۔اصل میں ریڈیو اسٹیشن کا پروگرام کرنے والا عملہ شاہد احمد کو ریڈیو پاکستان کے اوّلین معماروں میں شمار کرتا تھا اور ان کا احترام مدِّ نظر رکھتا تھا۔

ریڈیو پاکستان کے روحِ رواں ذوالفقار بخاری بھی شاہد احمد کا احترام کرتے تھے اور پروگراموں کے حوالے سے ان کی رائے کو اہمیت دیتے تھے اور موسیقی کے مسائل پر ان سے مشورہ بھی کرتے تھے۔

شاہد احمد چونکہ بڑے محنتی انسان تھے لہٰذا وہ شعبۂ موسیقی اور اس کے علاوہ دوسرے شعبوں میں بھی اپنے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ریڈیو سے وہ اٹھارہ برس وابستہ رہے۔اُن کے آخری دو برس بڑی ہولناک بیماری میں گزرے لیکن بیماری کے باوجود وہ اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوئے۔ ریڈیو جاتے رہے۔ کام کرتے رہے۔ ملازمت کے دوران انہیں ریڈیو کی جانب سے دو صدمے بھی سہنے پڑے۔ پہلا صدمہ کسی معقول وجہ کے بغیر ان کے ملازمتی معاہدے کا اچانک اختتام تھا مگر انہوں نے اس کا کبھی کوئی گلہ نہیں کیا۔ یہ واقعہ ان کے سوانح میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ دوسرا

واقعہ ملازمت کے آخری دو مہینوں میں تنخواہ کی بندش تھا۔ انہیں اس کا بے حد قلق تھا۔

اٹھارہ برس کی ملازمت میں ان کا کسی سے کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ وہ دوسروں کے کام میں کبھی دخل نہیں دیتے تھے۔ اپنے ساتھیوں اور عملے پر اعتماد کرتے تھے۔ ان کے دکھ درد میں شریک رہتے تھے۔ انہیں اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کا غیر معمولی احساس تھا۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔

فروری ۶۷ء میں ان پر دل کا دورہ پڑا۔ دورے سے پہلے وہ مرزا غالب کی برسی کے لیے ایک فیچر لکھ چکے تھے۔ ہسپتال میں ہم لوگ انہیں دیکھنے گئے۔ وہ اسلم سے بڑی نحیف آواز میں کہنے لگے۔ ''پندرہ تاریخ کو غالب والا فیچر سن لینا۔ محنت تو بہت کی ہے۔ یہ دیکھنا کہ بات بنی یا نہیں۔'' اپنے فرض اور فن سے اتنی لگن بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ غالباً یہ ریڈیو کے لیے ان کا آخری فیچر تھا۔

شاہد احمد نے ریڈیو کے لیے بہت کچھ لکھا۔ موسیقی کے فیچروں اور غنائیوں کے علاوہ بھی فیچر لکھے اور زبان و بیان کا جادو جگایا۔ پچاس برس پہلے کی زبان کا رنگ ڈھنگ۔ شاہد احمد کی انشا پردازی ریڈیو کے سامعین کو کس طرح متاثر کرتی تھی اور ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی طرف بڑھنے کا جو عمل ہے اس کی جھلک ان کے ایک فیچر میں دیکھیے جسے انہوں نے تمثیلے کا نام دیا ہے اور عنوان ہے ''یادش بخیر۔''

یادش بخیر

نواب آغا: اے صاحب سنتی ہو؟— کہاں ہو؟ ہمیں تو صاحب سانس لینے تک کی فرصت نہیں ہے۔ دنیا جہان کے بکھیڑے ہماری جان کو لگے ہیں۔ باہر کے دھندوں ہی سے چھٹکارا نہیں ملتا اور ایک آپ ہیں کہ گھر کے گھر ہی میں موجود ہیں اور پھر پتہ نہیں چلتا کہ کہاں ہیں۔ گھر نہ ہوا بھول بھلیاں ہو گیا۔ ارے صاحب، سنتی ہو؟

بیگم: ابھی آئی۔ ذرا دودھ کی پتیلی چولھے سے اُتار لوں۔

نواب آغا: بھئی ناک میں دم آ گیا ہے ہمارا۔ جب دیکھو جب باورچی خانے میں گھسی ہوئی ہیں۔ کبھی دال بگھاری جا رہی ہے، کبھی توے پر روٹی ڈالی جا رہی ہے، اور کچھ نہیں تو دودھ ہی کو جوش دیا جا رہا ہے، یعنی کہ گھر نہ ہوا مطبخ ہو گیا۔

بیگم: گھر میں تم کیا آتے ہو ایک بھونچال آتا ہے۔ نگوڑا ہاتھ بھی تو جل گیا میرا پتیلی اُتارنے میں۔

نواب آغا: ایں؟ یعنی کہ ہم بھونچال بن گئے ہیں؟ شوہر کا یہ وقار رہ گیا ہے؟ ہا! کیا

وقت آ گیا ہے۔ اللہ بخشے اماں حضرت جب قبلہ ابا حضرت کو محل سرا میں آتا دیکھتی تھیں تو سروقد کھڑی ہو جاتیں اور آداب بجالاتیں، مزاج پُرسی فرماتیں، ان کے ساتھ ساتھ صدر دالان میں آتیں اور جب تک ابا حضرت مسند پر گاؤ تکیے کے سہارے نہ بیٹھ جاتے تعظیماً کھڑی رہتیں۔

بیگم: اسے وہ زمانے لد گئے۔ تم ابھی تک انہی کے خواب دیکھ رہے ہو۔ پدرم سلطان بود! تم اپنے آپ کو دیکھو۔ ابا حضرت اور دادا حضرت اپنی اپنی گزار گئے۔

نواب آغا: ہا۔ ہا! بیگم تم نے دادا حضرت کا ذکر کر کے:

اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

سلاطین زادوں میں ایسا شوقین پھر پیدا نہ ہوا۔ پتنگ بازی، مرغ بازی اور بٹیر بازی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ پتنگ ایسی اڑاتے کہ تارا ہو جاتی اور جب کٹتی تو ہاتھ پر سے ڈور توڑ دیتے۔ مرغ ایسا بناتے کہ دو ایک پالی سے زیادہ کوئی مرغ اس کے آگے نہ ٹھہرتا تھا۔ بٹیر — وہ چونچ پنجے کہ سبحان اللہ۔ پالی کا سدا رستم ہی رہتا۔ سبز مرغیوں کے انڈے لڑانے میں خدا جانے انہیں کیا رکان یاد تھی کہ سب کے انڈے ٹوٹ جاتے مگر دادا حضرت کا انڈا آخر تک سلامت رہتا۔ ہا! اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوں گے۔

بیگم: بس انہی باتوں میں رہے یا اور کچھ بھی کیا؟

نواب آغا: یعنی کہ آپ کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی؟ اچھا اور سنئے طبلہ بہت اچھا بجاتے تھے۔ استاد مکھو خان کے شاگرد تھے۔ ابا حضرت نے ان کا ایک واقعہ سنایا، فرماتے تھے کہ ایک دن ان کے ہزار داستان کا پنجرہ دروازے میں لٹکا ہوا تھا۔ کار چوبی بستنی چڑھی ہوئی، چاروں طرف خاموشی پھیلی ہوئی۔ ہزار داستاں اپنی موج میں ہزار بولیاں سنا رہا تھا۔ صاحب عالم اس کی چہکار سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ استاد مکھو خاں حسب دستور سبق دینے آئے تو بے دھیانی میں ان کا سر پنجرے سے ٹکرا گیا۔ ہزار داستاں چپ ہو گیا۔ صاحب عالم اپنی محویت سے چونکے، دیکھا کہ پنجرہ جھول رہا ہے اور استاد شرمندہ صورت بنائے ہاتھ

جوڑے کھڑے ہیں۔ فرمایا استاد تم نے غضب کر دیا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو اسی وقت اس کے دو ٹکڑے کر دیتا، کیا کروں استاد ہو۔ تمہاری ٹکر سے جانور بھڑک گیا۔ یہ اگر اب نہ بولا تو استاد تمہاری خیر نہیں۔'' استاد کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ دست بستہ بولے۔ ''صاحب عالم! آپ کے اقبال سے ہزار داستاں پھر بولنے لگے گا۔'' یہ کہا اور پنجرے کے سامنے طبلے کی جوڑی لے کر بیٹھ گئے۔ دادا حضرت فرماتے تھے کہ استاد مکھو خاں نے کچھ ایسی گتیں بجائیں کہ ہزار داستاں پھر چہکنے لگا۔ دادا حضرت نہایت خوش ہوئے۔ استاد کو گلے لگایا، فرمایا ''جیسا طبلہ ہم نے آج سنا ہے دنیا نے کبھی نہ سنا ہوگا اور ہم چاہتے ہیں کہ آئندہ بھی دنیا نہ سننے پائے۔'' یہ کہہ کر پیش خدمت کو آواز دی اور استاد کے دونوں ہاتھ کچلوا دیے۔

بیگم: ہے ہے! اتنا ظلم!

نواب آغا: یعنی کہ آپ اسے ظلم بتاتی ہین

بیگم: ظلم سا ظلم ہے! اور آپ ہیں کہ اپنے بزرگوں کے ان کوتکوں کو بڑے فخر سے سنا رہے ہیں۔

نواب آغا: افوہ! صاحب آپ شاہی نازک خیالیوں کی قدر کیا جانیں۔ ''رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند۔''

بیگم: خدا نہ کرے کہ میں جانوں۔ آپ ہی کو مبارک رہیں یہ نازک خیالیاں۔

نواب آغا: واہ بھئی واہ! اندھے کے آگے روئیے اپنے نین کھوئیے۔ ایک وہ امی جمی کا زمانہ تھا کہ ہر قسم کی رنگ رلیاں ہو رہی ہیں! جشن ہو رہے ہیں، آج رت جگا، آج بیوی کی صحنک ہے تیرھویں کی رات کو شبِ ماہ منائی جا رہی ہے، برکھا رُت میں پھول والوں کی سیر ہو رہی ہے، دیوانِ عام میں مشاعرے ہو رہے ہیں۔ ناچ گانے ہو رہے ہیں، زہرہ بائی تھئی تھئی ناچ رہی ہے، استاد تان رس خاں کی تانیں ساتویں آسمان پر پہنچ رہی ہیں۔ دن عید رات شبِ برات۔ آٹھ دن اور نو میلے۔ ع: اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے!

بیگم: اور ملک تباہ ہو رہا ہے، رعایا برباد ہو رہی ہے۔ کیسی کیسی خوبیاں بیان

فرمارہے ہیں آپ۔ سبحان اللہ!

نواب آغا: یعنی کہ تباہی اور بربادی تھی؟ بیگم ذرا تو انصاف کرو۔ ان دنوں تین من کا آٹا، پانچ سیر کا گھی، ایک پیسے میں چار سودے آتے تھے۔ تین روپے میں کنبہ پلتا تھا۔ ایک آپ کا یہ پاکستان بنا ہے کہ ڈھائی سیر کا آٹا، تین چھٹانک کا گھی، پیسے کے چار سودے تو کجا، چار پیسے کا ایک سودا بھی نہیں ملتا اور پھر جو کچھ ملتا ہے اس میں ملاوٹی۔ آٹے میں لکڑی کا بُرادہ، مرچوں میں گیرو، نمک میں پتھر، گھی میں ولایتی تیل، ہم تو تنگ آ گئے صاحب اس زمانے سے۔ ہم تو دعا مانگتے ہیں کہ یا اللہ تو ہمارے دن پھیر دے اور پھر سے وہی شاہی زمانے آ جائیں۔ نہ کوئی کام نہ دھندا۔ نہ روزی کمانے کی فکر۔ بس عیش ہی عیش۔

بیگم: ہاں، اب اصل بات کہی آپ نے، دوسروں کی محنت کی کمائی چھین کر رنگ رلیاں منانا اب یاد آتا ہے۔ اپنی قوتِ بازو سے کمانا پڑا تو پاکستان بُرا ہو گیا۔

نواب آغا: اچھا بیگم دور کیوں جاؤ تم خود اپنے آپ کو دیکھ لو۔ مامائیں، اصیلیں، چھوکریاں سبھی تمہاری خدمت کو موجود تھیں۔ تمہارے صرف اشاروں پر سارے کام ہو جاتے تھے۔ ہل کر پانی تک نہ پیتی تھیں آپ۔ پیچھے تکیہ لگا ہوا ہے، آگے پٹاری دھری ہے۔ تعویذی گلوریاں بن رہی ہیں۔ کلّا تازہ ہو رہا ہے۔ کسنا کھلا ہوا ہے، کھٹا کھٹ سروتا چل رہا ہے۔ دوا آ رہی ہیں دو جا رہی ہیں۔ دنیا زمانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ لڑکیاں بالیاں، اہلی گہلی پھر رہی ہیں۔ محل سرا کیا تھی جنت تھی۔ ایک یہ آپ کا پاکستان کا کھنڈلا ہے کہ کوئی آ کر یہاں تھوکتا بھی نہیں، اور تم ہو کہ چولھے میں جھنکی رہتی ہو۔ گھر دوزخ کا نمونہ بنا ہوا ہے۔

بیگم: دیکھو بھئی میں نے کہہ دیا ہے میرے سامنے پاکستان کو برا مت کہا کرو۔ مگر تمہیں اسی کی رٹ لگی ہوئی ہے۔ کسی نے ہاتھ جوڑے تھے تمہارے آ گے کہ پاکستان چلو۔ میں سمجھتی ہوں کہ میری انسانوں کی سی زندگی اب شروع ہوئی ہے۔

نواب آغا: اناللہ وانا الیہ راجعون یعنی کہ اس سے پہلے ہم جانور تھے؟ جانور؟

فرّخ مرزا: کیوں بھائی صاحب، میں آ جاؤں؟

بیگم: بھائی جان ہیں۔ آیئے بھائی جان۔

فرّخ مرزا: بھائی صاحب، آداب عرض کرتا ہوں اور بھئی تم تو اچھی ہو؟

نواب آغا: آؤ بھائی آؤ۔ یعنی کہ اب تو بہت بہت دنوں میں ادھر کا پھیرا ہوتا ہے، خیریت سے تو ہو؟

فرّخ مرزا: نواب بھائی، کیا عرض کروں۔ وہ یومِ استقلال کے سلسلے میں جو جشن منایا جا رہا ہے نا اس میں مصروف رہا۔ تم کہو فرخندہ، جی کیسا ہے؟

بیگم: خدا کا شکر ہے، اچھی ہوں بھائی جان۔

فرّخ مرزا: ارے بھئی ابھی ابھی بھائی نواب کسی جانور کا ذکر کر رہے تھے کیا کوئی جانور پال لیا ہے؟

نواب آغا: میاں اب کیا جانور پالیں گے؟ وہ دن ہَوا ہوئے جب کتنی ہی گائیں بھینسیں پلتی رہتی تھیں۔ اصطبل میں مُشکی، ابلق، شب دیز، نقرہ اور تازی کھڑے ٹاپیں مارا کرتے تھے اور سُرنگ لال گھوڑیاں ہنہنایا کرتی تھیں۔ کبھی ہماری محل سرا پر ہاتھی جھولتے تھے۔ یہاں تو میاں ہم ہی جانور ہیں۔ صبح سے شام تک کولھو کے بیل کی طرح پلتے ہیں تو دو وقت کی روٹی نصیب ہوتی ہے۔ گرانی کا یہ حال ہے، پیٹ کو ہے تو تن کو نہیں اور تن کو ہے تو پیٹ کو نہیں۔ اس پر آپ کی بہن صاحبہ کا حکم ہے کہ پاکستان کو برا نہ کہو۔

بیگم: بھائی جان ان کی تو عادت میں داخل ہو گیا ہے پاکستان کو بُرا کہنا۔ ان کا کام بس یہ رہ گیا ہے کہ گزرے ہوئے زمانے کے سہانے خواب دیکھتے رہیں۔

نواب آغا: لو صاحب! یہ بھی بری بات ہے کہ میں اپنے بڑوں کو برا نہیں کہتا اور آسودہ حالی پر لعنت نہیں بھیجتا۔ اللہ بخشے دادا حضرت —

بیگم: پھر وہی ابّا حضرت اور دادا حضرت کا پٹّن! میں ان سے کہتی ہوں تمہارے بزرگوں میں لال جڑے تھے، وہ ختم ہو گئے، تم اپنی کہو۔

فرّخ مرزا: بھئی بات دراصل یہ ہے کہ نواب بھائی نے اچھا وقت دیکھا ہے۔ انہیں اس کی یاد رہ رہ کر ستاتی ہے۔ پاکستان ابھی تو بنا ہی ہے۔ جمی جمائی زندگی

سے اُکھڑ کر جو لوگ یہاں آئے ہیں انہیں یہاں کے ماحول اور بدلے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہونے میں کچھ تو دیر لگے گی۔ دو چار آدمیوں کی تو بات ہے نہیں، لاکھوں کروڑوں آدمیوں کا معاملہ ہے۔

نواب آغا: ''تری آواز مکّے اور مدینے۔'' اللہ تمہارا بھلا کرے۔ تم نے خدا لگتی بات کہی، یعنی کہ اب اگر میں بقول بیگم کے پچھلی باتوں کو جھینکتا رہتا ہوں تو کیا بے جا کرتا ہوں۔

فرّخ مرزا: مگر نواب بھائی آپ نے فارسی کا وہ مشہور شعر تو سنا ہوگا

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن!

اگر کسی چیز کا سوگ منانے سے وہ چیز مل جائے تو آدمی سوگ بھی منائے۔

بیگم: یہ تو پچھلی باتوں ہی کو جھوئے جاتے ہیں۔ ملک اور قوم کا تو انہیں بھلا کیوں خیال آئے گا، انہیں خود اپنی حالت سنبھالنے کا کبھی بھول کر بھی خیال نہیں آتا۔ پاکستان برا ہے، حکومت کچھ نہیں کرتی، مہنگائی ہے، لوٹ مچی ہوئی ہے۔ میں کہتی ہوں پہلے خود تو کچھ کر کے دکھاؤ۔

فرّخ مرزا: نواب بھائی، آپ کا کہنا بہت ٹھیک ہے، لیکن اس پر بھی تو غور کیجیے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اصل خرابی تو ہم آپ میں ہے کہ خود کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ حکومت جو کچھ کر سکتی ہے کر رہی ہے مثلاً مہنگائی کو دور کرنے کے لیے قیمتوں کو کنٹرول، چور بازاری کرنے والوں کو سزائیں، سستی دکانیں، گوشت ترکاری کی چور بازاری کو روکنے کے لیے ہر منڈی میں ایک مجسٹریٹ بٹھا دیا۔ غنڈہ گردی کو روکنے کے لیے غنڈے پکڑے اور شہر بدر کیے جا رہے ہیں، حکومت سارے کام تو نہیں کر سکتی۔ کچھ ہم کو بھی کرنا چاہیے۔

نواب آغا: بھائی صاحب! ابھی پچھلے رمضان شریف میں پپیتا چار آنے کے بدلے دو روپے سیر بکا ہے۔ دو روپے سیر! سنا آپ نے؟

فرّخ مرزا: اچھا اب اسی بات کو دیکھ لیجیے۔ اگر دو روپے سیر پپیتا نہ خریدا جاتا، تو کیا روزہ افطار نہ ہوتا؟ جب بیچنے والوں کو منہ مانگے دام ملنے لگیں تو پھر وہ

فرّخ مرزا: کیوں بھائی صاحب، میں آ جاؤں؟

بیگم: بھائی جان ہیں۔ آیئے بھائی جان۔

فرّخ مرزا: بھائی صاحب، آداب عرض کرتا ہوں اور بھئی تم تو اچھی ہو؟

نواب آغا: آؤ بھائی آؤ۔ یعنی کہ اب تو بہت بہت دنوں میں ادھر کا پھیرا ہوتا ہے، خیریت سے تو ہو؟

فرّخ مرزا: نواب بھائی، کیا عرض کروں۔ وہ یومِ استقلال کے سلسلے میں جو جشن منایا جا رہا ہے نا اس میں مصروف رہا۔ تم کہو فرخندہ، جی کیسا ہے؟

بیگم: خدا کا شکر ہے، اچھی ہوں بھائی جان۔

فرّخ مرزا: ارے بھئی ابھی ابھی بھائی نواب کسی جانور کا ذکر کر رہے تھے کیا کوئی جانور پال لیا ہے؟

نواب آغا: میاں اب کیا جانور پالیں گے؟ وہ دن ہَوا ہوئے جب کتنی ہی گائیں بھینسیں پلتی رہتی تھیں۔ اصطبل میں مُشکی، ابلق، شب دیز، نقرہ اور تازی کھڑے ٹاپیں مارا کرتے تھے اور سُرنگ لال گھوڑیاں ہنہنایا کرتی تھیں۔ کبھی ہماری محل سرا پر ہاتھی جھولتے تھے۔ یہاں تو میاں ہم ہی جانور ہیں۔ صبح سے شام تک کولھو کے بیل کی طرح پلتے ہیں تو دو وقت کی روٹی نصیب ہوتی ہے۔ گرانی کا یہ حال ہے، پیٹ کو ہے تو تن کو نہیں اور تن کو ہے تو پیٹ کو نہیں۔ اس پر آپ کی بہن صاحبہ کا حکم ہے کہ پاکستان کو برا نہ کہو۔

بیگم: بھائی جان ان کی تو عادت میں داخل ہو گیا ہے پاکستان کو بُرا کہنا۔ ان کا کام بس یہ رہ گیا ہے کہ گزرے ہوئے زمانے کے سہانے خواب دیکھتے رہیں۔

نواب آغا: لو صاحب! یہ بھی بری بات ہے کہ میں اپنے بڑوں کو برا نہیں کہتا اور آسودہ حالی پر لعنت نہیں بھیجتا۔ اللہ بخشے دادا حضرت —

بیگم: پھر وہی ابّا حضرت اور دادا حضرت کا پٹّن! میں ان سے کہتی ہوں تمہارے بزرگوں میں لال جڑے تھے، وہ ختم ہو گئے، تم اپنی کہو۔

فرّخ مرزا: بھئی بات دراصل یہ ہے کہ نواب بھائی نے اچھا وقت دیکھا ہے۔ انہیں اس کی یاد رہ رہ کر ستاتی ہے۔ پاکستان ابھی تو بنا ہی ہے۔ جمی جمائی زندگی

سے اُکھڑ کر جو لوگ یہاں آئے ہیں انہیں یہاں کے ماحول اور بدلے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہونے میں کچھ تو دیر لگے گی۔ دو چار آدمیوں کی تو بات ہے نہیں، لاکھوں کروڑوں آدمیوں کا معاملہ ہے۔

نواب آغا: ''تری آواز مکّے اور مدینے۔'' اللہ تمہارا بھلا کرے۔ تم نے خدا لگتی بات کہی، یعنی کہ اب اگر میں بقول بیگم کے پچھلی باتوں کو جھینکتا رہتا ہوں تو کیا بے جا کرتا ہوں۔

فرّخ مرزا: مگر نواب بھائی آپ نے فارسی کا وہ مشہور شعر تو سنا ہوگا

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن!

اگر کسی چیز کا سوگ منانے سے وہ چیز مل جائے تو آدمی سوگ بھی منائے۔

بیگم: یہ تو پچھلی باتوں ہی کو جھوئے جاتے ہیں۔ ملک اور قوم کا تو انہیں بھلا کیوں خیال آئے گا، انہیں خود اپنی حالت سنبھالنے کا کبھی بھول کر بھی خیال نہیں آتا۔ پاکستان برا ہے، حکومت کچھ نہیں کرتی، مہنگائی ہے، لوٹ مچی ہوئی ہے۔ میں کہتی ہوں پہلے خود تو کچھ کر کے دکھاؤ۔

فرّخ مرزا: نواب بھائی، آپ کا کہنا بہت ٹھیک ہے، لیکن اس پر بھی تو غور کیجیے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اصل خرابی تو ہم آپ میں ہے کہ خود کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ حکومت جو کچھ کر سکتی ہے کر رہی ہے مثلاً مہنگائی کو دور کرنے کے لیے قیمتوں کو کنٹرول، چور بازاری کرنے والوں کو سزائیں، سستی دکانیں، گوشت ترکاری کی چور بازاری کو روکنے کے لیے ہر منڈی میں ایک مجسٹریٹ بٹھا دیا۔ غنڈہ گردی کو روکنے کے لیے غنڈے پکڑے اور شہر بدر کیے جا رہے ہیں، حکومت سارے کام تو نہیں کر سکتی۔ کچھ ہم کو بھی کرنا چاہیے۔

نواب آغا: بھائی صاحب! ابھی پچھلے رمضان شریف میں پپیتا چار آنے کے بدلے دو روپے سیر بکا ہے۔ دو روپے سیر! سنا آپ نے؟

فرّخ مرزا: اچھا اب اسی بات کو دیکھ لیجیے۔ اگر دو روپے سیر پپیتا نہ خریدا جاتا، تو کیا روزہ افطار نہ ہوتا؟ جب بیچنے والوں کو منہ مانگے دام ملنے لگیں تو پھر وہ

ایک کے چار کیوں نہ بنائیں؟ ہم میں ملک، قوم اور افراد کی ذمہ داریوں کا اب تک شعور ہی پیدا نہیں ہوا۔

نواب آغا: ارے بھائی میں تو یہ جانتا ہوں کہ سو سال پہلے تین روپے میں کنبہ پلتا تھا۔

فرّخ مرزا: درست ہے نواب بھائی، اب وہی تین روپے پانے والا ساٹھ روپے پاتا ہے۔ یہ تو معیارِ زندگی اونچا ہو جانے کی بات ہے۔

نواب آغا: اماں تو میں تو کہتا ہوں برکت ہی اڑ گئی، بس اور کیا۔

فرّخ مرزا: اچھا نواب بھائی میں تو اس لیے آیا تھا کہ آپ کو جشنِ استقلال میں لے چلوں۔

نواب آغا: ارے بھائی ہاں، یہ بتاؤ جلسے میں کچھ ناچ گانا ہوگا؟ کچھ آتش بازی چھوٹے گی؟ مٹھائی بٹے گی؟ متوسلینِ شاہی کو جاگیریں اور خلعت دیے جائیں گے؟

فرّخ مرزا: نہیں نواب بھائی ان باتوں کا یہ کیا موقع ہے؟ آپ کو یاد ہوگا سن ستاون کا ہنگامہ جسے غدر کہا گیا، دراصل فرنگیوں کی جابرانہ حکومت سے چھٹکارا پانے کے لیے پہلی جنگِ آزادی تھی۔ یہ کوشش ہماری آپس کی پھوٹ کی وجہ سے ناکام رہی۔ دلّی کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر اس جنگ کے مرکزی کردار تھے، جن کے گرد ہندوستان کے تمام آزادی پسند عناصر جمع ہو گئے تھے۔ اس جنگ میں مسلمان ہی پیش پیش تھے۔ ہمارے علماء نے اسے جہاد قرار دیا تھا۔ مجاہدین دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑتے، اور جامِ شہادت نوش کرتے۔ ہر مسلمان اسلام کا ایک سپاہی بن گیا تھا۔ یہ جوش و خروش آخر دم تک قائم رہا۔ لیکن ہمارے آپس کے اختلافات ہمیں لے ڈوبے، ہمسایہ قوم نے فرنگیوں کا ساتھ دیا۔ دشمن کو فتح نصیب ہوئی، دلّی میں وہ قتلِ عام ہوا کہ نادر کا قتلِ عام اس کے آگے گرد ہو گیا۔ رعایا تباہ ہوئی، بادشاہ قید کر کے رنگون بھیج دیے گئے اور جو بھی مسلمان نظر آیا اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا، مگر حصولِ آزادی کا جذبہ پھر بھی فنا نہیں ہوا۔ سرسیّد احمد خاں سے قائداعظم تک سیاسی مجاہدین کا ایک قابلِ فخر سلسلہ ہے، جن کی جدوجہد کا نتیجہ بالآخر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی صورت میں

برآمد ہوا اور وہ خواب جو مسلمانانِ ہند نے ۱۸۵۷ء میں دیکھا تھا، ۱۹۴۷ء میں یعنی پورے نوے سال کے بعد شرمندۂ تعبیر ہوا۔ اللہ کا احسان ہے کہ اب ہم آزاد و خودمختار ہیں۔ ہمارا ایک علیٰحدہ وطن ہے۔ ہماری حکومت ہے۔ ہمیں اختیار حاصل ہے کہ ہم اپنی خواہشات اور اسلامی نظریات کے مطابق زندگی بسر کریں اور اس طرح عملی طور پر اپنے اسلاف کی یاد تازہ کریں۔ اسی تقریبِ سعید پر ہر سال ۱۴/اگست کو جشن منایا جاتا ہے۔ جس میں اپنے اسلاف کی شاندار روایات کو زندہ کرنے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

نواب آغا: ارے بھئی یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ پھر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ

وہ بات کوہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ

مغلوں کا دورِ سلطنت ہوتا تو پھر آپ دیکھتے کہ اس موقع پر کیا جشن منایا جاتا۔ اللہ بخشے دادا حضرت فرماتے تھے کہ ایک دفعہ بادشاہ حضور نے شفا پائی اور غسلِ صحت فرمایا۔ جلوسِ شاہانہ نکلا تو بادشاہ حضور مولا بخش ہاتھی پر سوار اشرفیوں کی بکھیر کرتے چلے گئے۔ شہر میں آئینہ بندی اور چراغاں ہوا۔ دیوان عام میں رات کو ناچ گانا ہوا۔ جس کا جی چاہے بلا روک ٹوک چلا آئے۔ داد و دہش کا یہ عالم کہ جیسے ہن برس رہا ہو۔ شاہی کرتے تھے وہ لوگ۔ خُدائی کرتے تھے۔

بیگم: میں کہتی ہوں پھر وہی فضول باتیں۔ بھلا ایسے جشن کا یہاں کیا موقع ہے۔ بھائی جان! آپ انہیں ضرور ساتھ لے جایئے۔ مجھے آپ کے کہنے سے یاد آیا کہ زنانہ پارک میں مجھے بھی خواتین کے جلسے میں شریک ہونا ہے۔ اللہ ہمیں توفیق دے کہ ان نامی گرامی ہستیوں کے نقشِ قدم پر چلیں اور اپنے اندر اس جذبۂ حُریت کو بیدار کریں جو آزاد قوموں کے دلوں میں موجزن ہوتا ہے۔ جہد و عمل اور ایثار و قربانی ہی سے ملک اور قومیں بنا کرتی ہیں۔ ماضی کو روتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

نواب آغا: چلو بھائی چلو یہاں سے۔ ورنہ بیگم کا لیکچر یوں ہی چلتا رہے گا۔''

یہ زبان شاہد احمد کے علاوہ اور کون لکھ سکتا تھا۔ اس تمثیلے میں قدامت پرستی کی مذمت واضح الفاظ میں ہے۔ وطن دوستی کا جذبہ ہے اور بہتر مستقبل کی نوید ہے۔ شاہد احمد نے ایسے تمثیلے بہت لکھے لیکن مسودے

محفوظ نہیں رہے۔ انہوں نے فیچروں کے علاوہ بے شمار تقریریں بھی نشر کیں۔ مدتوں وہ اتوار کے اتوار صبح کو اردو زبان کے بارے میں ایک تقریر نشر کرتے رہے۔ بڑی عمدہ تقریر ہوتی تھی۔ اعلیٰ جماعتوں اور ادب کے طلبہ ان تقریروں کو غور سے سنتے تھے۔ میں نے بھی طالبِ علم کی حیثیت سے بہت سی تقریریں سنی ہیں۔ وہ کتابوں پر تبصرے بھی نشر کرتے تھے۔ یہ ان کا فن تھا۔ بعض تقریری سلسلے بھی انہوں نے مرتب کیے تھے اکثر پروگرام پروڈیوسران سے تقریروں کے سلسلے میں مشورے کرتے تھے۔

ذوالفقار علی بخاری بجا طور پر بابائے ریڈیو تھے۔ انہیں ریڈیو کے ہر شعبے میں ماہرانہ دسترس حاصل تھی۔ شاہد احمد بھی ریڈیو پاکستان کراچی کے اہم ستون تھے۔ ان کا ریڈیائی تجربہ آل انڈیا ریڈیو سے ریڈیو پاکستان کراچی تک کم و بیش تیس برس پر پھیلا ہوا ہے۔ پھیلا کیا ہے ریڈیو کی تاریخ پر نقش ہے۔

کمالاتِ موسیقی

''میرے خاندان میں دور دور تک موسیقی سے کسی کو لگاؤ نہیں ہے۔ مگر مجھے بچپن ہی سے اس کا شوق ہے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ابا نے میرا جیب خرچ بیس روپے مہینہ کر دیا تھا۔ میں نے دس روپے مہینہ ایک استاد کو دے کر باقاعدگی سے ہارمونیم اور راگ راگنیاں سیکھنی شروع کر دیں۔ ۲۵ سال تک میں نے اچھے استادوں سے گلوئی اور سازی موسیقی سیکھی ۱۹۳۷ء سے ریڈیو پر گانا بھی شروع کر دیا تھا۔ مگر ایس۔ احمد کے نام سے۔ کیونکہ میرے خاندان والے اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ پھر دین سے دنیا رکھنی مشکل ہے۔ میں نے اس فن کو حاصل کرنے میں بہت وقت اور روپیہ صرف کیا۔ یوں سمجھئے کہ میرا آدھا وقت ادب میں اور آدھا تحصیلِ موسیقی میں گزرا۔ کلاسیکی موسیقی ایک نہایت دشوار علم اور فن ہے جسے کما حقہ حاصل کرنا عطائی کے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ مگر میں نے مشق و مزاولت سے اچھے استادوں کی رہ نمائی میں اس فن کے عملی پہلو پر عبور حاصل کیا اور اردو، فارسی اور انگریزی کتابوں سے اس کے علمی پہلو پر دسترس حاصل کی اور ایک وقت وہ آ گیا کہ اکثر پیشہ ور فن کار مجھ سے راگ راگنیوں کی صحت کرنے لگے۔ آل انڈیا ریڈیو کے بیشتر اور پاکستان کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے میرے پروگرام نشر ہوتے رہے ہیں۔''

شاہد احمد کے اس بیان سے موسیقی کے عملی اور علمی پہلوؤں پر ان کی مہارت، ان کے شوق اور ان کے ریاض کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں اس موقف میں نہیں ہوں کہ ان کے کمالاتِ موسیقی کا کوئی سطحی اور سرسری جائزہ بھی پیش کر سکوں جو کچھ لکھوں گی سنی سنائی اور دوسروں کی زبانی۔ میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے موسیقار تھے اور انہیں دوسرے موسیقاروں پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ وہ موسیقی کے علم سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ موسیقی کے استادانِ فن موسیقی کے عملی پہلوؤں پر پوری طرح حاوی ہوتے تھے لیکن علمی پہلوؤں سے انہیں واقفیت نہیں ہوتی تھی۔ شاہد احمد میں دونوں خوبیاں تھیں۔ اسی وجہ سے وہ پیشہ ورانہ موسیقاروں میں بھی بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

مشہور افسانہ نگار غلام عباس نے جو خود بھی موسیقی کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

''شاہد احمد نے عمر بھر گویّوں کی پرورش بھی کی اور استادوں کی جوتیاں بھی سیدھی کیں۔ اور پھر ایک

زمانہ ایسا آیا کہ انہوں نے سچی لگن اور محنت سے موسیقی میں ایسا کمال حاصل کرلیا کہ گانے بجانے کے رسیا خود ان کی جوتیاں سیدھی کرنے لگے۔''

شاہد احمد جب سیٹو کی طرف سے تھائی لینڈ میں پاکستانی ثقافت کے بارے میں لیکچر دینے گئے۔ تو بنکاک کی ایک محفل میں انہوں نے ممتاز شیریں کے بقول:

''پاکستان کی کلاسیکی گائیکی کی مختلف طرزوں اور اس کی مختلف اور پیچیدہ دُھنوں کا مکمل خاکہ پیش کیا اور اس کے لوازمات، تکنیکی معاملات پر بھرپور روشنی ڈالی۔ تقریر کے دوران ہی انہوں نے چند کلاسیکی راگوں کے نمونے خود گا کر پیش کیے۔ انہوں نے دُھرپد، خیال، دادرا اور ٹھمری کی دُھنیں گا کر اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا۔ شاہد احمد صاحب پیشہ ور گویّے نہیں ہیں لیکن انہوں نے اپنی زندگی موسیقی کے لیے وقف کردی ہے اور اپنی عمر کا طویل حصہ اس میں مہارت حاصل کرنے میں گزارا ہے۔ استاد بڑے غلام علی خاں، روشن آراء بیگم، استاد بندو خاں جیسے نامور استادوں اور فنکاروں نے انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے اور شاہد احمد کو اپنے برابر درجہ دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ موسیقی کے میدان میں شاہد صاحب ایک مخصوص مرتبۂ بلند کے مالک ہیں۔''

اور اب ایک بڑے موسیقار کا بیان کردہ واقعہ سنئے۔ یہ موسیقار استاد امراؤ بندو خان تھے موسیقی میں انہوں نے برسوں شاہد حمد کے ساتھ ریاض کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

''آل انڈیا ریڈیو نے انہیں ایک فیچر پروگرام دیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ مختلف تانوں کا تعارف سامعین کے سامنے نہ صرف لفظوں کے ذریعے کروایا جائے بلکہ عملی طور سے گا کر بھی بتایا جائے۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ وقت بھی کم تھا اور مختلف قسم کی تانوں میں اتنا تنوع اور باریک فرق تھا کہ ذرا سی لغزش بھی بدنامی کا سبب بن سکتی تھی۔ شاہد صاحب نے پینسٹھ تانوں کا تعارف لکھا اور ہم دونوں کئی دن تک اس فیچر پروگرام کی مشق کرتے رہے۔ پروگرام اس طرح کا تھا کہ شاہد صاحب تان کا تعارف کراتے تھے اور میں فوراً اسے گا کر بتاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس پروگرام کو والد صاحب نے بھی سنا تھا اور مجھے پہلی مرتبہ شاباش دی تھی۔ اس دن میں نے تان بان، شان تلوار، اُچک، سمیٹ، گراؤ، چڑھاؤ، گرہ، گل جھنئی، عشق پیچاں، غوطے کی تان، دھوکے کی تان، چناں چُنیں کی تان، کُم گمک اسپاٹ، الٹا بل، سیدھا بل، ہاتھی چنگھاڑ، بھنڈارے کی تان، گدا، دھماکا، سوت، مینڈھ، گھلاؤ، نچاؤ، اکہری گمک، ڈیوڑھی گمک، چرخی، پھرکی وغیرہ وغیرہ تانوں کو ریڈیو پر گا کر بتایا تھا۔ یہ میری زندگی کا ایسا تجربہ تھا کہ اس کے نقوش آج تک میرے ذہن پر ثبت ہیں۔ شاہد صاحب کے ساتھ میں نے جس طرح تیاری کی۔ جس طرح شاہد صاحب نے ان تانوں کے باریک فرق کو لفظوں میں بیان کیا مجھے ایک بار پھر احساس ہوا کہ شاہد صاحب اس فن میں اتنی مہارت رکھتے ہیں جتنی پیشہ ور موسیقار۔ اس لیے والد صاحب مرحوم (استاد بندو خاں) یہی کہا کرتے تھے کہ بھائی صاحب (شاہد صاحب کو وہ

بھائی صاحب کہتے تھے) اب ہم میں سے ہیں۔''

شاہد احمد موسیقی میں استاد بندو خان کے برادرِ نسبتی استاد چاند خان کے شاگرد تھے۔ استاد چاند خان اپنے معاصرین میں پنڈت مشہور تھے کیونکہ انہیں موسیقی کے علم پر بھی عبور حاصل تھا۔ یہی کیفیت ان کے نامور شاگرد شاہد احمد کی بھی تھی۔ شاہد احمد نے موسیقی کے حوالے سے جو مضامین لکھے ہیں۔ وہ بھی نہایت اہم ہیں۔ ''ہماری کلاسیکی موسیقی، پاکستانی موسیقی (مسلمانوں کی موسیقی کی روشنی میں) ہماری موسیقی کے ساز، رقص'' اور بعض دوسرے مضامین کے مطالعے سے شاہد احمد کے کمالِ فن کا اندازہ ہوتا ہے۔

ریڈیو پاکستان کے رسالے ''آہنگ'' کی اطلاع کے مطابق ریڈیو پاکستان کے سنٹرل پروڈکشن کی لائبریری میں شاہد احمد کی آواز، ان کے بعض فیچر اور گائے ہوئے راگ محفوظ ہیں۔ ''حیرت انگیز آواز خانے'' کے سربراہ لطف اللہ خان صاحب کے ہاں بھی شاہد احمد کا گایا ہوا ایک راگ محفوظ ہے۔ اسے بہت غنیمت سمجھنا چاہیے۔

شاہد احمد نے شاعری اور موسیقی کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ یعنی ادب کو موسیقی کا ایک حصہ بنا کر پیش کیا۔ وہ جب کوئی راگ گاتے تو بلمپت کے بولوں میں فارسی یا اردو کا کوئی شعر گاتے۔ اقبال کا ایک قطعہ ''سرودِ رفتہ باز آید کناید'' وہ اکثر گاتے تھے۔ حافظ اور غالب کے اشعار بھی استعمال کرتے تھے۔ راگ میں پیوست ہو کر یہ اشعار بڑے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن ان کی یہ جدّت ان کے معاصرین کو ادب سے ناواقفیت کی بنا پر پسند نہیں آئی اور شاہد احمد کا یہ تجربہ انہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔

کلاسیکی موسیقی کے بعض اربابِ کمال کا کہنا ہے کہ بیسویں صدی میں شاہد احمد جیسا عالم موسیقار اور کوئی نظر نہیں آتا۔ اس بات کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں۔ ادب کی طرح موسیقی میں بھی شاہد احمد یکتا اور منفرد تھے۔

یہاں پہنچ کر ایک عہد ساز، رجحانِ ساز اور ادیب گر ادیب کی زندگی اور کمالاتِ فن کا یہ مختصر خاکہ بظاہر تمام ہو جاتا ہے لیکن اس طرح کا کوئی خاکہ کبھی تمام نہیں ہوتا۔ آنے والے آتے رہتے ہیں۔ خاکوں میں نت نئے رنگ بھرتے رہتے ہیں۔ شاہد احمد کے خاکے میں بھی نئے نئے رنگ بھرے جائیں گے۔ ان کی شخصیت کارناموں اور کمالِ فن کی نئی تفہیم ہوگی۔ شاید یہ خاکہ اس تسلسل کو جاری رکھنے میں معاون ثابت ہو۔ میری جانب سے یہ ایک کوشش ناتمام اور ایک قرض کی ادائیگی ہے۔ بقول فیضؔ ع

جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب ہم نے چُکا دیا

کتابیات

شاہد احمد دہلوی، یادیں اور تحقیق

(۱) بیادِ شاہد۔ مرتبہ مقبول جہاں گیر۔ اگست ۱۹۶۸ء۔ مکتبہ اردو ڈائجسٹ سمن آباد۔ لاہور۔
(شاہد احمد کے بارے میں مشاہیرِ ادب کے ۲۳ مضامین کا مجموعہ)

(۲) ساقی۔ شاہد احمد نمبر۔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی ۱۹۷۰ء کراچی۔
(۶۷۰ صفحات پر مشتمل یہ خصوصی شمارہ شاہد احمد دہلوی کے حوالے سے انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے)

(۳) ''شاہد احمد دہلوی۔ فکر و فن''۔ شعیب محمد۔ ۱۹۸۶ء کراچی۔
(شعیب محمد نے یہ مقالہ جامعہ کراچیا میں ایم۔فل کی ڈگری کے لیے ڈاکٹر اسلم فرخی کی نگرانی میں لکھا تھا۔ شائع نہیں ہوا)

(۴) ''شاہد احمد دہلوی۔'' پروین الٰہی۔ ۱۹۸۸ء احاطہ کالے صاحب دہلی۔ قاسم جان اسٹریٹ دہلی۔ (پروین الٰہی نے یہ مقالہ دلّی یونیورسٹی میں ایم۔فل کی ڈگری کے لیے لکھا تھا)

(۵) ''شاہد احمد دہلوی۔ حالات و آثار۔'' ڈاکٹر سیّد محمد عارف ۲۰۰۰ء انجمن ترقیٔ اردو کراچی
(ڈاکٹر سیّد محمد عارف نے یہ مقالہ بہاولپور یونیورسٹی میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لیے لکھا تھا)

(۶) ''اردو افسانے کے فروغ میں ساقی کا کردار۔'' ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز۔ ۲۰۰۵ء انجمن ترقیٔ اردو کراچی۔
(ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز نے یہ مقالہ ملتان یونیورسٹی میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لیے لکھا تھا)

ISBN-978-969-472-225-2

اکادمی ادبیات پاکستان